جب امرتسر جل رہا تھا
تحریک پاکستان کے موضوع پر
1
انعام یافتہ
تاریخی تصنیف
خواجہ افتخار

جب امرتسر جل رہا تھا

سنہ ۱۹۴۷ء

آنسوؤں، آہوں اور خون میں ڈوبی سرگذشت

(پانچواں ایڈیشن)

○

خواجہ افتخار

ملنے کا پتہ

خواجہ پبلشرز ○ افتخار منزل ○ ۳۵ نسبت روڈ لاہور

فون: ۶۵۳۱۷، ۶۶۲۶۴

ناشر ——— خواجہ غفور احمد
اشاعت اوّل ——— اگست ۱۹۸۰ء
اشاعت دوم ——— اگست ۱۹۸۱ء
اشاعت سوم ——— اگست ۱۹۸۲ء
اشاعت چہارم ——— اگست ۱۹۸۳ء
اشاعت پنجم ——— اگست ۱۹۸۴ء
مطبع ——— مسعود پرنٹرز لاہور

قیمت ——— ۴۰ روپے
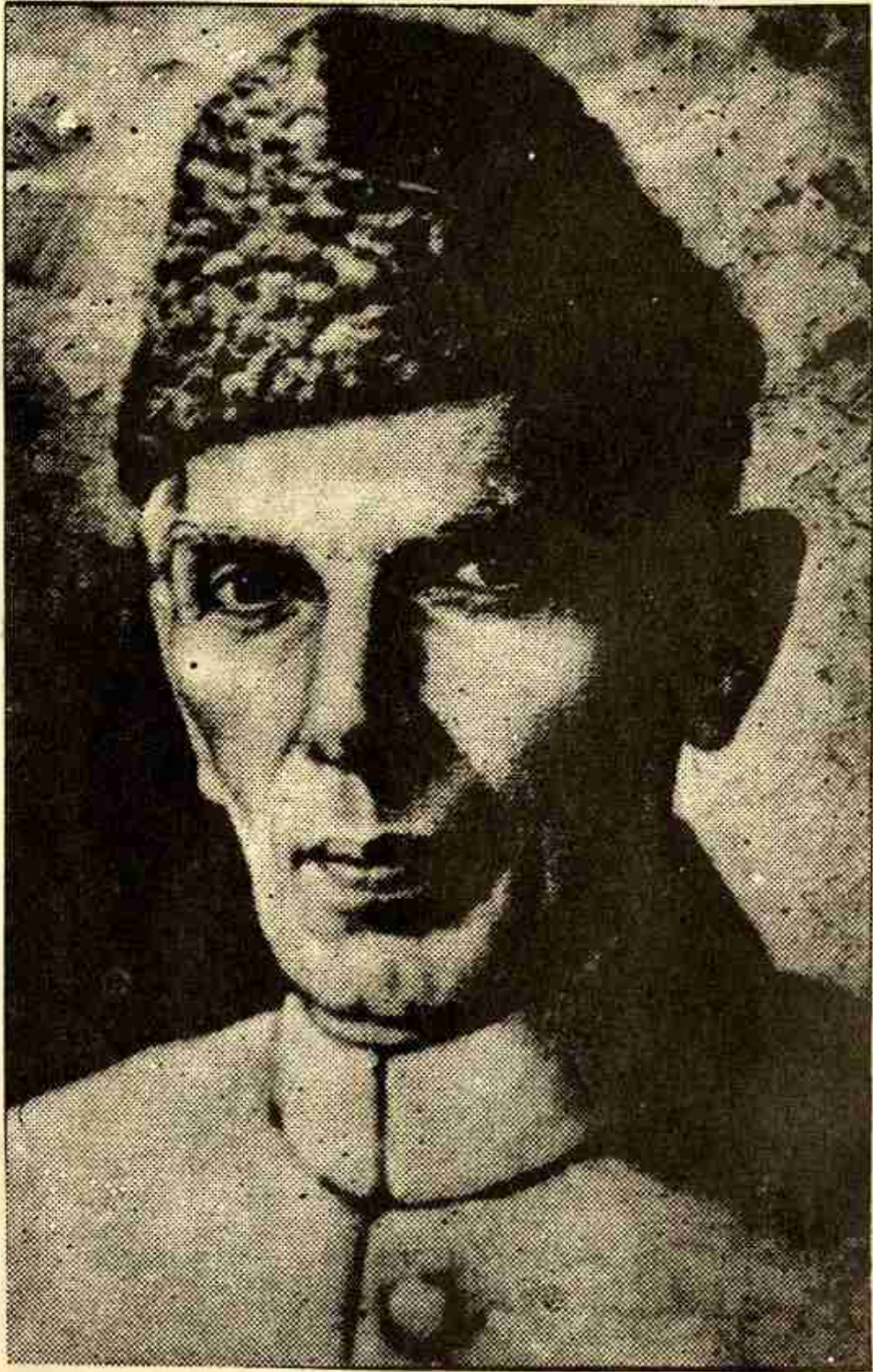
یہ اور بات کہ اس پر کوئی چلے نہ چلے
لکیر چھوڑنے والا لکیر چھوڑ گیا

پاکستان کے معمار اور مصنّف

قائد اعظم کے دستِ راست الحاج خواجہ ناظم الدین مرحوم تحریکِ پاکستان کے ممتاز کارکنوں کے ساتھ کھڑے ہیں۔ دائیں سے دوسرے سیاہ سوٹ میں ملبوس اس کتاب کے مصنّف ہیں۔
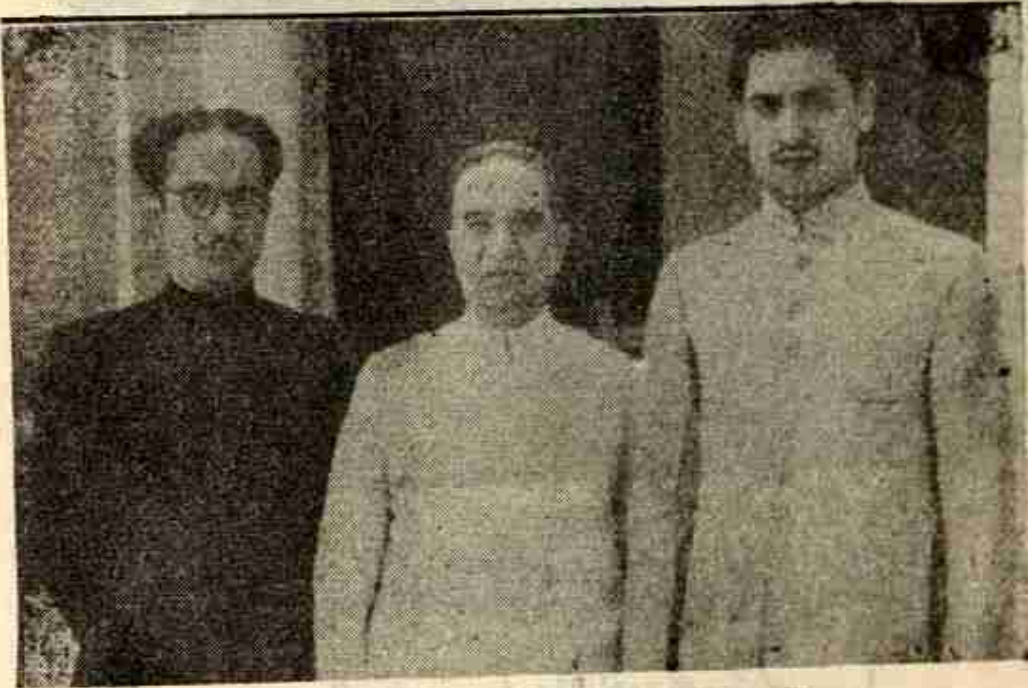
خواجہ افتخار، سید حسین شہید سہروردی مرحوم اور پیر صلاح الدین
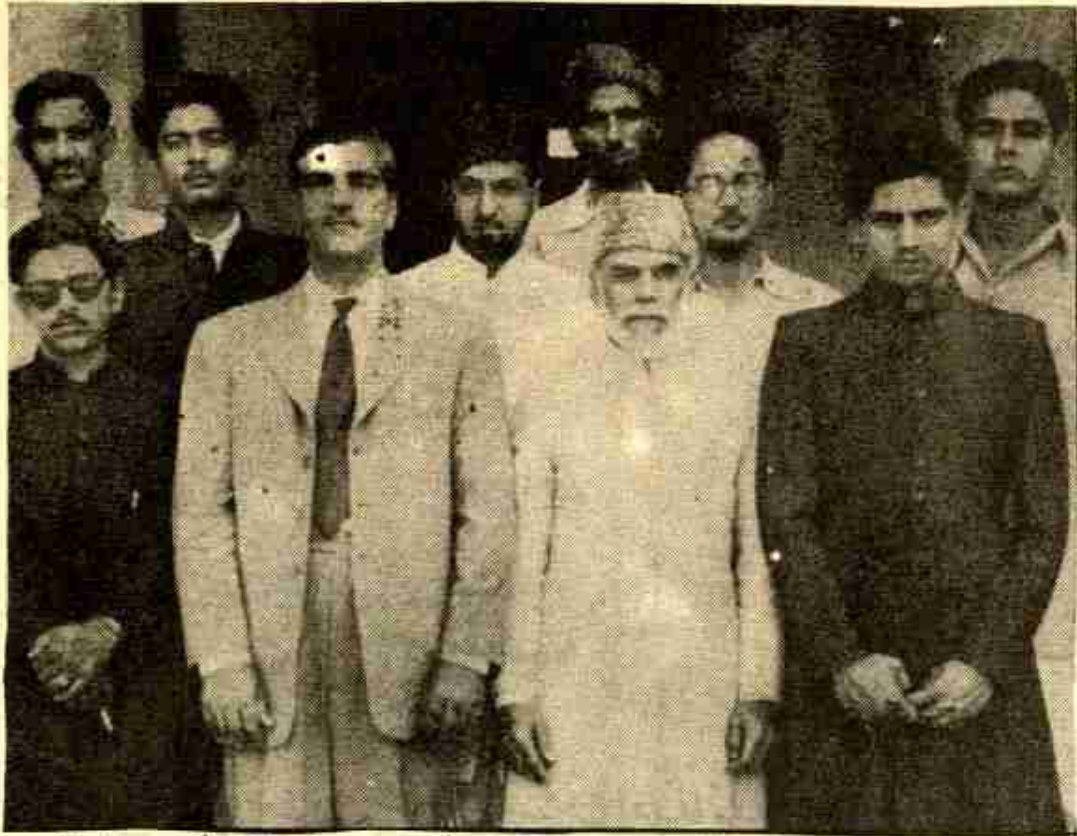
پاکستان کے کلیدی عہدوں سے انگریز افسروں بالخصوص پاک پنجاب کے انگریز گورنر موڈی کی
برطرفی کی کامیاب تحریک میں نمایاں کام کرنے والے ممتاز کارکن تحریک کے سربراہ میاں عبدالباری اور
یوسف خٹک کے ساتھ کھڑے ہیں۔ دائیں سے بائیں خواجہ افتخار، میاں عبدالباری، یوسف خٹک اور آغا امان اللہ۔
پچھلی صف میں رؤف خان، پیر صلاح الدین، علامہ علاؤ الدین صدیقی، ملک حامد سرفراز اور مولوی حمید اللہ۔

خواجہ افتخار، سابق چیف جسٹس سپریم کورٹ آف پاکستان ایس اے رحمان، ذہنی زلزلے کے خالق
ابوالاثر حفیظ جالندھری اور عبدالعزیز خالد کے ساتھ لاہور کی ایک ادبی تقریب میں۔

انتساب

اُن ماؤں، بہنوں، بیٹیوں، شہیدوں اور غازیوں کے نام

جنہوں نے

حصُولِ پاکستان کی جدوجہد میں اپنا مقدس خُون بہایا

اور ہمیں

آزادی کی نعمت سے ہمکنار کیا

فہرست

خراجِ تحسین	ڈاکٹر جاوید اقبال	۱۰	اعترافِ خدمت		۱۱
پیغامِ تہنیت	میر انور سعید محمود	۱۲	عرضِ ناشر	مجیب الرحمٰن شامی	۱۳
مشاہیر کی نظر میں۔ (آراء)		۱۵	اخبارات و رسائل کے آئینے میں		۲۹
پیش لفظ	اے۔ حمید	۳۷	عرضِ مصنف	خواجہ افتخار	۴۷
اے مرے شہر (نظم)	سیف الدین سیف	۶۳	کیا کیا دیکھا (نظم)	مولانا وقار انبالوی	۶۹

پہلا باب

حصولِ پاکستان اور اسلامیانِ امرتسر ۷۳ تا ۹۳

پرنسپل دلاور حسین کی دلاوری	۷۴	تھانہ رام باغ پر مسلم لیگی پرچم	۷۶
مسلم خواتین کا یادگار جلوس	۷۷	ایاز محمود کی جرآتِ رندانہ	۷۸
یونین جیک کی جگہ سبز ہلالی پرچم	۸۱	امرتسر کا پہلا شہید	۸۲
دیہاتی مسلمانوں کی مہمان نوازی	۸۴	اہلِ لاہور کا جوش و خروش	۸۵

دوسرا باب

فسادات کا آغاز ۹۵ تا ۱۲۳

لیڈی ماؤنٹ بیٹن کی کہہ مکرنی	۹۷	مہاں سنگھ گیٹ کا مقابلہ	۱۰۰
چوک فرید کا معرکہ	۱۰۱	مٹھن پہلوان کی شجاعت	۱۰۲
کڑہ جیمل سنگھ کی بے زبان بکری	۱۰۵	چوک پراگ داس کا المیہ	۱۰۷
چاچی خیراں کی آہ و زاری	۱۱۳	مسلمان لڑکیوں کا برہنہ جلوس	۱۱۶
باداگھنشام اور بے بے ڈاکٹرنی کی انسان دوستی	۱۱۸	اسلامی رواداری کا ناقابلِ فراموش مظاہرہ	۱۲۱
پنڈت نہرو کی فرقہ پرستی	۱۲۲		

تیسرا باب

خون کا بدلہ خون ۱۳۵ تا ۱۸۰

چوک فرید کے جیالے	۱۳۶	ڈاکٹروں کا کردار	۱۳۸
چھ سکھ زندہ جل گئے	۱۴۳	میاں معراج دین نے داڑھی مونڈھ لی	۱۴۷
مہا بھاتی غنڈے کی بیٹی کا ڈولا	۱۵۰	چاہ کن را چاہ در پیش	۱۵۲
امرتسر کا ڈرامہ	۱۵۴	مٹو پہلوان کی گرفتاری	۱۶۰
مسلمان کا وعدہ	۱۶۶	ہسپتال کا سکور بورڈ	۱۶۹
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا	۱۷۲	اس خطا پر مجھے مارا کہ خطاوار نہ تھا	۱۷۵

چوتھا باب

محافظ غنڈے بن گئے ۱۸۲ تا ۲۱۰

مسلمان پولیس افسروں کا کردار	۱۸۴	اسلامیان شریف پورہ کا جذبۂ اخوت	۱۸۷
خواجہ محمد رفیق شہید کی فرض شناسی	۱۸۹	شریف پورہ کی نالیوں میں شراب	۱۹۱
مہندی اور چوڑیوں کا تحفہ	۱۹۲	ماؤنٹ بیٹن کی ناانصافی	۱۹۴
کٹڑہ کرم سنگھ کے مسلمانوں کا غیض و غضب	۱۹۵	ہندوستانی پرچم لہرانے کا مطالبہ	۱۹۸
چوک فرید کی مرغیاں	۱۹۹	انسانی لاشیں اور کتے	۲۰۳
ضعیف العمر امام مسجد کی شہادت	۲۰۴	مسلمان دوشیزہ کی درد بھری سرگزشت	۲۰۴
مائی کوشلیا اور داستانی سکھونت کور	۲۰۵		

پانچواں باب

صبحِ آزادی ۲۱۲ تا ۲۳۵

دو آنکھیں دو خنجر	۲۱۳	پہلی سپیشل ٹرین	۲۱۸
بن کے رہے گا پاکستان	۲۲۰	قرآن پاک کی بے حرمتی	۲۲۲
عظیم خاتون کی شہادت	۲۲۴	مسلمان عورتیں یا تاش کے پتے	۲۲۶

سکھ درندے اور پاگل دوشیزہ	۲۲۷	خُونِ مسلم کی ارزانی	۲۲۹

چھٹا باب

ایک سو برہنہ عورتیں ۲۳۰ تا ۲۸۰

مسلمانوں کی نسل کشی	۲۳۱	مغویہ خواتین کا بھیانک مستقبل	۲۴۴
اسلامیانِ دہلی کی حالتِ زار	۲۴۸	مہاجر کیمپ اور پیدل قافلے	۲۵۵
قیامتِ صغریٰ	۲۵۸	خون کا دریا	۲۶۳
تین زندہ مائیں تین مُردہ بچے	۲۶۵	اک دکھیا ماں کی فریاد	۲۷۰
ظالم کا بوٹ اور معصوم بچی	۲۷۴	لے کے رہیں گے پاکستان	۲۷۷

ساتواں باب

پاکستان کی پہلی عید ۲۸۲ تا ۲۹۷

عید کا دن اور بھنگیوں کا لباس	۲۸۲	شیخ صادق حسن اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری	۲۸۶
ٹرو کا میلہ	۲۸۹	لاشوں پر خواتین کا رقص	۲۹۰
پاکستانی مسلمانوں کے لئے عید کا تحفہ	۲۹۱	ہائے اس زُود پشیماں کا پشیماں ہونا	۲۹۲

آزادی (نظم) طاہر محمود قریشی ۲۹۶

تعارفی تقریب کا آنکھوں دیکھا حال

۲۹۸ تا ۳۰۰

تصویری جھلکیاں ۳۰۱ تا ۳۰۴

○

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فرزندِ اقبال کا خراجِ تحسین

DR. JAVID IQBAL
CHIEF JUSTICE PUNJAB

ڈاکٹر جاوید اقبال اور خواجہ افتخار

تحریکِ پاکستان کے معروف کارکن اور صاحبِ طرز ادیب خواجہ افتخار نے "جب امرتسر جل رہا تھا" کتاب سپردِ قلم کر کے بلاشبہ اہم قومی خدمت انجام دی ہے۔ میرے نزدیک اس کتاب کا مطالعہ ہر پاکستانی کو کرنا چاہیئے بالخصوص نوجوان نسل کو یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہیئے تاکہ اسے معلوم ہو سکے کہ ہمیں آزادی کی نعمت انگریز یا ہندو نے "تحفے" کے طور پر پیش نہیں کی تھی بلکہ اس کے حصول کے لئے برصغیر کے لاکھوں مسلمانوں نے اپنی جان و مال کے صدقے اتارنے سے بھی گریز نہیں کیا تھا۔

مجھے یہ معلوم کر کے از حد خوشی ہوئی ہے کہ خواجہ صاحب کی تصنیف مقبولیت کے نئے ریکارڈ قائم کر رہی ہے میری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ خواجہ صاحب کو اس تاریخی خدمت کا اجرِ عظیم عطا فرمائے۔ آمین۔

ڈاکٹر جاوید اقبال چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ

مصنّف کی خدمات کا اعتراف

THE PAKISTAN TIMES

Lahore, August 15, 1981.

Awards for intellectuals

BY A STAFF REPORTER

Mr. Justice Shamim Hussain Kadri, Chief Justice Lahore High Court, gave Independence Awards on Friday to four intellectuals and writers, Abul Asar Hafeez Jullunderi, Dr. Burhan Ahmad Farooqi, Khawaja Iftikhar and Mrs. Shamim Jullunderi for their literary contributions.

The awards were given at a function held at the Pakistan National Centre under the auspices of Public Relations Society of Pakistan and National Centre.

Three artistes Shaukat Ali, Rajab Ali and Akhlaq Ahmad were also given shields for singing national songs.

حفیظ جالندھری، ڈاکٹر برہان احمد، خواجہ افتخار اور مسز شمیم جالندھری کو ایوارڈ دیئے گئے

لاہور ۱۴ اگست یوم آزادی کے موقع پر ہائیکورٹ کے چیف جسٹس سید شمیم حسین قادری نے پاکستان پبلک ریلیشنز سوسائٹی کے زیر اہتمام ایک تقریب میں پاکستان کے چار دانشوروں کو ان کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر ایوارڈ تقسیم کئے ان میں ابوالاثر حفیظ جالندھری، ڈاکٹر برہان احمد فاروقی مصنف، خواجہ افتخار ادیب "امرتسر جل رہا تھا" اور "تحریک پاکستان میں خواتین کا کردار" کی مصنفہ مسز شمیم جالندھری شامل ہیں۔ اس موقع پر سید شمیم حسین قادری، ابوالاثر حفیظ جالندھری اور ڈاکٹر برہان احمد فاروقی نے تقاریر کیں۔ ممتاز گلوکاروں شوکت علی، رجب علی، اور اخلاق احمد نے ملی نغمے پیش کئے۔

لاہور ۱۴ اگست۔ پنجاب ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مسٹر جسٹس سید شمیم حسین قادری نے پاکستان پبلک ریلیشنز سوسائٹی کے زیر اہتمام منعقدہ ایک اجلاس میں پاکستان کے چار دانشوروں کو ان کی ملکی و ملی خدمات کے اعتراف کے طور پر ایوارڈ تقسیم کئے ایوارڈ کے حاصل کرنے والوں میں ابوالاثر حفیظ جالندھری، ڈاکٹر برہان احمد فاروقی، خواجہ افتخار مصنف "جب امرتسر جل رہا تھا" اور "تحریک پاکستان میں خواتین کا کردار" کی مصنفہ مسز شمیم جالندھری شامل ہیں۔ تقریب میں وطن عزیز کے ممتاز گلوکاروں شوکت علی، اخلاق احمد اور رجب علی نے ملی نغمے سنائے۔

پیغامِ تہنیت

خواجہ افتخار امرتسر کے ایک ہونہار نوجوان ہیں۔ انہوں نے تحریکِ پاکستان کے دوران طالب علم لیڈر کی حیثیت سے نمایاں کام کیا۔ بعد از قیامِ پاکستان وطنِ عزیز کے کلیدی عہدوں سے انگریز افسروں بالخصوص پاک پنجاب کے پہلے انگریز گورنر فرانسس موڈی کی برطرفی کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ بحالیِ جمہوریت اور کالے قوانین کی منسوخی کی تحریکوں میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔ ان کی تصنیف "جب امرتسر جل رہا تھا" نئی نسل کو صحیح صورتِ حال سمجھانے میں اہم کردار ادا کرے گی۔ میرے دل میں ایک عرصہ سے یہ خیال تھا کہ تحریک کے زمانے کی یادداشتوں کو منضبط طور پر قلمبند کروں۔ مگر اوّل تو میں صاحبِ قلم نہیں۔ دوسرے کشمکشِ روزگار نے کبھی فرصت ہی نہ دی اور بمصداق

ع یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

یہ سعادت خواجہ افتخار کے حصّے میں تھی۔ خواجہ صاحب کے رشحاتِ قلم اخبارات میں نظر سے گزرتے رہے اور اب یہ جان کر دلی مسّرت ہوئی کہ وہ ان کو کتابی صورت میں شائع کر رہے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ان کی تصنیف سے نئی اور پرانی نسل یکساں طور پر استفادہ کرے گی۔ میری دلی دعائیں اور نیک تمنائیں خواجہ صاحب کے ساتھ ہیں۔

میر انور سعید محمود
سابق جنرل سیکرٹری سٹی مسلم لیگ امرتسر
حال مقیم لاہور

عرضِ ناشر

خواجہ افتخار ہمیں ان دنوں کی کہانی سنا رہے ہیں" جب امرتسر جل رہا تھا" اور ان کی کہانی ہیں نہ مبالغے کا کوئی ذرّہ ہے، نہ تصنّع کا کوئی زاویہ، نہ جھوٹ کا کوئی شائبہ، نہ مس رپورٹنگ کا کوئی قضیہ۔ جو کچھ بھی ہے سولہ آنے سچ ہے، ایک پیسہ بھی زیادہ نہیں، یہ ہو سکتا ہے کچھ کم ہو اور تمام تر واقعات اور تمام تر حادثات کا تمام تر ذکر نہ کیا جا سکا ہو۔

خواجہ صاحب کی اس کاوش پر ممکن ہے کوئی زبان یہ بھی کہہ گزرتی اور ایسی زبانیں موجود تو ہر معاشرے میں ہوتی ہیں کہ پاگل خانہ ہر شہر میں نہیں تو ہر ملک میں تو لازماً موجود ہے۔ ہاں تو کوئی زبان کہہ سکتی تھی کہ خواجہ صاحب نئے زمانے میں اب ہم کو پرانی باتیں سنا رہے ہیں۔ لیکن گزشتہ چند دنوں کے واقعات نے ان زبانوں کو ایک بار پھر چپ کرا دیا ہے، انہیں ایک بار پھر بے زبان کر دیا ہے۔ بھارت میں مراد آباد سے دہلی اور سنبھل سے لے کر علی گڑھ تک ایک بار پھر" امرتسر جل رہا ہے"۔

امرتسر ایک شہر ہے لیکن صرف شہر کہاں؟ وہ تو ہماری تاریخ ہے، ہمارا اثاثہ ہے۔ امرتسر جو جلا تھا تو اس لئے نہیں کہ اس کی دیواروں سے کسی کو نفرت تھی، اس کے مکانوں سے کسی کی دشمنی تھی، اس کی چھتوں سے کسی کو کد تھی، اس کے میدانوں سے کسی کی ٹھن گئی تھی۔ امرتسر یقیناً اس لئے نہیں جلا تھا۔ امرتسر اس لئے جلا تھا، اس لئے جلایا گیا تھا کہ وہاں مسلمان بستے تھے۔ پاکستان کا مطالبہ کرنے والے سرگرم تھے۔ پاکستان کو زندگی سمجھنے والے نعرہ زن تھے اور اسے حاصل کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دینے کو عین زندگی سمجھتے تھے۔

یہ آگ لگانے والے کون تھے، ان سے کون واقف نہیں؟ بنیا سامراج اپنے آلۂ کار بدل لیتا ہے لیکن اپنی سرشت نہیں بدلتا، اسلحہ بدلتا ہے مزاج نہیں بدلتا، بہروپ بدلتا ہے منزل نہیں بدلتا اور اس کی منزل یہی ہے کہ پورے برصغیر پاک و ہند اور پھر اس سے بھی آگے بڑھ کر راج کرے اور یہاں بسنے والے انسان اسے اپنا خدا سمجھیں تو سانس لینے کی اجازت پائیں۔

ایک خدا کو ماننے والوں کو نہ یہ پہلے منظور تھا، نہ آج منظور ہے اور نہ کل منظور ہو گا۔ چکنا چور عصمتیں، لٹی ہوئی عزتیں، خاک میں ملتے ہوئے مکان، لہو میں نہاتے ہوئے انسان، سب یہی اعلان کر رہے ہیں۔ پاکستان انہی جذبوں اور انہی ولولوں کے تحت بنا تھا اور یہی جذبے اسے زندہ رکھیں گے۔ مسلمان اپنے اللہ کے علاوہ کسی اور کی غلامی قبول نہیں کر سکتا، قبول نہیں کرے گا۔

خواجہ افتخار کی تحریر کیا ہے؟ ایک اذان ہے کہ دلوں کو گرماتی جا رہی ہے۔ ایک پکار ہے کہ ذہنوں کو جگاتی جا رہی ہے۔ ایک للکار ہے کہ انسانوں کو جھنجھوڑتی جا رہی ہے۔ ایک تصویر ہے کہ نئی نسل کو اور ان آنکھوں کو وہ سب کچھ دکھاتی جا رہی ہے جو انہوں نے نہیں دیکھا کہ پاکستان کیسے بنا تھا، اس کی ضرورت کیوں تھی اور اس کی ضرورت کیوں ہے؟

اے اونگھتے جذبو دیکھو اور بیدار ہو جاؤ، بیدار ہو جاؤ اور دیکھو کہ پاکستان ناگزیر تھا، ناگزیر ہے۔ یہ نہ ہوتا تو آج ہم کچھ بھی نہ ہوتے۔ یہ نہیں رہے گا تو ہم کچھ بھی نہ رہیں گے۔ اُٹھو، اُٹھو کہ تحریک پاکستان جاری ہے۔ امرتسر آج بھی جل رہا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اب غیروں نے اس کا نام مراد آباد رکھ دیا ہے۔

مجیب الرحمان شامی

یکم اگست ۱۹۸۰ء

مشاہیر کی نظر میں

جناب جسٹس نسیم حسن شاہ (سپریم کورٹ)

خواجہ افتخار کی کتاب "جب امرتسر جل رہا تھا" ایک گراں قدر تصنیف ہے۔ فاضل مصنف نے آگ اور خون میں لپٹی ہوئی اس سرگزشت کو نئی نسل کے استفادہ کے لیے سپردِ قلم کیا ہے جو وقت کے اس موڑ پر نہ تو تاریخِ پاکستان کے پس منظر سے آشنا ہے اور نہ ہی ان قربانیوں سے واقف ہے جو لاکھوں مسلمانوں نے پاکستان کے حصول کی جدوجہد میں پیش کی تھیں۔

فاضل مصنف نے یہ کتاب لکھ کر وقت کی اہم ضرورت کو احسن طریقے سے پورا کیا ہے۔ اس تصنیف کے دیگر محاسن کے علاوہ ایک پہلو کا تذکرہ اہم بھی ہے اور منفرد بھی۔ وہ ہے فاضل مصنف کا قیامِ پاکستان کی راہ میں عام اور غریب آدمیوں کے بے مثل کردار کا اعتراف!

مسلمانانِ ہند نے قائداعظمؒ کی ولولہ انگیز قیادت میں تحریکِ پاکستان کو ساحلِ مراد تک پہنچانے میں جو بے مثل قربانیاں دیں ان میں امرتسر کے جیالے مسلمانوں کا خون بھی شامل ہے جو اس تحریک کا ہراول دستہ تھے۔ ہمیں آج بھی امرتسر سپرٹ کی ضرورت ہے۔

خواجہ صاحب نے اس کتاب کو جس دلسوزی سے تحریر کیا ہے اس پر انہیں جتنا بھی خراجِ تحسین پیش کیا جائے کم ہے۔

جناب جسٹس میاں محبوب احمد

مجھے خواجہ افتخار صاحب کی یادداشتوں پر مشتمل کتاب "جب امرتسر جل رہا تھا" پڑھنے کا موقعہ ملا۔ یہ کتاب ان عظیم قربانیوں کی ایک... جھلک پیش کرتی ہے جو ہماری قوم نے حصول

پاکستان کی راہ میں دیں۔ ابھی بے شمار لوگ زندہ ہیں جنہوں نے یہ خونچکاں واقعات دیکھے اور بہت سے ایسے ہیں جو خود یا اُن کے اہلِ خاندان بے پناہ ظلم وستم اور وحشیانہ قتل وغارت کا نشانہ بنے۔

ہماری نئی نسل کے لئے بالخصوص اس کتاب کا مطالعہ مفید ہے تاکہ اسے بھی معلوم ہو سکے کہ ان کے آباؤ اجداد کو پاکستان کی منزل تک پہنچنے کے لئے آگ اور خون کے کس ہولناک سمندر سے گزرنا پڑا تھا۔ یہ کتاب ہماری تاریخ کے اس دور سے متعلق ہے جب پوری قوم قائدِ اعظم محمد علی جناح کی ولولہ انگیز اور ایمان افروز قیادت میں متحد ہو گئی تھی۔ خواجہ صاحب نے جس دردمندی سے یہ تصنیف سپردِ قلم کی ہے اس پر انہیں تہِ دل سے مبارکباد دیتا ہوں۔

سابق جسٹس جناب آفتاب فرخ

پاکستان کا حصول دس کروڑ مسلمانانِ ہند کی مشترکہ جدوجہد اور ایثار کا ثمر ہے اور اگر ہم ہندو کے رحم وکرم پر چھوڑ دیئے جاتے تو موجودہ نسل اس آزادی سے سانس بھی نہ لے سکتی جس آزادی سے وہ وطنِ عزیز کے ماحصل کی بے قدری کرتے ہیں۔ "جب امرتسر جل رہا تھا" کروڑوں مسلمانوں کی قربانیوں اور عظمتوں کی داستانوں میں سے ایک داستان ہے۔

تحریکِ پاکستان کے سرگرم کارکن خواجہ افتخار کی کتاب ایک ایسی تصنیف ہے جس کی عرصہ دراز سے ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ انہوں نے یہ کتاب لکھ کر نہ صرف وقت کی اہم ضرورت پوری کی ہے بلکہ نئی نسل کو اس حقیقت سے بھی آگاہ کیا ہے کہ پاکستان کے حصول کے لئے مسلمانوں کو ایک طویل جدوجہد ہی نہیں کرنی پڑی تھی بلکہ اس سلسلہ میں انہوں نے اپنی جان، مال اور عزت کے نذرانے پیش کرنے سے بھی گریز نہیں کیا تھا۔

اقبال زبیری، چیف ایڈیٹر روزنامہ مشرق لاہور

خواجہ افتخار تحریکِ پاکستان کے نامور رکن رہے ہیں اور قومی اخبارات وجرائد میں مسلمانانِ برّصغیر کی جدوجہد آزادی کے مختلف ادوار کے بارے میں تواتر سے لکھتے آ رہے ہیں۔ انہوں نے بالخصوص ظہورِ پاکستان کے وقت مسلمانانِ امرتسر کے تاریخی کردار کو اپنے تحقیقی مقالے کا موضوع بنایا ہے۔ جب ۱۹۴۷ء کے فسادات میں پورے برّصغیر کے مسلمان ہندو فرقہ پرستی کے غیظ و غضب کا ہدف بنے ہوتے تھے۔ امرتسر میں دہشت گردی کی آگ سب سے زیادہ بھڑکی تھی اور اس کے خوں آشام شعلوں نے مسلمانانِ امرتسر کے لاتعداد کڑیل جوانوں اور جیالوں کو نگل لیا تھا خواجہ افتخار نے انہی شہیدوں کی داستان اپنے لہو میں ڈبو کر لکھی ہے۔ اس جہادِ حریت میں مسلمانانِ امرتسر نے دوسرے کئی شہروں سے بڑھ کر خون اور آنسوؤں کا خراج پیش کیا جس کی لرزہ خیز اور دلوں کو گرما دینے والی تفصیلات خواجہ افتخار نے قلمبند کر لی ہیں۔ ان کا اسلوبِ نگارش تاریخی وقائع نگار کا سا ہے اور انہوں نے بڑی محنت اور کاوش سے سارا مواد جمع کیا ہے۔ بھارت میں رونما ہونے والے مسلم کش فسادات کے پسِ منظر کو سمجھنے کے لئے بھی یہ کتاب نئی نسل کے لئے بہترین رہنما ثابت ہوگی۔

محمد ہارون سعد، چیف ایڈیٹر روزنامہ امروز لاہور

خواجہ افتخار کی گرانقدر اور تاریخی کتاب "جب امرتسر جل رہا تھا" اس اعتبار سے اس سال کی نہایت اہم کتاب سمجھی جائے گی کہ یہ جس موضوع سے تعلق رکھتی ہے وہ جانے خود تاریخ کا ضروری اور ناقابلِ فراموش حصہ ہے۔ "جب امرتسر جل رہا تھا" ان دنوں کی کرب انگیز کہانی ہے جب پاکستان معرضِ وجود میں آ رہا تھا۔ ایک کہانی حقیقت کا روپ دھار رہی تھی اور ابدی صداقتوں کے فیصلے مؤرخ قلمبند کر رہا تھا۔ یہ محض امرتسر کی کہانی نہیں بلکہ ان تمام شہروں

اور قصبوں کی کہانی ہے جو پاکستان کے لئے اپنے درودیوار، اپنی تہذیب، اپنے تمدن اور اپنی ثقافت کی قربانی دے رہے تھے اور پاکستان مانگنے والوں کو اس جرم کی پاداش میں خاک و خون میں نہلایا جا رہا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ خواجہ افتخار کی یہ کتاب ان تمام روشن اور زندہ کتابوں میں سرِفہرست رکھی جائے گی جو قیامِ پاکستان کے واقعات وحالات پر مرتب کی گئی ہیں اور ایسی کتاب یقیناً اس قابل ہے کہ اسے نہ صرف طلبا کے نصاب کا حصہ بنایا جائے بلکہ ہر اس گھر میں موجود رہے جو نئی نسل کو اس ملک کے قیام کے اصل مقصد و مفہوم سے آگاہ رکھنا چاہتا ہے۔

مصطفٰے صادق، چیف ایڈیٹر روزنامہ وفاق لاہور

تہائی صدی گزر جانے کے باوجود تحریک پاکستان کے ایک اہم باب، جس کے اوراق خونِ شہیدانِ پاکستان سے رنگین ہیں کا ذکر ایسی یادیں تازہ کرنے میں مدد دیتا ہے جو ہماری زندگی کی عظیم متاع ہیں۔ خواجہ افتخار کی کتاب "جب امرتسر جل رہا تھا" قومی تاریخ کے اسی اہم باب سے تعلق رکھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ مصنف کو جزائے خیر سے نوازے کہ انہوں نے ایک اہم قومی خدمت انجام دی ہے۔ خدا کرے کہ قوم بھی اس خدمت کی قدردانی کا حق ادا کر سکے۔

ایم، شفاعت، چیف ایڈیٹر روزنامہ مغربی پاکستان لاہور

پاکستان کا قیام اسلامیانِ ہند کا وہ عظیم کارنامہ ہے جس کی مثال انسانی تاریخ میں کہیں نہیں مل سکتی۔ یہ صرف چند برسوں کی تحریک یا چند راہنماؤں کی قیادت میں معرضِ وجود میں نہیں آیا بلکہ اس کے پیچھے سوا صدی کا وہ عرصہ ہے جس میں کروڑوں مسلمان اپنی بقا۔ اور آزادی کی جنگ لڑتے رہے۔ خواجہ افتخار نے قوم کی ان شاندار قربانیوں کو اپنی تصنیف "جب امرتسر جل رہا تھا" میں بڑی دلسوزی کے ساتھ محفوظ کر دیا ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب میں ہندوؤں اور سکھوں کے روح فرسا مظالم کی اس طرح تصویر کشی کی ہے کہ قاری کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے

ہیں۔ خواجہ افتخار نے اس کتاب کے ذریعے آزادی کی راہ میں شہید ہونے والے مسلمانوں کو بھی خراجِ عقیدت پیش کیا ہے جن کے خون نے اس چمن کو مہک بخشی ہے۔ ان کا انداز بھی بڑا سادہ ہے۔ بہرطور ہم خواجہ صاحب کو مبارک باد پیش کرتے ہیں کہ انہوں نے قوم کو ایک فراموش شدہ سبق یاد دلایا ہے۔

جمیل اطہر، چیف ایڈیٹر روزنامہ تجارت لاہور

"جب امرتسر جل رہا تھا" خواجہ افتخار کے قلم سے اس دور کی یادوں پر مشتمل ایک عہد آفریں کتاب ہے جب برصغیر کے مسلمانوں نے قیام پاکستان کے لیے تاریخ کی بے مثل قربانیاں پیش کیں۔ لاکھوں مسلمانوں نے خاک و خون کے دریا عبور کر کے پاکستان کی سرحد میں قدم رکھا اور ہزاروں مسلمان عورتوں نے اپنی عصمت و عفت کی قیمت پر ہند و پاک کے مسلمانوں کے لئے الگ وطن کی راہ ہموار کی۔ آج کی نوجوان نسل اس امر سے بے خبر ہے کہ قیامِ پاکستان کتنی عظیم قربانیوں کے صلے میں ممکن ہوا۔ خواجہ افتخار مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے تاریخ کے اس ناقابل فراموش باب کو جسے قوم بدقسمتی سے فراموش کر چکی ہے دوبارہ تاریخ میں زندہ کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جن لوگوں کی نظر سے یہ کتاب گزرے گی اس کا مطالعہ پاکستان پر اُن کے ایمان و ایقان کو مستحکم کرے گا۔

مسعود شورش، ایڈیٹر ہفت روزہ "چٹان" لاہور

خواجہ افتخار صاحب نے "جب امرتسر جل رہا تھا" کے عنوان سے جو کتاب مرتب کی ہے میں نے اس کے بیشتر اوراق کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس کتاب کا ایک ایک لفظ حالات و حقائق کا ایک نہایت شفاف آئینہ ہے۔

جب پاکستان بن رہا تھا اس وقت خواجہ صاحب اپنی عُمر کی اس منزل پر تھے جہاں ایک

ذہین نوجوان کا دامنِ فکر و نظر واقعات کو پوری سچائی کے ساتھ سمیٹنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔
انہوں نے یادداشتیں ترتیب دینے کے سلسلہ میں جس فہم و ادراک کا مظاہرہ کیا ہے وہ واقعی قابلِ تحسین ہے۔ قیامِ پاکستان سے دو تین سال قبل جو واقعات اس برِصغیر میں رونما ہوئے ان کی کہانی بہت سے قلمکاروں نے لکھی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر شخص کا پیرایۂ اظہار جدا ہوتا ہے۔ سب نے اپنے اپنے انداز میں موضوع کے ساتھ انصاف کرنے کی کوشش کی ہے لیکن خواجہ افتخار کی تحریر اس اعتبار سے سو فیصدی مختلف ہے کہ اس میں مشاہدے کی بھرپور شدّت پائی جاتی ہے۔ حصولِ آزادی کی جدوجہد اور قیامِ پاکستان کی تاریخ کے بہت سے پہلو انہوں نے اس کتاب میں محفوظ کر کے قومی اعتبار سے ایک قابلِ قدر کارنامہ سرانجام دیا ہے۔

ثاقب زیروی ' ایڈیٹر ہفت روزہ "لاہور"

- جب امرتسر جل رہا تھا۔
- جب سارے مشرقی پنجاب نے نہتے اور بے بس مسلمانوں کے تپتے دہکتے ہوئے الاؤ کی صورت اختیار کر لی تھی۔
- جب فرزندانِ اسلام عالمی نقشے پر ایک عظیم اسلامی مملکت کی لکیریں ابھرنے کے شکرانے کے طور پر اپنی جانوں کے صدقے اتار رہے تھے۔ خواجہ افتخار نے یہ مقتل اور یہ دہکتا ہوا الاؤ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کی آنچوں کو اپنی ناقابلِ فراموش یادوں کے مساموں میں سمو لیا۔ پھر یہ آنچیں ۴۴ سال تک ایک متاعِ عزیز کی طرح ان کے دل و دماغ کے نہاں خانوں میں محفوظ رہیں۔ حق کے شیدایانِ ملّت کی جاں سپاریوں کی اس بیش بہا امانت کو قوم کے سپرد کرنے کی ساعت آن پہنچی۔ تحریکِ پاکستان کے اس ثابت قدم اور باوفا کارکن خواجہ افتخار کا تیز مشاہدہ' حساس دل' حقیقت رقم قلم اور سلیس و دلنشیں اندازِ اظہار و بیان' ورق ورق پر شعلہ و شبنم کی آویزشوں کے نظارے بکھرے ہوتے ہیں۔ لاریب

لہو میں ڈوب کے پہنچے ہیں جو کنارے تک
وہ جانتے ہیں کہ یہ راہ کس قدر تھی کٹھن
سلام تم پہ شہیدانِ عرصۂ تقسیم
کہ جان دے کے بچالی ہے آبروئے وطن

اللہ کرے خواجہ افتخار کی یہ تالیف دلوں میں جذبۂ ایثار کی اس لَو کو ایک بار پھر تیز کر دے جو زندہ رہنے والی قوموں کا سرمایۂ افتخار ہوتی ہے۔

ظہور عالم شہید، ایڈیٹر ہفت روزہ "استقلال" لاہور

خواجہ افتخار کی تصنیف "جب امرتسر جل رہا تھا" وقت کی آواز کے عین مطابق ہے۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ خواجہ صاحب کی کتاب ایک ایسے موقع پر چھپ کر آتی ہے جب ہندوستان پھر بدترین فرقہ وارانہ فسادات کی لپیٹ میں ہے۔ ۳۳ برس پہلے امرتسر کے واقعات اور ان دنوں ہندوستان کے مختلف شہروں میں مسلمانوں کے کشت و خون کی تفصیلات سے مطالبہ پاکستان کی اہمیت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ خواجہ صاحب نے تحریک پاکستان کے دوران امرتسر کے مسلمانوں کی طرف سے دی جانے والی قربانیوں کو جس موثر انداز سے سپردِ قلم کیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔ امرتسر کی طرح دوسرے مقامات پر بھی مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی۔ پاکستان کی نئی نسل کو اس کتاب کے مطالعہ سے اُس آزادی کی قدر و منزلت کا صحیح اندازہ ہو سکے گا جو قربانی اور سرفروشی کی لگاتار جدوجہد کے بعد ہمیں حاصل ہوئی۔ پرانی نسل کے لئے بھی یہ کتاب بڑی اہمیت رکھتی ہے اور ایسے گرانقدر لٹریچر کی اشاعت سے ملک و قوم کے لئے قربانی پیش کرنے کا جذبہ پیدا کرنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔

احسان دانش

خواجہ افتخار صاحب نے "جب امرتسر جل رہا تھا" کے نام سے جو کتاب لکھی اس سے

نفسِ مضمون کی شدّت کا اندازہ ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب کے تمام مضامین پڑھ کر اندازہ لگایا جائے تو یہ کتاب تاریخ کا ایک باب معلوم ہوتی ہے جو ہر پاکستانی کے مطالعہ کے لئے ضروری ہے۔ خواجہ صاحب نے یہ ادب پارہ لکھ کر تاریخ کو اُجاگر کیا ہے اور اس کا مطالعہ تاریخی فہم و ادراک میں اضافہ کرتا ہے۔ اس قسم کے واقعات اگر اندھیرے میں رہ جائیں تو بعد میں ان کی تلاش میں لوگ سرگرداں و پریشان رہتے ہیں جیسے جلیانوالہ باغ کے سانحہ پر بڑے بڑے ادیبوں نے بھی صحیح روشنی نہیں ڈالی۔ نتیجتہً تاریخ کا وہ باب گومگو کے عالم میں رہ گیا ہے۔

خواجہ صاحب کی اس کتاب کا مطالعہ تاریخ اور سیاست سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کے لئے یقیناً مفید ہوگا۔

ابوالاثر حفیظ جالندھری

خواجہ افتخار کی کتاب جب امرتسر جل رہا تھا "نئی اور پرانی نسل کے دلوں میں نیا عزم، نیا ولولہ اور نئی تڑپ پیدا کرنے کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ خواجہ صاحب نے اپنی تصنیف میں جو واقعات قلمبند کئے ہیں ان میں سے بعض واقعات کا میں بھی شاہد ہوں۔ اسلامیانِ امرتسر کی غیرتِ ایمانی اور جرأت و ایثار کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے بلکہ میں یہ بات کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ پاکستان کے حصول کا سہرا امرتسر کے ان کفن بردوش مسلمانوں کے سر ہے جنہوں نے تاریخ کے اس باب کو اپنے خون سے رقم کر کے ہمیں آزادی کی نعمت سے ہمکنار کیا۔

سیف الدین سیفؔ

ہمارا ماضی قریب مسلمانوں کی تاریخ کا وہ لہو رنگ باب ہے جسے ہم کبھی فراموش

نہ کر سکیں گے۔ خواجہ افتخار صاحب کی تصنیف "جب امرتسر جل رہا تھا" کا مطالعہ اس لحاظ سے نہایت اہم ہے کہ ہماری نئی نسل اس امر سے واقف ہو سکے کہ ہم نے اس خطہ پاک کی کیا قیمت ادا کی تھی۔ مسلمانوں نے اپنے دورِ عروج میں مراکش اور ہسپانیہ سے لے کر انڈونیشیا تک اپنی فتوحات میں اتنا خون نہیں بہایا تھا۔ جتنا ہمیں زمین کے اس ٹکڑے کے لئے بہانا پڑا۔ امرتسر اُن بے شمار جلتے لٹتے ہوئے شہروں میں سے ایک تھا جو اس وقت اپنی جرأت اور بے مثال عزم و یقین سے ایک نئی قوم نئے ملک کی بنیاد رکھ رہے تھے۔ کسی نے کہا ہے جو قوم اپنی تاریخ فراموش کر دیتی ہے اس کا جغرافیہ بھی بدل جاتا ہے۔ ہمارا گزرا ہوا کل آنے والے کل کی نشاندہی کرتا ہے۔ آج کے دور میں یہ کتاب ایک لحاظ سے درسِ عبرت بھی ہے۔

خواجہ صاحب پر سلام ہو جنہوں نے واقعات کی ان کڑیوں کو جوڑ کر اسے تاریخ کا درجہ دیا ہے۔

وقار انبالوی

۱۹۴۷ء کی دوسری ششماہی مشرقی پنجاب کے انبالہ جالندھر ڈویژن کے مسلمانوں پر جو قیامتِ صغریٰ لے کر آئی تھی اس میں مسلمانوں کی تباہی و بربادی ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں قتل و غارت اور امن کے پجاریوں کی شہ پر فتنہ و فساد کی تفصیلات اخباروں، محفلوں اور کیمپوں میں مدتوں لوگوں کو خون کے آنسو رلاتی رہی ہیں۔ بعض زخم تو ناسور بن چکے ہیں۔ امرتسر کے مسلمانوں کو اس ضمن میں مسابقت کا شرف حاصل ہے کہ وہ سب سے پہلے ظلم و ستم کا شکار ہوئے۔ خواجہ صاحب کا تعلق چونکہ وہیں سے تھا اس لئے انہوں نے اس کتاب میں اس خونچکاں آپ بیتی کو اس طرح بیان کیا ہے کہ وہ ایک تاریخی دستاویز بن کر رہ گئی ہے۔

طفیل ہوشیارپوری

جس نے نیزوں پہ اُچھلتے ہوتے سر دیکھے ہیں
جس نے مرمرسے بدن خون میں تر دیکھے ہیں
جس نے شعلوں میں نہاتے ہوتے گھر دیکھے ہیں
جس نے لُٹتے ہوتے عصمت کے گُہر دیکھے ہیں

وہ خواجہ افتخار جو سماجی کارکن بھی ہیں اور صاحب طرز ادیب بھی۔ ان کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ تقسیم ملک سے پہلے مسلم لیگ کے سرگرم کارکن تھے۔ اس خطۂ پاک کے حصُول میں مسلمانوں پر جو قیامتیں ٹوٹیں وہ اس کے عینی شاہد ہیں۔ وہ خُون کا دریا پاٹ کر امرتسر سے لاہور پہنچے۔ کچھ عرصہ تو ان کے دل کی آگ دل میں ہی سلگتی رہی۔ آخرکار یہ آگ آنسوؤں میں ڈھل گئی۔ آنسوؤں نے الفاظ و بیان کی صورت اختیار کرلی یوں "جب امرتسر جل رہا تھا" ایسی کتاب معرض وجود میں آتی۔

جہاں تک میرے فہم و ادراک کا تعلق ہے یہ کتاب قومی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے جو تاقیامت ہماری آنے والی نسلوں کو روشنی کے مینار کی طرح روشنی تقسیم کرتی رہے گی۔ زندہ قومیں اپنے ماضی کو کبھی فراموش نہیں کرتیں ان کی بقا کا راز اسی بات میں مضمر ہے۔

ڈاکٹر عبدالرؤف، ناظم تعلیمات حکومت پنجاب

زندہ دلوں کی ایک ایسی منفرد بستی تھی جسے اللہ تعالیٰ نے خلوص، ایثار اور ہمت کی نعمتوں سے خوب نوازا تھا۔ اس عظیم شہر کے جیالوں نے قیام پاکستان کے لئے جو عدیم النظیر قربانیاں دیں وہ واقعی محیّر العقول ہیں۔ خلوص و وفا اور آگ و خون کے انہی تاریخی کارناموں کو خواجہ افتخار نے بڑے خوبصورت انداز میں قلمبند کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے میرے

خیال میں اس دلچسپ داستان کا مطالعہ ہر اس حساس فرد کے لئے بصیرت افروز ثابت ہوگا جسے مسلمانوں کے فکر و عمل کی عظمتوں کو سمجھنے اور مجاہدانہ اسلوبِ حیات اپنانے کا حقیقی شوق ہو۔

ڈاکٹر وحید قریشی، پرنسپل یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور

تحریک پاکستان کے سرگرم کارکن خواجہ افتخار صاحب نے "جب امرتسر جل رہا تھا" کے عنوان سے اپنے مضامین کو کتابی صورت میں شائع کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ برصغیر کی تقسیم کے موقع پر جس طرح مسلمانوں کا قتل عام ہوا اس کی جھلکیاں بعض مضامین اور کتابوں میں موجود ہیں۔ امرتسر میں مسلمانوں پر جو قیامتِ صغریٰ ٹوٹی اس کی رُوداد اسے حمید صاحب اور بعض دوسرے اہلِ قلم حضرات نے بیان کی ہیں۔ لیکن خواجہ صاحب خود عملی طور پر اس سانحہ سے گزرے ہیں اس لئے انہوں نے جن واقعات کو بیان کیا ہے ان میں واقعاتی صحت کے علاوہ پاکستان کے ایک مخلص کارکن کے دل کی دھڑکنیں بھی شامل ہیں اس لئے تاریخی تفصیلات کو محفوظ کرنے کے علاوہ کتاب کی اہمیت ایک ادب پارے کی بھی ہے جس میں جذبات و احساسات اپنی پوری شدت کے ساتھ ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ہماری تاریخ کا یہ دَور ابھی تک تفصیلی مطالعہ کا محتاج ہے۔ یہ کتاب اس کمی کو انشاءاللہ پورا کرے گی۔

پروفیسر مرزا محمد منوّر، صدر شعبہ اقبالیات یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور

خواجہ افتخار تحریکِ پاکستان کے آخری چند برسوں میں قیامِ پاکستان کی جدوجہد میں عملی طور پر شریک رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی حالیہ تصنیف "جب امرتسر جل رہا تھا" میں جو واقعات بیان کئے ہیں وہ شنیدہ نہیں دیدہ ہیں اس لئے ان کی اہمیت محتاجِ بیان نہیں۔ پاکستان کی نئی نسل کو ان واقعات کا بغور مطالعہ کرنا چاہیئے تاکہ انہیں اندازہ ہو سکے کہ قیامِ پاکستان

کے لئے ان کے بزرگوں نے کیا کیا قربانیاں دیں اور صرف اس جرم کی پاداش میں کہ وہ مسلمان ہیں ان پر ظلم وستم کے کیا کیا طوفان گزر گئے۔ یہ تصنیف ان لوگوں کے لئے بھی تازیانہ عبرت ہے جو اسلام کے قاتلوں کو آج بھائی ثابت کرنے پر تلے ہوتے ہیں۔

پروفیسر مسکین علی حجازی، سابق صدر شعبہ صحافت پنجاب یونیورسٹی

خواجہ افتخار صاحب اُن اہلِ قلم میں سے ہیں جو حصولِ پاکستان کی جدوجہد میں حصہ لینے والے مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ میں نے خواجہ صاحب کی تصنیف "جب امرتسر جل رہا تھا" کا مسودہ دیکھا ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے یہ بتایا ہے کہ امرتسر کے مسلمانوں پر ۱۹۴۷ء میں کیا گزری۔ کس کا کیا لٹا اور کیا بچا؟ خواجہ افتخار صاحب اس وقت عنفوانِ شباب میں تھے۔ ان کا تعلق امرتسر سے تھا۔ انہوں نے جو کچھ دیکھا اسے اپنے الفاظ میں پیش کر دیا ہے۔ بظاہر اس کتاب کے مطالعہ سے اس امرتسر کی تصویر سامنے آتی ہے جس کے مسلمان مکینوں کو مسلمان اور پاکستان کے حامی ہونے کی سزا دی گئی لیکن اصل میں یہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ۱۹۴۷ء کے پورے بھارت کے خدوخال نظر آتے ہیں۔

خواجہ صاحب کی تحریر کا ایک ایک لفظ پُر تاثیر ہے۔ انہوں نے جرأت و سرفروشی جذبہ ایمان، ظلم و بربریت اور شقاوت و سنگدلی کی متعدد کہانیاں بیان کی ہیں کئی کرداروں سے متعارف کرایا ہے۔ یہ کتاب ایک عام قاری کے لئے بھی ایک دلدوز اور دلچسپ داستان ہے۔

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، پروفیسر شعبہ اُردو اورینٹل کالج لاہور

خواجہ افتخار میرے عزیز بھائی ہیں۔ وہ زمانہ مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے جب ہمارا

گھرانہ چوک منّاں سنگھ سے نکل کر بحالِ خراب شریف پورہ پہنچا اور ان کے ہاں مقیم ہوا۔ شریف پورہ امرتسر میں مسلمانوں کا قلعہ تھا۔ اس پر جب کبھی ہندوؤں اور سکھوں کا حملہ ہوتا تھا تو نوجوان سب سے پہلے انہیں روکنے کے لئے سربکف میدان میں آتے تھے ان میں خواجہ صاحب پیش پیش ہوتے تھے۔ خواجہ صاحب جیسے چند دلیر نوجوانوں کی ہمّت کی بدولت شریف پورہ کے مُسلمان تہہِ تیغ ہونے سے بچ گئے اور عورتیں بے آبروئی سے محفوظ رہیں ورنہ ہمارے ساتھ کیا سلوک ہوتا۔ اس کے تصوّر ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

ایسی کتابیں زیادہ سے زیادہ شائع ہونی چاہئیں۔ ہندوستان کے ہر شہر سے ہجرت کرنے والوں کو ایسے واقعات تحریر میں لانے چاہئیں تاکہ ان لوگوں کے لئے سرمۂ عبرت بن سکیں جو کور چشم ہو چکے ہیں۔

دلدار پرویز بھٹی، کمپیئر لاہور ٹیلی ویژن

نوجوان نسل یہ تو جانتی ہے کہ پاکستان بنا مگر کیسے بنا یہ نہیں جانتی۔ اِدھر اُدھر سے کچھ سن لیا کچھ پڑھ لیا مگر بات نہیں بنتی۔ "جب امرتسر جل رہا تھا" ایک ہی جلد میں مربوط انداز میں سہل زبان میں ایک تاریخی دستاویز ہے جس کی خوبی اس کا مبنی برحق ہونا اور سیدھا سادھا انداز ہے۔ خواجہ صاحب کی کتاب کے مطالعہ کے بعد مجھے وہ بیک وقت ایک مصوّر، محقق اور مؤرخ نظر آتے ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ یہ کتاب ایسی اور بہت سی کتابوں کا پیش خیمہ ہوگی۔ جو قومیں اپنی تاریخ پر نظر نہیں رکھتیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ خدا کرے ہم قائد اعظمؒ کی اس امانت "پاکستان" کی حفاظت کر سکیں۔

حمید اصغر نجید صدر انجمن صحافیانِ پنجاب

پاکستان کے نامور قلم کار خواجہ افتخار نے "جب امرتسر جل رہا تھا" جیسی خوبصورت کتاب خونِ دل میں انگلیاں ڈبو کر تحریر کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کے ایک ایک لفظ میں درد اور تاثیر بدرجہ اتم موجود ہے۔

خواجہ صاحب کی اس کاوش پر انہیں جس قدر خراجِ تحسین پیش کیا جائے کم ہے کیونکہ انہوں نے نئی نسل کو ایک ایسی تصویر دکھائی ہے جو اس سے قبل انہیں کسی نے نہیں دکھائی تھی۔ لہٰذا یہ ایک ایسی کتاب ہے جو آنے والی نسلوں کو نظریہ پاکستان کا مفہوم سمجھانے کے ساتھ ساتھ دشمنانِ پاکستان کے مکروہ چہروں کی پہچان بھی کراتی رہے گی۔

عزیز جمال، سیکرٹری لاہور پریس کلب

خواجہ افتخار نے "جب امرتسر جل رہا تھا" جیسی عمدہ اور مفید کتاب لکھ کر درحقیقت ہماری قومی زندگی کی شاہراہ پر ایک ایسا چراغ جلا کر رکھ دیا ہے جس کی روشنی سے آنے والی نسلیں نہ صرف اپنے ذہنوں کو منور اور معطر کرتی رہیں گی بلکہ آزادی کے اس مفہوم سے بھی بخوبی آگاہ ہو سکیں گی جو پاکستان کے جلیل القدر بانی حضرت قائداعظمؒ محمد علی جناح کی ولولہ انگیز قیادت میں سرفروشی کی لگاتار جدوجہد کے بعد ہمیں حاصل ہوتی۔

خواجہ صاحب کا اندازِ بیان اتنا سادہ، دلچسپ عام فہم اور شیریں ہے کہ ان کی کتاب شروع کرنے کے بعد قاری اسے ایک ہی نشست میں پڑھ لینے پر خود کو مجبور پاتا ہے۔ کتاب کی دوسری خوبی یہ ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے پاکستان بنتے نہیں دیکھا یا امرتسر ٹیلی ویژن کی ثقافتی یلغار سے متاثر ہو کر اپنے ازلی دشمنوں کو فراموش کرتے جا رہے ہیں ان کے لئے یہ کتاب روشنی کے مینار کی حیثیت رکھتی ہے۔

اخبارات و رسائل کے آئینے میں

THE PAKISTAN TIMES

Lahore, November 13, 1981

While Amritsar burned....

In one year Khawaja Iftikhar's account of the communal massacres of Amritsar from March 3 to August 14, 1947, has gone into second edition. Since the author was himself involved in the disturbances, most of the story is an eye-witness document; but to guard against an excessively emotive retelling he has gone to the survivors of those terrible days and confirmed the various versions. What is more, he has gone back to Amritsar and taken photographs of places which were the scenes of communal massacre.

No formal historical document can recapture the days the Muslims of Amritsar went through. Incidents of extreme cruelty and great personal valour can be narrated only in an eye-witness account of the sort attempted by Khawaja Iftikhar. From the first day of the riots to the day of the Muslim exodus from the city, the drama and tragedy of a people's deprivation comes alive. The story of the first man who fell to the blow of a dagger is carefully investigated and recorded; the horrendous massacre and rape of the Muslim train near Kapurthala is described in detail with as many names as possible of the participants and victims from both sides.

Communal battles take the pride of place in the book but not without the necessary backdrop of politics and executive and judicial activity. The party action from both sides, police action with personal negative and positive contributions and court decisions are all faithfully described. The book is profusely illustrated and is a keepsake for those who wish to know the drama tis personae of the Amritsar tragedy. It is the story of a brave community who have not allowed their spirit to be defeated even after 1947. By putting his impressions in a book, Khawaja Iftikhar has put to shame another son of Amritsar, A. Hameed, who has written memorable articles on the same subject.—K.A.

خواجہ افتخار ایک متحرک اور مخلص شخصیت ہیں۔ انہیں جب بھی دیکھا حرکت میں اور سرگرمِ عمل دیکھا۔ خواجہ صاحب کی کتاب بھی ان کی طرح متحرک ہے اور قیامِ پاکستان کی جدوجہد کے دنوں کے واقعات ایک چلتی پھرتی تصویر کی طرح نظر کے سامنے سے گزر جاتے ہیں۔ کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ کتاب پڑھنے والا خود کو اسی کتاب کا ایک کردار محسوس کرتا ہے اور اس کے جذبات وہی ہوتے ہیں کہ جن کی بنیاد پر خواجہ صاحب نے اپنی معلوماتی، تاریخی اور بامقصد کتاب تحریر کی ہے۔ یہ کتاب لرزہ خیز واقعات کا ایک ایسا آئینہ ایام ہے جس میں نہ صرف مشرقی پنجاب کے مسلمان مہاجرین پر گزرنے والی قیامت کے المناک مناظر بلکہ مطالبہ پاکستان کے جرم کی پاداش میں ان پر عرصہ حیات تنگ کرنے والے خونخوار بھیڑیوں کے مکروہ چہرے دیکھے جاسکتے ہیں اور خواجہ افتخار نے ان خونخوار بھیڑیوں کے مکروہ چہرے جس مہارت سے بے نقاب کئے ہیں اس پر انہیں جس قدر خراجِ تحسین پیش کیا جاتے اتنا کم ہے۔

(تحریر: جناب حسنین جاوید)

فاضل مصنف خواجہ افتخار صاحب نے یہ کتاب لکھ کر نئی نسل کو قیامِ پاکستان کے محرکات و اسباب سے آگاہ کیا ہے اور یہ ہمارے لئے ایک مستقل یاددہانی کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ کتاب کی مقبولیت و پذیرائی کا یہ عالم ہے کہ دو برس کے اندر اس کے تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور یہ کتاب تحریکِ پاکستان کے موضوع پر بہترین تصنیف

کا ایوارڈ بھی حاصل کر چکی ہے۔ بلاشبہ ایسی کتاب برسوں بعد لکھی جاتی ہے۔ ہمارے نزدیک اس کتاب کا شمار دُنیا کی عظیم کتب میں کیا جا سکتا ہے۔

(تحریر: جناب قیوم اعتصامی)

مشرق

۱۷ دسمبر ۱۹۸۰ء

امرتسر ایک شہر کا نام ہے مگر یہ ایک تاریخ اور ثقافت کا بھی عنوان ہے اور شہر کی تاریخ اسلامیانِ ہند کے سیاسی شعور کی تاریخ ہے۔ جلیانوالہ باغ کے شہرت یافتہ اس شہر نے تحریکِ خلافت کو پروان چڑھایا، تحریکِ کشمیر کو بڑھاوا دیا اور آخر ش تحریکِ پاکستان کو اپنے لہو سے سینچا۔ خواجہ افتخار نے تحریکِ پاکستان کے اس باب کو "جب امرتسر جل رہا تھا" کے نام سے رقم کیا ہے۔ مسلمانانِ امرتسر کی تاریخ کا یہ خونیں باب مارچ ۱۹۴۷ء میں اینٹی خضر ایجی ٹیشن سے شروع ہوتا اور اگست ۱۹۴۷ء پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس پانچ چھ ماہ کے عرصہ میں امرتسر کے مسلمانوں پر کیا قیامت گزری اور انہوں نے کس جی داری کے ساتھ اس قیامت کا مقابلہ کیا۔ اس کی رُوداد قلمبند کرنے کے لئے چیتے کا جگر چاہیے تھا۔

خواجہ افتخار تحریکِ پاکستان کے ان کارکنوں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں جن کے کان لڑکپن ہی میں پاکستان آشنا ہو گئے تھے اور جنہوں نے اپنی نوجوانی کا زمانہ تحریکِ پاکستان کے لئے وقف کر دیا تھا۔ پاکستان کا مطالبہ کرنے کی وجہ سے مسلمانانِ امرتسر پر جو قیامت ڈھائی گئی وہ اس کے عینی شاہد ہیں۔ مُسلم کش فسادات میں انہوں نے کسی مصیبت کی پرواہ کئے بغیر اپنے بھائیوں کی خدمت کی۔ پاکستان کی سرحد عبور کر لینے کے بعد بھی ان کا یہ جذبہ شعلۂ جوالہ بنا رہا۔ یہاں تک کہ وہ خود تاریخِ پاکستان کا ایک محترم کردار بن گئے۔

پاکستان میں امن و عافیت کے ماحول میں بھی انہوں نے ان شہیدوں کو فراموش نہیں کیا جنہوں نے اس وطنِ پاک اور اس کے پیچھے متحرک نظریہ کی اپنے خون سے آبیاری کی۔ انہوں نے ایک ایک شہید اور ایک ایک غازی کا نام لے کر یہ خونچکاں داستان رقم کی ہے۔ اتنے شہیدوں اور غازیوں کے نام اور کارنامے رقم کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ واقعات کی صحت کو برقرار رکھنا اس سے بھی دشوار تھا اور ان تاریخی مقامات اور تاریخی کرداروں کی تصاویر جمع کرنا سب سے بڑھ کر مشکل تھا۔ لیکن خواجہ افتخار نے ایک جنون اور ایک جذبہ کے زیرِ اثر یہ تمام ہفت خواں طے کر لئے۔ اب یہ سب کچھ "جب امرتسر جل رہا تھا" کے نام سے ہمارے سامنے ہے۔ خواجہ افتخار نے تحریکِ پاکستان کے اس باب کو جس انداز میں قلمبند کیا ہے اس کے لئے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ یہ کتاب اس لائق ہے کہ ہر پاکستانی کے زیرِ مطالعہ رہے۔

(تحریر: جناب خالد محمود)

امروز

۲۹ ستمبر ۱۹۸۰ء

تحریکِ پاکستان پر سماجی، معاشرتی اور سیاسی حوالوں سے تو بہت کچھ لکھا گیا ہے مگر ادب کا خانہ تقریباً خالی ہے۔ ابتداء میں کچھ اہلِ قلم نے اسے موضوع بنایا مگر کچھ ترقی پسندوں نے شدید ردِ عمل ظاہر کیا۔ انہوں نے تقسیم کو غلط کہا اور اس سلسلے میں کسی قسم کے بھی مثبت اظہار کو رجعت پسندی کا نام دیا۔ عصمت چغتائی نے تو محمد حسن عسکری اور ایم۔ اسلم کا نام لے لے کر لتے لئے۔ عصمت چغتائی کے قبیل کے کچھ لوگ ممکن ہے اب حُبِّ وطن کا چولا پہن چکے ہوں اور بقول جمیل الدین عالی

ع وقت کی لے بدلی تو عالی نئے ترانے لائے

وہ اب کوئی سا ترانہ بھی گائیں، کوئی راگ الاپیں، مگر تاریخ جھوٹ نہیں کہتی اور ابھی کچھ لوگ

ایسے موجود ہیں جو ان لمحوں کو ریکارڈ کرنے جا رہے ہیں۔ ان جذبوں کو زینتِ قرطاس بنایا ہے ہیں کہ اس سے بے شمار لوگوں کے چہرے بھی نکھریں گے اور حقیقتیں بھی واضح ہو کر سامنے آتی رہیں گی۔

"جب امرتسر جل رہا تھا" ایک ایسی ہی کوشش ہے۔ اگرچہ اس پورے برصغیر میں ہر گاؤں، ہر قصبہ اور ہر شہر اسلام کا قلعہ اور پاکستان کا محافظ و داعی بنا ہوا تھا مگر واقعتاً کچھ شہروں کچھ علاقوں نے قربانیوں اور جاں سپاریوں کی روشن مثالیں قائم کر دیں۔ انہی میں امرتسر بھی پیش پیش تھا۔ اس شہر کے بہادر، جی دار اور جیالے باسیوں کی کہانیاں اکثر لکھی جاتی رہی ہیں مگر یہ ایک ایسی داستان ہے جس کا شاید کوئی اختتام نہ ہو۔ اے حمید نے امرتسر کی پرتیں الٹی تھیں، اب خواجہ افتخار نے اسے تی جلا دی ہے۔ یقیناً یہ کتاب خاکہ نگاری کی ذیل میں بھی آئے گی، ادب پارہ بھی کہلائے گی اور تاریخ کا ایک حصہ بھی قرار پائے گی۔

(تحریر: جناب اظہر جاوید)

ہفت روزہ **چٹان** لاہور

۱۷ نومبر ۱۹۸۰ء

خواجہ افتخار تحریکِ پاکستان کے کارکن اور اہلِ قلم کی حیثیت سے محتاجِ تعارف نہیں ہیں۔ مشرقی پنجاب خصوصاً امرتسر کے مسلمانوں پر ۱۹۴۷ء میں جو قیامت ٹوٹی اس پر اگر کسی نے تسلسل و تواتر کے ساتھ لکھا ہے تو وہ خواجہ افتخار ہیں، زیرِ نظر کتاب میں خواجہ صاحب کے وہ مضامین بھی شامل ہیں جو پہلے اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں لیکن اس میں بہت سی ایسی باتیں بھی ہیں جو پہلے منظرِ عام پر نہیں آئیں مضامین میں خوبصورت اضافہ کر کے ان کو ایسی ترتیب کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ پوری کتاب ایک ایسی داستانِ مسلسل بن گئی ہے جو بہت سی الگ الگ داستانوں کا مجموعہ ہے اور جو بہت سے کرداروں کے گرد گھومتی ہے۔

اس کتاب کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ اس کے مندرجات صحافتی معروضیت کے حامل

میں مختلف واقعات، تاریخوں، اوقات اور ناموں کی صحت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ کہیں حاشیہ آرائی یا داستان طرازی نہیں کی گئی۔ ہر بات عام فہم اور سیدھے سادھے انداز میں بیان کر دی گئی ہے۔ اس وقت افراد قوم میں وہی جذبہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے جو تحریک پاکستان کے دوران مسلمانوں میں موجود تھا۔ اس مقصد کی تکمیل کا ایک مؤثر طریقہ تو یہ ہے کہ ہر پاکستانی کو یہ بتایا جائے کہ مسلمانوں نے پاکستان حاصل کرنے کے لئے کیا قربانیاں دی تھیں وہ آگ اور خون کے کتنے دریاؤں سے گزرے تھے کتنی عصمتوں اور کتنی جانوں کی قربانی دی تھی جب امرتسر جل رہا تھا پاکستانی قارئین کو وہ سب کچھ بتاتی ہے جو اسے معلوم ہونا چاہیئے۔

(تحریر: جناب مسکین حجازی)

۱۹ اکتوبر ۱۹۸۰ء

تحریک پاکستان کے حساس و ذی شعور کارکن خواجہ افتخار کی زیر نظر مصوّر و منقش تالیف ۱۹۴۷ء کے اس امرتسر کی کہانی ہے۔ تقسیم ہند کا اعلان ہوتے ہی تعصّب و بربریت کے ماتوں نے جس کے چاروں طرف گھیرا ڈال لیا تھا۔

خواجہ افتخار نے آگ اور خون کی یہ ہولی دیکھتی آنکھوں سے دیکھی اور جب اُس کے ہولناک نظارے ۳۲ سال گزر جانے پر بھی قلب و ذہن سے محو نہ ہونے پاتے تو اسے بغیر رنگ آمیزی، حاشیہ آرائی اور تخیلاتی تزئین کے من و عن اہل وطن و اہل نظر کے سامنے رکھ دیا۔

اللہ کرے خواجہ صاحب کی یہ تالیف قبولیت عامہ کا اعزاز پائے اور یہ حقیقت ہر پاکستانی کے ذہن نشین ہو جائے کہ ان کے بزرگوں نے اس مملکت پاک کے لئے کس طرح پروانہ وار جانوں، سروں، عزتوں اور عصمتوں کے صدقے اتارے تھے اور اب ان پر اس کے تحفظ و استحکام کی کہاں تک ذمہ داری ہے۔

(تحریر: جناب ثاقب زیروی)

ماہنامہ فیض الاسلام راولپنڈی
مارچ ۱۹۸۱ء

توبہ توبہ..... اُف اُف..... ہائے ہائے.....کوئی کمزور دل والا مرد و عورت اس کو ہرگز نہ پڑھے۔ ورنہ حرکت قلب بند ہو جانے کا خطرہ ہے۔ تاریخ بلکہ قبل تاریخ کے دور وحشت میں اور جنگل کے درندوں، سانپوں، بچھوؤں، بھیڑیوں وغیرہ میں بھی مسلمانوں پر سکھوں کے بے پناہ مظالم کی مثال نہیں ملتی۔ زمین و آسمان کا مالک تو اپنی معصوم مخلوق، بچوں، بوڑھوں اور عورتوں پر ناقابل بیان مظالم دیکھتا اور مہلت دیتا رہا۔ اس تعالیٰ کی حکمتوں پر کون حادی ہو سکتا ہے۔ اس پر وحشت، درندگی اور بربریت کے الفاظ سخت ناکافی ہیں۔ مروجہ زبانوں کی لغات اس کی تصویر کشی سے قاصر ہیں۔ آج سے سینکڑوں، ہزاروں سال بعد اگر انسان کبھی صحیح انسان بن گیا تو ایسی کتابوں کو دیکھ کر حیران رہ جائیگا کہ بیسویں صدی کے انسان بھی انسان کہلاتے تھے۔

اس پر تبصرہ کیا کیا جاتے؟ اشد ضرورت ہے کہ یہ کتاب ہر پڑھے لکھے اور اَن پڑھ پاکستانی تک پہنچ جاتے۔ خواجہ افتخار نے ایک "فرض کفایہ" ادا کیا ہے۔

راقم نے کئی برس قبل "عبرت سر" کے عنوان سے موجودہ امرتسر کا نقشہ کھینچا تھا جو "امروز" لاہور میں شائع ہوا تھا۔ انہی دنوں منشی غلام قادر فرخ امرتسری مرحوم نے "خون کی ہولی" کے نام سے ایک کتابچہ اسی موضوع پر لکھا تھا۔ لیکن یہ کتاب آج تک کی لکھی ہوئی سب تحریروں پر حادی ہے۔ خواجہ افتخار نے بہت کٹھن کام انجام دیا ہے اور اس کے مندرجات فراہم کرنے میں سخت محنت کی ہے۔ تاریخ کے طلبا ہمیشہ ان کے ممنون و مشکور رہیں گے۔ حیرت انگیز امر یہ ہے کہ اس ہنگامۂ قیامت کے ہر ہر حادثہ، سنگین حالات اور متعلقہ افراد کے بیسیوں فوٹو کیسے فراہم کر لئے!

(تحریر: محترم علامہ عرشی

متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ اچھوتوں جیسا سلوک ہوتا تھا
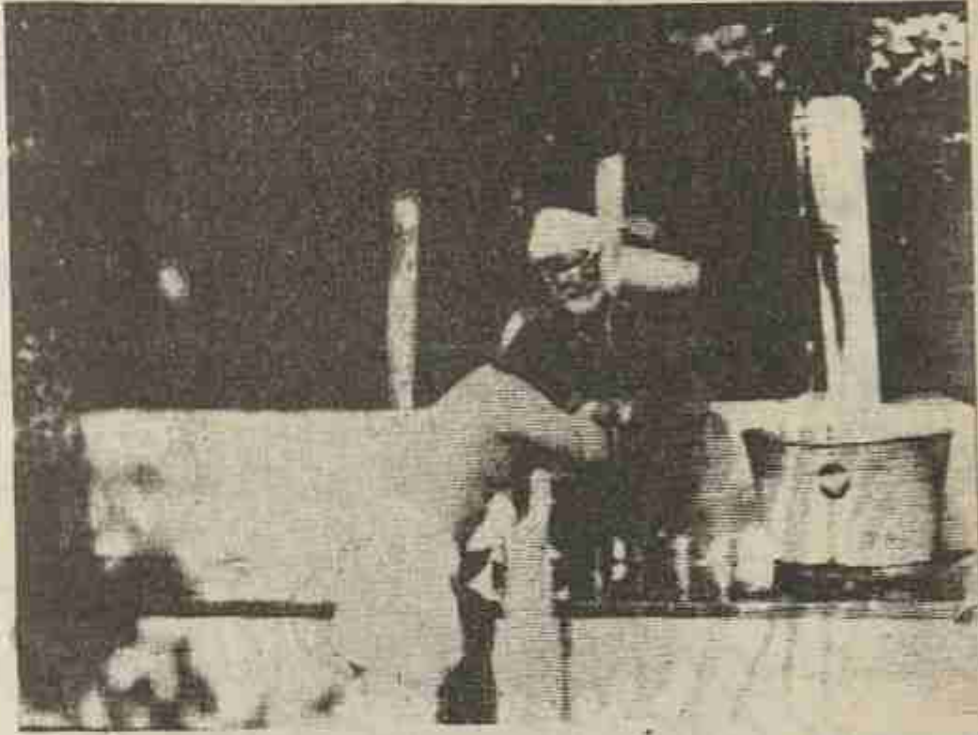
کمپنی باغ کی ٹھنڈی کھوئی پر (اوپر) ایک مسلمان بچے کو اوک میں پانی پلایا جارہا ہے اس کے برعکس (نیچے) ایک ہندو کے لئے گلاس میں پانی ڈالا جارہا ہے۔

پیش لفظ

اے۔ حمید

امرتسر کی سیاسی تحریکوں، خاص طور پر قیام پاکستان کی جدوجہد کے بارے میں خواجہ افتخار صاحب کے مضامین کا سلسلہ جب "نوائے وقت" میں چھپنا شروع ہوا تو میں نے اسے بڑے ذوق و شوق سے پڑھا۔ اس لئے نہیں کہ ان مضامین میں سیاسی تحریکوں کا ذکر تھا بلکہ اس لئے کہ ان میں امرتسر کا ذکر تھا۔ امرتسر کا تو کوئی نام لیتا ہے تو میں چلتے چلتے رُک جاتا ہوں۔ اس خیال سے کہ شاید یہ شخص امرتسر کا پھر نام لے بھلا میں امرتسر پہ لکھے ہوئے مضامین کیسے نہ پڑھتا۔ ہاں اتنا ضرور کرتا کہ لوگوں کے نام اور ان کے کارناموں کے ساتھ ساتھ امرتسر کے گلی کوچوں اور بازاروں کے نام بھی بار بار پڑھتا کیونکہ یہ سارے نام میرے دل پر لکھے ہوئے ہیں۔

میں خواجہ افتخار صاحب کا ممنون ہوں کہ انہوں نے اپنی کتاب کا دیباچہ لکھنے کے لئے مجھے پسند فرمایا۔ یہ ان کی ذرہ نوازی ہے ورنہ میں نے ان سے یہی کہا تھا کہ میں آپ کی کتاب کا پیش لفظ لکھتے نہیں سجتا کیونکہ میں دیباچہ نویسی کے آداب سے ناواقف ہوں۔ لیکن انہوں نے بڑے پیار سے اصرار کیا اور میں ان کے پاس خاطر کے لئے یہ چند سطریں قلمبند کر رہا ہوں۔

بات یہ ہے کہ امرتسر میرے لئے میرا بچھڑا ہوا یروشلم ہے اور میں اس کی دیوارِ گریہ ہوں۔ مجھے امرتسر کا کچھ بھی یاد نہیں آتا۔ یاد تو اُسے آتے جو بھُول گیا ہو۔ امرتسر تو میرے خُون میں گردش کر رہا ہے۔ امرتسر کو دیکھ کر سوتا ہوں اور صبح اٹھ کر سب سے پہلے اسی کا منہ دیکھتا ہوں۔ چلتا ہوں تو کمپنی باغ میرے ساتھ ہوتا ہے۔ بیٹھتا ہوں تو سکنری باغ کے درخت مجھ پر سایہ کئے ہوتے ہیں۔ بولتا ہوں تو مجھے امرتسر کی مسجدُوں کی اذانیں سنائی دیتی ہیں۔ خاموش ہوتا ہوں تو امرتسر کی نہروں کا پانی میرے کانوں کے قریب سے سرگوشیاں کرتے ہوتے گزرتا ہے۔ اپنے ایک ہاتھ کو دیکھتا ہوں تو اُس پر سرد راتوں میں اپنے محلے کی گلیاں خوابیدہ دکھائی دیتی ہیں۔ اپنے دوسرے ہاتھ کو دیکھتا ہوں تو اس پر کمپنی باغ کے سارے پھُول، سارے درخت بہار کی ہوا میں مسکراتے نظر آتے ہیں۔ پچھلے دنوں ایک دوست امرتسر جانے لگے تو مجھ سے بھی پوچھا کہ تمہارے لئے امرتسر سے کیا لاؤں؟ میں نے کہا۔ میرے لئے کمپنی باغ کا ایک پھُول لے آنا۔ واپس آ کر اس نے مجھے سرخ رنگ کا سنبل کا پھول دیا۔ مجھے معلوم ہے کمپنی باغ میں سُنبل کے درخت کس جگہ پر ہوا کرتے تھے۔ میں پھول کو کچھ دیر دیکھتا رہا۔ وہ پھُول بھی مجھے دیکھتا رہا۔ نہ اس نے کوئی بات کی۔ نہ میں نے کوئی بات کی۔ حالانکہ پہلے ہم بڑی باتیں کیا کرتے تھے۔

میں نے اس پھُول کو سفید کاغذ میں لپیٹ کر رکھ لیا۔ کچھ دنوں بعد آدھی رات کو اٹھ کر دیکھا تو پھُول مُرجھا کر خشک ہو چکا تھا اور سفید کاغذ پر ایک سیاہ داغ پڑ گیا تھا۔

ایسا ہی ایک داغ امرتسر نے مجھے بھی دیا ہے۔ میں نے اس داغ کو اپنے دل کے ساتھ لگا کر رکھا ہے۔ ایک دن وقت میری خاک اڑا دے گا۔ پھر یہ داغ میری خاک کے ساتھ اڑتا ہوا امرتسر کے کمپنی باغ میں پہنچے گا اور اس درخت سے جا کر مل جائے گا جس کا یہ کبھی پھُول ہوا کرتا تھا۔

میں تو ایک افسانہ نگار ہوں۔ پھولوں، خوشبوؤں اور محبتوں کا افسانہ نگار۔ نہروں، باغوں، سنہری صبحوں، سرمئی شاموں، جھلملاتی تاروں بھری راتوں، موسلا دھار بارشوں میں بھیگتے درختوں اور کمپنی باغ کی نہروں میں تیرتے گلاب کے پھولوں کے شہر کا بیٹا ہوں۔ میں دیباچہ کیا لکھوں گا۔ بس افسانہ لکھ رہا ہوں۔ اُن محبتوں کا مرثیہ لکھ رہا ہوں جو کمپنی باغ کے سرسبز اندھیروں میں ہمیشہ کے لئے سو گئیں۔ میں بھی اپنی گمشدہ محبتوں کے ساتھ ہی ہمیشہ کے لئے محوِ خواب ہوں۔

میرا شہر میرے سامنے ایک دروازہ کھولتا ہے اور ایک دیوار کھڑی کرتا ہے۔ دروازہ گمشدہ جنت کا ہے اور دیوار گریہ کی ہے۔ دُور — اپنی محبتوں کی جنت کو دیکھتا ہوں اور دیوار کے ساتھ لگ کر آنسو بہاتا ہوں۔

یہ سطریں لکھ رہا ہوں اور ہوا مجھے امرتسر میں اڑاتے لئے پھر رہی ہے۔ ایک جھونکا مجھے الیگزنڈرا پارک کی اُن جھاڑیوں کے پاس لے جاتا ہے جہاں رویل کے سفید پھول کھلا کرتے تھے۔ دوسرا جھونکا مجھے اٹھا کر کمپنی باغ کے اُس پلاٹ میں لے جاتا ہے جہاں سردیوں میں گلِ داؤدی کی نمائش لگا کرتی تھی اور میں سخت سردی میں مُنہ اندھیرے باغ میں آ کر گلِ داؤدی کے ٹھنڈے شبنمی پھولوں پر اپنی آنکھیں رکھ دیا کرتا تھا۔ ہوا کا ایک اور جھونکا آیا اور میں بھاتیاں والے باغ میں درخت پر چڑھا کچے امرود توڑ کر کھا رہا ہوں۔ اور اب میں لوکاٹ کے باغوں کے بیچ سے گزر کر ریلوے لائن کو جانے والی چھوٹی سی پگڈنڈی سے گزر رہا ہوں۔ ابھی صبح نہیں ہوئی اور میں روز کی طرح گھر سے سیر کو نکل آیا ہوں۔ اس پگڈنڈی پر گھنے کی جھاڑیوں نے سایہ ڈال رکھا ہے۔ ان جھاڑیوں میں سفید کلیاں پچھلے پہر کے اندھیرے میں تاروں کی طرح کھلی ہیں۔ سارا راستہ خوشبو سے بھرا ہوا ہے۔ جی چاہتا ہے اس راستے کو ایک ہی سانس میں عبور کر لوں۔ ساری خوشبو کو ایک ہی سانس میں اپنی روح میں سمو لوں۔ سانس

اوپر کھینچتا ہوں۔ سانس ختم ہو جاتا ہے۔ جی چاہتا ہے مر جاؤں مگر اس خوشبو کو اپنے اندر سے باہر نہ آنے دوں۔ جلدی سے سانس باہر پھینکتا ہوں اور پھر ایک گہرا اور لمبا خوشبو بھرا سانس لیتا ہوں۔ کاش میری ساری زندگی اس ایک سانس میں ہی گزر جاتی۔ پھر پڑہ کلب کے پہلو میں بہتی ہوئی چھوٹی سی ندی کو دیکھتا ہوں۔ اس پر آم کے درختوں کا سایہ ہے۔ منہ اندھیرے یہاں ایک خوشبو پھیلی ہوتی ہے۔ یہ کسی پھول کی خوشبو نہیں ہے۔ یہ شاید نہر کی خوشبو ہے۔ کمپنی باغ کی نہر کی خوشبو جس میں آم کے درختوں سے ٹپکنے والا میٹھا شہد بھی سانس لے رہا ہے۔ یہ خوشبو آج بھی میرے پاس ہے۔ میرے ساتھ سانس لیتی ہے۔

پھر ہوا کا ایک جھونکا مجھے کمپنی باغ کے ایک درخت کے پاس لے جاتا ہے۔ یہ ناشپاتی کا درخت ہے۔ بہار میں یہ درخت گلابی رنگ کی پنکھڑیوں والے پھولوں سے بھر جاتا ہے۔ یہ سیب کا درخت نہیں تھا مگر نہ جانے کیوں اسے دیکھ کر مجھے ہمیشہ گالزوردی کے " AN APPLE TREE " کا خیال آجاتا۔ اس ناول کی اداس خاموش نیلی آنکھوں والی ہیروئن میگن کا خیال آجاتا۔ میں اس نیلی آنکھوں والی اداس لڑکی کو آج بھی کمپنی باغ کے اس درخت کے نیچے بیٹھی دیکھ رہا ہوں۔ ہوا چلتی ہے تو کوئی گلابی شگوفہ اپنی ٹہنی سے ٹوٹ کر اس کی جھولی میں آن گرتا ہے۔ وہ اداس چہرہ اوپر اٹھا کر خاموش جھیل ایسی نیلی آنکھوں سے درخت کو دیکھتی ہے۔

میرا اداس چہرہ بھی کمپنی باغ کے اس گلابی شگوفوں والے درخت کی طرف ہے۔

دیباچہ کیا لکھ رہا ہوں۔ بس کتاب کے صفحوں پر کمپنی باغ سے اٹھاتے ہوئے باسی پھول رکھتا جا رہا ہوں۔ جو باسی پھولوں کی تحریر پڑھ لیتا ہے وہ اسے بھی پڑھ لے گا۔ جو اداس خوشبو کی زبان سمجھتا ہے وہ اسے بھی سمجھ لے گا۔ اس کے سوا میرے پاس اور کیا ہے۔ اس کے سوا اس دنیا میں اور ہے ہی کیا؟

میں تو کمپنی باغ کے درخت سے ٹوٹا ہوا پتا ہوں، ہوا مجھے اڑاتے لیے پھر رہی ہے اور پھر جب امرتسر میں آگ لگی۔ کمپنی باغ کے درختوں کی چھاؤں دہک اٹھی اور کلکتہ کو جاتی ریلوے لائن پر مسلمانوں کی کٹی ہوئی لاشیں بکھر گئیں تو کمپنی باغ کا یہ ادھ جلا خزاں نصیب پتا خون رنگ ہواؤں کے ساتھ لاہور کے باغِ جناح کی ٹھنڈی چھاؤں میں آن گرا۔ کمپنی باغ نے بے وفائی کی لیکن باغِ جناح کی ٹھنڈی مٹی میں اس پتے کی از سرِ نو آبیاری ہوئی اور اس نے زمین میں جڑ پکڑ لی۔ یہ ایک نیا باغ تھا۔ نئی ہوائیں اور نئی خوشبوئیں تھیں۔ اور پھر ایک روز یہ پتا اڑ کر امرتسر کے کمپنی باغ میں گیا۔ مگر نہ وہ کسی درخت کو پہچان سکا نہ کسی نے اسے پہچانا۔ وہ ہم صفیر بھی نہ تھے۔ وہ باغ بھی نہ رہا تھا۔

میرا امرتسر ان لوگوں سے زندہ تھا جو میرے ساتھ وہاں رہتے تھے۔ کاکا عمدہ تھا۔ اسد جو تھا، صوفی غلام محمد ترک، غلام محمد بٹ، سیف الدین سیف، سعادت حسن منٹو، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، ساغر صدیقی، احمد راہی، جانی ٹال والا، حکیم طغرائی، علامہ محمد عالم آسی، غلام محمد ترنم، علامہ عرشی، حکیم محمد موسیٰ امرتسری، چاچا جیلے اور گاما قلفی اور شہابیہ فالودے والا تھا۔ اور ہزاروں لاکھوں ستارے تھے جن سے امرتسر کا آسمان روشن تھا۔ ہال بازار، کٹڑہ سفید، چوک فرید، کٹڑہ مہان سنگھ، سکتری باغ اور کمپنی باغ ویران تھا۔ وہاں مسلمانوں کے کلچر اور ثقافت کے نقش پا بھی نہیں تھے۔ مسجدیں مرثیہ خواں تھیں۔ کشمیریوں کی بیٹھکوں میں ہندو عورتیں گوبر کا لیپ کر رہی تھیں۔ کمپنی باغ سے بچھڑا ہوا پتا واپس اڑتا باغِ جناح کے شگفتہ گلاب کے پھولوں کے پاس آ گیا۔

امرتسر مر چکا تھا اور اس کی لاش کمپنی باغ میں دفن تھی۔ لیکن امرتسر کی لاشیں تو خدا جانے واہگہ بارڈر تک کہاں کہاں دفن ہیں۔ اب ان قبروں کے نشان بھی کہیں نہیں ملتے۔ یہ ان ہی شہیدوں کی مٹی ہے جس کی خوشبو ہمیں پاکستان کے گلاب کے پھولوں میں

اور جس کی روشنی ہمیں پاکستان کے طلوع ہوتے سورج میں ملتی ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جو ایک ان دیکھے وطن کی خاطر امرتسر کے گلی کوچوں میں شہید ہو گئے اور جن کی لاشیں گندے جوہڑوں میں پھینک دی گئیں۔ صرف اس لئے کہ انہوں نے کمپنی باغ کی ٹھنڈی کھوئی پر جانوروں کی طرح پانی پینا گوارا نہ کیا۔ صرف اس لئے کہ انہوں نے اپنی عزتِ نفس کا سودا نہ کیا۔ ایک خدا، ایک رسولؐ اور ایک قرآن ان کی منزل تھی اور جب وہ اس منزل پر پہنچے تو ان کے چہرے خاک آلود تھے اور پاؤں اپنے عزیزوں، بھائیوں، بہنوں، بیٹوں اور ماؤں کے خون میں ڈوبے ہوتے تھے۔ توحید کی تاریخ ہمیشہ خون سے رقم ہوتی ہے۔

خواجہ افتخار امرتسر کے شہیدوں کو نہیں بھولے۔ ایسے شہیدوں کو بھول جانے والی قومیں خود بھلا دی جاتی ہیں۔ کیونکہ ان شہیدوں نے وحدت کے ان زندہ و پائندہ اصولوں کی خاطر اپنی جانیں قربان کیں جس کے تحرک سے اس کائناتِ واحدہ کا نظام متحرک ہے اور جس کی بنیادوں پر استوار ہو کر ہی ایک معاشرہ اس کائنات میں اپنا مثبت کردار ادا کر سکتا ہے اور ارتقاء کے عملِ مسلسل کا ساتھ دے سکتا ہے۔

امرتسر ایک دل گرفتہ مگر تابناک یاد بن کر میری رگ و پے میں زندہ ہے اور میں اسے ہمیشہ زندہ رکھنا چاہتا ہوں۔ اس لئے کہ یہی وہ انمول یاد ہے جو مجھے یہ احساس دلاتی ہے کہ ہم نے کتنی عظیم قربانیاں دے کر اپنا نیا وطن پاکستان حاصل کیا ہے جو اب ہماری عزت و ناموس کا ضامن ہے اور جس کی عزت و ناموس کے ہم ضامن ہیں۔ اگر یہ عزتِ نفس نہیں تو پھر گلاب کے پھول اور سیب کے شگوفے بھی نہیں۔ اگر عزتِ نفس ہے تو پھر لاہور کی خاک کے ہر ذرّے میں گلابوں کی مہک اور موتیے کی خوشبو ہے۔

عزتِ نفس سے ہی تکریمِ بنی آدم ہے۔ عزتِ نفس سے ہی توحید ہے۔ اسلام ہے اور انسانیت ہے۔

امرتسر کو میں مرتے دم تک نہیں بھول سکتا۔ کیونکہ اس کے کمپنی باغ میں میرے بچوں، بھائیوں، بہنوں اور ماؤں کے خون کے چھینٹے دفن ہیں۔ اس کی مسجدوں کی خاک میں میرے آباؤ اجداد کے سجدوں کے نشان پوشیدہ ہیں۔ اور اس کے گلی کوچوں میں شہیدوں کے خون کی لالی بکھری ہوئی ہے۔

ہسپانیہ تو خونِ مسلماں کا امیں ہے
مانندِ حرمِ پاک ہے تو میری نظر میں
پوشیدہ تری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں
خاموش اذانیں ہیں تری بادِ سحر میں

اے۔ حمید
۴۵۴۔ این۔ راہِ چمن، سمن آباد۔ لاہور

کیا خبر کھا گئی نظر کس کی ، تیرے باغوں تری بہاروں کو

کمپنی باغ کی ٹھنڈی کھوئی جہاں تقسیم سے قبل مسلمانوں کو جانوروں کی طرح پانی پلایا جاتا تھا
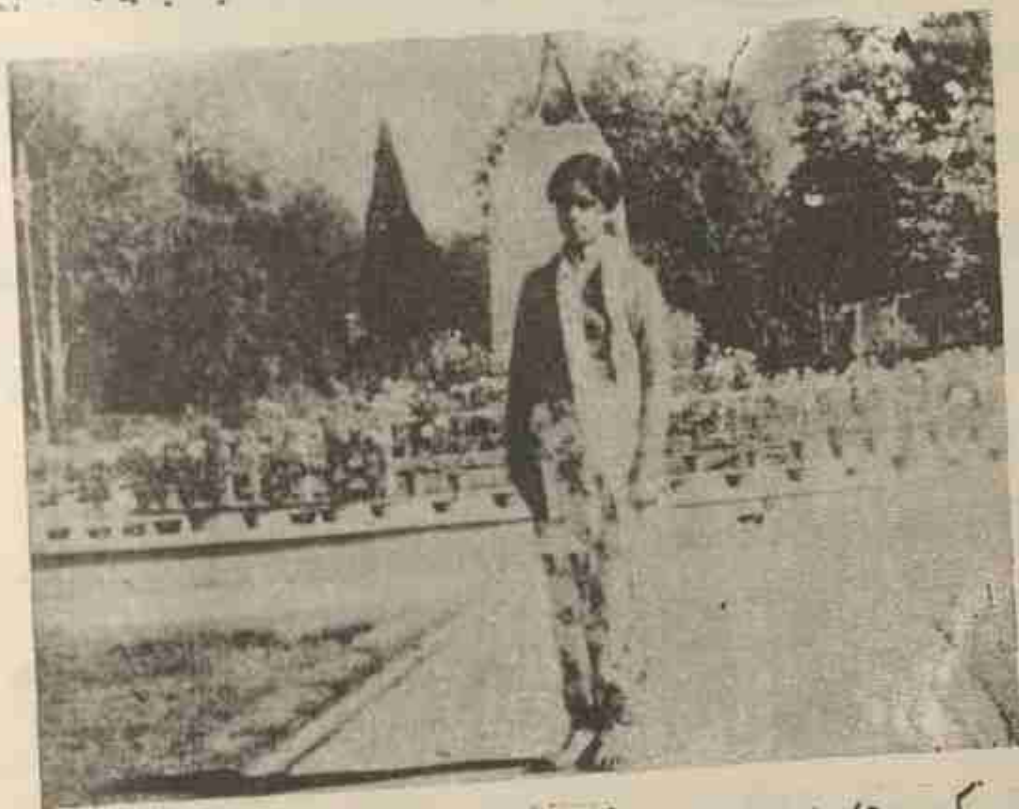
کمپنی باغ کے ایک خوبصورت گوشے میں گلِ داؤدی کی نمائش کا منظر

ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا
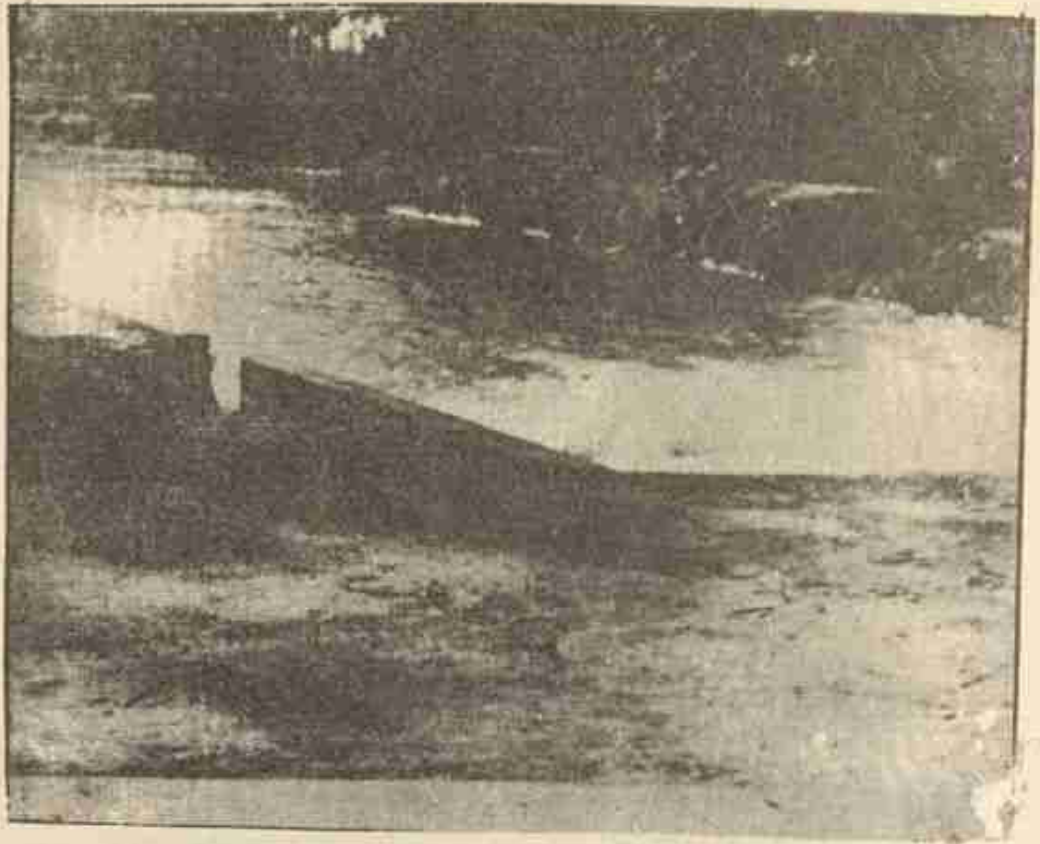
امرتسر کی جنڈیالہ والی نہر کی ٹھوکر جس کے کناروں کے آس پاس اناروں کے درخت عجب بہار دیتے تھے۔

نہر کا عقبی حصہ جہاں آم کے درختوں کے سائے میں زندہ دلانِ امرتسر پکنک منایا کرتے تھے۔

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

عرضِ مصنّف

یوں تو غیر منقسم ہندوستان کا کوئی شہر، ضلع، گاؤں، قصبہ اور گلی کوچہ ایسا نہیں جس کے شیر دل مسلمانوں نے حصولِ پاکستان کی جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصّہ نہ لیا ہو۔ لیکن امرتسر کے سرفروش اور کفن بردوش مسلمانوں نے اس تحریک کو جس دلاوری سے چلایا اور اپنی جان، مال اور آبرو کی قربانیاں دے کر مختصر سے وقت میں پاکستان کی منزل کو قریب سے قریب تر کیا وہ تاریخ کے صفحات میں سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

پاکستان کو معرضِ وجود میں آتے ہوتے ۳۳ برس کا طویل عرصہ گزرنے کے باوجود زیرِ نظر کتاب کے بیشتر کردار خدا کے فضل و کرم سے آج بھی زندہ ہیں اور وہ نسل بوڑھی ہوتی جا رہی ہے جس نے تحریکِ پاکستان کو نہ صرف بچشمِ خود دیکھا تھا بلکہ اس میں دامے درمے، قدمے، سخنے حصّہ بھی لیا تھا۔ چنانچہ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا ہے ہماری قوم کے حافظے اور دل و دماغ سے ان حالات و واقعات کی یادوں کے نقوش دھندلاتے جا رہے ہیں بلکہ نئی پود ان حالات سے بالکل ناواقف اور بے خبر ہے جن کے تحت پاکستان معرضِ وجود میں آیا تھا۔ ممکن ہے آنے والا کل ہمارے شاندار

ماضی کو فراموش کر دے اور ہماری قومی جدوجہد کا یہ زریں باب اور شیر دل مسلمانوں کے کارنامے ایک مفروضہ داستان بن کر رہ جائیں۔ لہٰذا اس عہد کے خونیں واقعات کو تاریخ کے حوالے کرنے، نئی نسل کو تحریک پاکستان کے مقاصد بتانے اور ہندوؤں سکھوں کے گھناؤنے عزائم سے آگاہ کرنے کے خیال سے یہ کتاب اہل وطن کے سامنے پیش کی جا رہی ہے۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میری یہ کوشش ابتدائی نوعیت کی ہے اور عین ممکن ہے جلتے ہوئے امرتسر کے کئی حادثے احاطۂ تحریر میں آنے سے رہ گئے ہوں۔ مجھے اُمید ہے ان سطور کے قارئین اس سلسلے میں میری رہنمائی فرمائیں گے اور اگر کوئی واقعہ کسی کے ذہن میں محفوظ ہے تو اُسے راقم الحروف تک پہنچا دیا جائے گا۔ اس طرح آئندہ ایڈیشن میں ضروری اضافہ ممکن ہو سکے گا۔

اس کتاب کا عنوان "جب امرتسر جل رہا تھا" اگرچہ ہندوستان کے حصہ میں دھکیل دئیے جانے والے صرف ایک شہر کے حالات و واقعات کی نشاندہی کرتا ہے لیکن اگر غور سے اس کے ہر ورق اور لفظ کو دیکھا اور پڑھا جائے تو یہ کتاب لرزہ خیز واقعات کا ایک ایسا آئینہ ایام ہے جس میں نہ صرف مشرقی پنجاب کے مسلمان مہاجرین پر گزرنے والی قیامت کے المناک مناظر بلکہ مطالبہ پاکستان کے جرم کی پاداش میں اُن پر عرصہ حیات تنگ کرنے والے خونخوار بھیڑیوں کے مکروہ چہرے بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

ایک وہ وقت تھا جب متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کی اقتصادی حالت سخت ابتر تھی اور ان کے ساتھ اچھوتوں جیسا برتاؤ ہوتا تھا۔ ٹرینوں اور بسوں وغیرہ میں سفر کے دوران اگر کوئی مسلمان کسی غیر مسلم ہمسفر سے چھو جاتا تھا تو وہ اپنے کپڑوں کو ناپاک تصور کرتے تھے۔ امرتسر کے کمپنی باغ کے قریب واقع ٹھنڈی کھوئی کی سبیل (جہاں ہندوؤں کا قبضہ تھا) ۱۹۴۷ء تک غیر مسلموں کو شیشے کے گلاسوں میں پانی پلایا جاتا تھا۔ لیکن جب کوئی پیاسا مسلمان ٹھنڈی کھوئی کے میٹھے اور ٹھنڈے پانی سے اپنی پیاس بجھانی چاہتا

تھا تو اس سبیل پر پانی پلانے والا ہندو اس مسلمان کی اوک میں پانی ڈالتے وقت کم از کم دو فٹ کی اونچائی سے پانی انڈیلتا تھا کہ کہیں پانی پلاتے وقت اس کے چھینٹے اس ہندو کے بدن یا قریب پڑے ہوتے شیشے کے گلاسوں پر نہ پڑ جائیں۔ علاوہ ازیں متحدہ ہندوستان کے تمام چھوٹے بڑے شہروں کی تجارتی منڈیوں پر غیر مسلموں کی اجارہ داری تھی۔ مسلمان یا تو ملازمت پیشہ تھے اور یا پھر معمولی قسم کے دکاندار۔

امرتسر، لاہور کے بعد متحدہ پنجاب کا سب سے بڑا شہر تھا مگر اتنے بڑے شہر میں مسلمانوں کے صرف دو تین گھرانے ایسے تھے جن کے پاس قدیم زمانے کی برائے نام دو تین کوٹھیاں یا کاریں تھیں جن کو دیکھ کر اگلے وقتوں کے کھنڈرات اور انگریزی کی مزاحیہ فلموں میں دکھائی جانے والی "دھکا سٹارٹ" گاڑیوں کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔

ممتاز مسلم لیگی لیڈر شیخ محمد صادق المعروف ٹھک صاحب (جو امرتسری مسلمانوں میں سب سے زیادہ رئیس تھے) کے پاس پرانی وضع کی ایک ایسی کار تھی جس کو عام طور پر سکول جانے والے بچے اور راہگیر دھکا لگاتے لگاتے عاجز آ جاتے تھے اور شیخ صاحب مرحوم، امرتسر کے اونچے پل، ہال گیٹ اور شہر کی دیگر شاہراہوں پر حسبِ عادت دائیں بائیں تھوکتے ہوتے اپنی جھنجھلاہٹ کا اظہار کرتے دکھائی دیتے تھے

علاوہ ازیں بسا اوقات راہگیروں کے مشاہدے میں اس قسم کے مناظر بھی آتے تھے کہ شیخ صاحب جب غصے میں آ کر اس گاڑی کو اپنے بھاری جوتے سے ٹھوکر مارتے تھے تو وہ گاڑی از خود سٹارٹ ہو جاتی تھی۔

قطع نظر اگر امرتسر کے مسلمان رؤسا کی یہ کیفیت تھی تو ہندوستان کے عام مسلمانوں کی حالتِ زار کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے جن کے گھروں میں غربت اور کسمپرسی نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ ہندو اکثریت قومی وسائل پر ان کا حق تسلیم کرنے کو تیار نہ تھی۔ ان کے معاشی حقوق کا انکار کیا جاتا تھا۔ ان کی معاشرتی اقدار کا مذاق اڑایا جاتا تھا اور ان کی

دینی جمیعت کو ختم کرنے کی سوچی سمجھی سازشیں کی جا رہی تھیں۔ ان سب حالات نے واضح کر دیا تھا کہ مسلمان، اس ملک میں اجنبی بنا دیئے گئے ہیں اور متحدہ ہندوستان میں ان کے لئے آزادی کا مطلب ہندو کی غلامی کے علاوہ کچھ اور نہیں ہو گا۔ اس لئے انہوں نے اپنے الگ وطن کے لئے سوچنا شروع کیا اور بالآخر حضرت قائد اعظمؒ کی ولولہ انگیز قیادت میں دو قومی نظریے کی بنیاد پر علیحدہ وطن کا مطالبہ کیا اور پاکستان کا مطلب کیا۔ لا الہ الا اللہ کا نعرہ بلند کرتے ہوتے مسلم لیگ کے پرچم تلے متحد ہو گئے۔ پاکستان کے دشمنوں نے مسلمانوں کو ایک ہوتے دیکھا تو انہوں نے مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے اور قیام پاکستان کی راہ میں روڑے اٹکانے کے لئے نہ صرف اپنی تجوریوں کے منہ کھول دیئے بلکہ نیشنلسٹ مسلمانوں کا تعاون حاصل کر کے پاکستان کے مطالبے کی مخالفت شروع کر دی۔ کسی نے اس مطالبے اور تصور کو مجذوب کی بڑ کہا اور کسی نے دیوانے کا خواب کہہ کر قائد اعظم کا بزعم خویش تمسخر اڑانا چاہا۔ جب اس طرح بات نہ بنی تو ان کے خلاف کفر کے فتوے صادر کرائے گئے۔ کبھی یہ کہا جاتا تھا کہ قائد اعظم کو نماز پڑھنی نہیں آتی۔ کبھی قائد اعظمؒ کی قابل اعتراض فرضی تصاویر شائع کر کے ان کے پاکیزہ تشخص کو مجروح کرنے کی مذموم کوششیں کی جاتی تھیں۔ جب کوئی بس نہ چلا تو قائد اعظم کی ذات گرامی پر بمبئی میں ایک بدبخت مسلمان کے ہاتھوں قاتلانہ حملہ بھی کرایا گیا۔

ماسٹر تارا سنگھ کہتا تھا کہ

پاکستان میری لاش پر بنے گا۔

اچاریہ کرپلانی کہتا تھا کہ

پاکستان کا خواب کبھی پورا نہیں ہو گا۔

مہاتما گاندھی کہتا تھا کہ

میں گئو ماتا (یعنی ہندوستان) کے ٹکڑے نہیں ہونے دوں گا۔

سردار پٹیل کہتا تھا کہ

ہندوستان اکھنڈ ہے اور اکھنڈ ہی رہے گا۔ پاکستان بن بھی گیا تو چند ماہ میں (نعوذ باللہ) اپنی موت آپ مر جائے گا۔

مگر قائدِ اعظمؒ نے اپنی محنت، دیانت، خلوص اور ذہانت سے دشمنانِ پاکستان کے تمام دعوے باطل کر کے رکھ دیئے اور پاکستان دُنیا کے نقشے پر ایک جیتی جاگتی حقیقت بن کر اُبھر آیا۔

جن نیشنلسٹ مُسلمانوں بالخصوص سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری، شیخ حسام الدین اور غازی عبدالرحمان وغیرہ نے پاکستان کے مطالبے کی بھرپور مخالفت کی تھی اور جو ہندوؤں سکھوں کے ساتھ مِل جُل کر رہنے میں مسلمانوں کی بھلائی پر یقین رکھتے تھے اور پاکستان کے مطالبے کی مخالفت میں اپنا زورِ بیان صرف کر رہے تھے۔ جب پاکستان معرضِ وجود میں آگیا تو انہی ہندوؤں سکھوں نے سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری، شیخ حسام الدین اور غازی عبدالرحمان (مرحومین) کا امرتسر میں جینا دوبھر کر دیا اور ہندوؤں سکھوں کے ساتھ مِل جُل کر رہنے کا درس دینے والے یہ تینوں بزرگ جس طرح ہندوؤں سکھوں سے اپنی جانیں بچا کر امرتسر سے بھاگ کر پاکستان آئے وہ ہندوؤں سکھوں کی مسلم دشمنی کی مُنہ بولتی تصویر ہے۔

کاش ہمارے نیشنلسٹ مسلمان جنہوں نے بلاشبہ انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کے سلسلہ میں بے شمار قربانیاں دی تھیں۔ اس وقت قائدِ اعظمؒ کی آواز پر لبیک کہہ دیتے تو ہندوستان بالخصوص پنجاب کی غیر منصفانہ تقسیم میں ریڈ کلف اور ماؤنٹ بیٹن کو مسلمانوں کے ساتھ وہ زیادتیاں کرنے کی جرأت نہ ہوتی جس کا مظاہرہ باؤنڈری کمیشن کے فیصلوں کے اعلان کے موقع پر کیا گیا۔ بہر حال بات امرتسر کی ہو رہی تھی۔ یہ وہ شہر تھا جو سیاسی، ادبی، ثقافتی اور مذہبی تحریکوں کا مرکز تھا۔ ۱۹۱۹ء میں جنرل ڈائر نے جب جلیانوالہ باغ

میں سٹین گنوں اور برین گنوں کے دہانے کھولے تو اس موقع پر اسلامیانِ امرتسر نے سینے تان کر جس بہادری سے شہادت کے جام نوش کئے اس کے نقوش آج بھی اس باغ کے در و دیوار پر ثبت ہیں اور تاریخ کے صفحات میں چاند تاروں کی طرح جھلملا رہے ہیں۔ بعدازاں جب حصولِ پاکستان کی جدوجہد شروع ہوئی تو اس قومی تحریک میں بھی اس شہر کے مسلمانوں نے تاریخی کردار ادا کیا۔ قدرت نے جہاں اس شہر کے پانی کو بے مثال شیرینی عطا کی تھی وہاں اسے خوبصورت نہروں، بل کھاتی ندیوں، ہرے بھرے درختوں، لذیذ پھلوں اور حسین پھولوں سے اس طرح سنوارا تھا کہ اس کے حسن و جمال سے متاثر ہو کر ممتاز صحافی آغا شورش کاشمیری مرحوم نے تقسیم برصغیر سے قبل اپنی اسیری کے ایام کے دوران اپنے صحافی دوست عبداللہ ملک کو ایک خط لکھا تھا جس میں تاکید کی تھی کہ

"جب امرتسر جاؤ تو وہاں کی شگفتہ راہوں اور جوان گلیوں کو میرا سلام کہنا۔"

گرمیوں کے دنوں اور برسات کی رُت میں اس شہر کی چھوٹی بڑی نہروں اور باغیچوں میں میلے ٹھیلے کا سماں ہوتا تھا جہاں زندہ دلانِ امرتسر آموں کے ٹوکرے، قیمے کے نان اور گرما گرم پکوڑوں کی لذّت سے اپنے کام و دہن کو آشنا کرتے تھے۔

سردیوں کا موسم آتا تو امرتسر کے قہوہ خانے شاعروں، ادیبوں اور سیاسی کارکنوں سے آباد ہو جاتے اور رات گئے تک لوگ موسم کی دلکشی سے لطف اندوز ہوتے۔ گھروں میں ہریسے اور سبز چائے کے دَور چلتے۔ بڑے بوڑھے اپنے معصوم بچّوں کو امرتسر کی مشہور چڑیل میاں پوتڑو سے لے کر بھوتوں اور پریوں کی کہانیاں سناتے۔ بہار کا موسم آتا تو رنگ برنگے پھولوں کی خوشبو سے سارا شہر مہک اُٹھتا۔

افسوس ــ گورداسپور کی طرح مسلم اکثریت کا یہ سرسبز و شاداب علاقہ بھی انگریزوں کی غلط بخشی کی نذر ہو گیا۔ لیکن اس شہر کے بہادر مسلمانوں نے ۴ مارچ ۱۹۴۷ء میں شروع ہونے والے فرقہ وارانہ فساد سے لے کر ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء تک کے عرصہ میں وہاں کے

ہندوؤں سکھوں کو جس طرح ناک چنے چبوائے وہ اس کتاب کے مطالعہ سے قارئین کرام پر اچھی طرح واضح ہو جائے گا۔

امرتسر کے ہندوؤں سکھوں نے جب مسلمانوں کو ہر مقابلہ میں فتح و نصرت حاصل کرتے دیکھا تو انہوں نے ریاستی غنڈوں اور بھارتی فوجیوں کی کمک حاصل کرلی جس کے نتیجے کے طور پر امرتسر کے نہتے مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ ترکِ وطن پر مجبور ہو گئے۔ ورنہ یہ ریکارڈ کی بات ہے کہ اگر ہندوستانی پولیس، ریاستی غنڈے اور فوجی دستے مسلمانوں کے مقابلے پر نہ آتے تو امرتسر کے مسلمان وہاں کے ہندوؤں سکھوں کو چٹکیوں میں مسل کر رکھ دیتے۔

میرے اس دعوے کی تصدیق روزنامہ نوائے وقت کے بانی جناب حمید نظامی مرحوم کے اس اداریے سے بھی ہوتی ہے جو انہوں نے ۲۰ اگست ۱۹۴۷ء کے نوائے وقت میں "امرتسر سے سبق" کے عنوان کے تحت تحریر کیا تھا۔ یہ اداریہ شعبہ صحافت جامعہ پنجاب کے سابق سربراہ جناب مسکین علی حجازی کی وساطت سے موصول ہوا ہے جسے اس کتاب کے قارئین کرام کی خدمت میں اس خیال سے پیش کیا جا رہا ہے کہ اس کے مطالعہ سے جہاں دشمنانِ پاکستان کے گھناؤنے عزائم، مکروہ سازشوں اور وحشیانہ مظالم کی تصدیق ہوتی ہے وہاں اسلامیانِ امرتسر کی طرف سے اس پہلے اور آخری مورچے (امرتسر) کی حفاظت میں ان کی بے مثال جرأت اور بہادری کے کارناموں کے اعتراف کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ مزید براں اس اقتباس سے اس امر کی بھی واضح نشاندہی ہوتی ہے کہ اگر امرتسر کے ہندوؤں سکھوں کو بھارتی فوج اور پولیس کے مسلح دستوں کی سرپرستی اور اعانت حاصل نہ ہوتی تو امرتسر کے کفن بردوش مسلمان اس طرح بے بس اور مجبور ہو کر اپنے گھروں کو خیرباد نہ کہتے!

امرتسر سے سبق

"۱۱ اگست کو لاہور کی فرقہ وارانہ حالت خراب ہو گئی اور پریس کے بند ہو جانے کی وجہ

سے ہم پانچ دن اخبار شائع نہ کر سکے۔ اس مختصر وقفے میں ملک میں بہت سے اہم واقعات رونما ہوئے۔ پنجاب میں مسلم لیگ وزارت قائم ہوگئی۔ ہندوستان آزاد ہوگیا اور پاکستان کی آزاد و خود مختار سلطنت جو صرف چند ماہ پہلے شاعر کا خواب سمجھی جاتی تھی، معرضِ وجود میں آگئی۔ مگر ہمارے نزدیک ان سب واقعات سے زیادہ اہم اور توجہ طلب سانحہ امرتسر کی تباہی ہے۔

پنجاب میں مسلمانوں کے اس دوسرے سب سے بڑے شہر میں یہ قتلِ عظیم اس ہفتے کا ہی نہیں، پنجاب کی تاریخ میں سکھا شاہی کے بعد پوری ایک صدی کا سب سے المناک واقعہ ہے۔ امرتسر پر جو قیامت گزر گئی ہے اس کی تفاصیل اخبارات میں شائع نہیں ہو سکیں۔ خبر رساں ایجنسیوں اور آل انڈیا ریڈیو نے اس معاملے میں افسوسناک بددیانتی سے کام لیا۔ جو خبریں دوسرے ذرائع سے لاہور پہنچیں وہ سنسر کی پابندیوں کے باعث شائع نہ ہو سکیں۔ ہمیں احساس ہے کہ سنسر کی پابندیاں ابھی تک قائم ہیں۔ یہ پابندیاں نہ بھی ہوتیں تو ہمیں یہ احساس ہی کافی تھا کہ فرقہ وارانہ فضا بے حد مخدوش ہے اور ہمارے قلم سے ایک لفظ بھی ایسا نہیں نکلنا چاہیئے جو اشتعال کا باعث بن کر جلتی آگ پر تیل کا کام دے۔ لیکن ان احساسات کے علاوہ ہمیں اپنی اس ذمہ داری کا بھی احساس ہے جو قوم کی طرف سے ہم پر عائد ہوتی ہے۔

اگر ہم امرتسر کے معاملے میں اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ نہ ہوں گے تو قوم کے بدترین مجرم ہوں گے۔ امرتسر سے متعلق قوم کو اندھیرے میں رکھنا اسے دھوکہ دینے کے مترادف ہے۔ رونگٹے کھڑے کر دینے والی تفصیلات کو نظرانداز کرتے ہوئے امرتسر کے متعلق یہ کہنا ناگزیر ہے کہ اس شہر میں بے گناہ مردوں، عورتوں اور بچوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کیا گیا۔ امرتسر کے غیور مجاہد گزشتہ چھ ماہ سے حیرت انگیز پامردی اور استقلال کے ساتھ اپنی انفرادی عزت اور قومی آبرو کو بچا رہے تھے۔ انہوں نے انتہائی نامساعد حالات میں منظم غنڈہ گردی کا مقابلہ کیا اور اسے ناکام بنا دیا۔ مگر یکایک ایسا پانسہ پلٹا کہ وہ بے بس و مجبور ہو کر رہ گئے۔

اور غنڈوں کے منظم و مسلح گروہوں نے ان پر وہ وحشیانہ مظالم ڈھائے کہ تاریخ میں اس کی چند ہی مثالیں مل سکیں گی۔ ایک ہندو سپرنٹنڈنٹ پولیس نے مسلمان پولیس سے ہتھیار چھین کر اسے نہتا کر دیا۔ یہ سگنل تھا غنڈہ عناصر کے لئے کہ اب وہ من مانی کارروائی کر سکتے ہیں۔ غنڈوں کے مسلح گروہ بے بس مظلوموں پر حملہ آور ہوتے۔ ان کی ہم قوم پولیس اور فوج نے انہیں روکنے کی بجائے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ مجروحین اوّل تو ہسپتال میں نہ پہنچ سکے اور اگر پہنچے تو کوئی ان کی مرہم پٹی کے لئے بھی آمادہ نہ تھا۔ غنڈوں کے ہم قوم اور ہم مذہب ڈاکٹروں اور کمپونڈروں نے طبابت کے معزز پیشے کے اخلاق کی دھجیاں اڑاتے ہوئے اپنی بے توجہی سے ان مظلوموں کو مار ڈالا۔ امرتسر کے وہ غیرت مند جو مسلسل چھ ماہ تک غنڈہ گردی کی قوتوں کو قدم قدم پر شکست دیتے رہے تھے۔ جب چاروں طرف سے اس طرح گھر گئے تو ہجرت اور فرار کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ نہ رہا۔ وہ اپنی عمر بھر کا اثاثہ وہیں چھوڑ کر صرف اپنی جانیں بچا کر امرتسر سے نکلے۔ مگر اکثر بے گناہوں کو اسی کوشش میں شہید کر دیا گیا۔

امرتسر کا یہ المناک سانحہ مسلمان قوم اور مسلمان لیڈروں کے لئے ایک انتباہ ہے۔ امرتسر کے مسلمانوں کی جمعیت کافی مضبوط و منظم تھی۔ ہمّت اور بہادری میں وہ مسلمانانِ پنجاب کا سرمایہ ناز تھے مگر اس کے باوجود وہ ایک ہفتے کے اندر برباد کر دیئے گئے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ سرکاری مشینری پر غیر مسلموں کا مکمل قبضہ ہو گیا تھا۔ امرتسری مسلمان بے سروسامانی کی حالت میں پیٹ پر پتھر باندھ کر غنڈوں کا مقابلہ کر سکتے تھے اور وہ کرتے رہے، مگر جب پوری سرکاری مشینری، فوج اور پولیس سمیت غنڈوں کی پشت پر ہو تو مسلمانوں کے لئے اس کا مقابلہ ناممکن تھا۔

امرتسر مسلمانوں کے لئے وارننگ ہے۔ اگر اب بھی ان کی آنکھیں نہ کھلیں تو امرتسر کی تاریخ جالندھر، ہوشیارپور، لدھیانہ اور لاہور میں بھی دہرائی جا سکتی ہے۔"

چنانچہ امرتسر کے مسلمانوں کے پاؤں اکھڑنے کی دیر تھی کہ بھارتی پنجاب کے شہری اور

دیہاتی مسلمانوں پر منظم حملے شروع ہو گئے اور وہ بے بسی کے عالم میں سپیشل ٹرینوں اور پیدل قافلوں کی صورت میں پاکستان کا رُخ کرنے لگے۔ بھارتی پنجاب، دہلی، یوپی اور سی پی کے بے بس مسلمانوں کو پاکستان تک پہنچنے میں جن مصائب اور مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کی دردناک تفصیل اس کتاب کے آخری حصے میں بیان کر دی گئی ہے۔ لیکن نفرت کی اس خوفناک آندھی کے دوران مختلف شہروں، دیہات اور قصبوں میں معدودے چند ہندوؤں سکھوں نے بلاشبہ خود کو خطرے میں ڈال کر بعض مسلمانوں کی نہ صرف جانیں بچائیں بلکہ اپنی پناہ میں آنے والی متعدد مسلمان دوشیزاؤں کی آبرو کی حفاظت میں پدرانہ شفقت کا ناقابلِ فراموش مظاہرہ کیا۔

امرتسر میونسپل کمیٹی کے ہر دلعزیز صدر رائے بہادر لالہ پرکاش چند مہرہ، ہیلتھ آفیسر ڈاکٹر شیو ناراتن رمزڈن، بے بے ڈاکٹرنی، باوا گھنشام، گورنمنٹ گرلز ہائی سکول کی استانی سکھونت کور اور اسی سکول میں سودا سلف بیچنے والی مائی کوشلیا نے جس بے خوفی سے مسلمانوں کو اپنے گھروں میں پناہ دی وہ ان کی انسان دوستی کی چمکیلی یادگاریں ہیں۔

رائے بہادر لالہ پرکاش چند مہرہ کا مسلمانوں کے ساتھ اخلاص اور برتاؤ مثالی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ نہایت شستہ ادبی ذوق کے مالک تھے۔ امرتسر کے اکثر مشاعرے ان کی صدارت میں منعقد ہوتے تھے اور متحدہ ہندوستان کے ممتاز شعرا جگر مراد آبادی، جوش ملیح آبادی، علامہ تاجور نجیب آبادی، اختر شیرانی، حفیظ جالندھری، طفیل ہوشیارپوری اور ممتاز مسلم لیگی رہنما سردار شوکت حیات خاں وغیرہ ہمیشہ ان کی وسیع و عریض کوٹھی کے مہمان خانوں میں قیام کیا کرتے تھے۔ ان کے ہاں شادی بیاہ کے موقعوں پر مسلمانوں کے لئے حلال گوشت سے کھانے تیار ہوتے تھے۔ الغرض ابتلا کی اس کٹھن گھڑی میں رائے بہادر صاحب اور ان کے بھائیوں نے نہ صرف امرتسر کے متعدد مسلمانوں کو پناہ دی بلکہ اپنے مسلمان ملازمین (مالی، دھوبی اور وکٹوریہ گاڑی کے کوچوان) کو اُن کے بیوی بچوں سمیت جس طرح اپنی حفاظت میں سرحد پار کرائی وہ ان کی

عظمت اور شرافت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

بلوچ رجمنٹ کے بہادر جوانوں اور فرض شناس افسروں نے مہاجرین کی سپیشل ٹرینوں میں متعین ہو کر اور پیدل قافلوں کے ساتھ میلوں پیدل چل کر انہیں جس طرح بحفاظت پاکستان پہنچایا وہ ایک ایسا شاندار کارنامہ تھا جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے اسی طرح زندہ دلانِ لاہور نے بھارت سے بے گھر ہو کر آنے والے مہاجرین کے زخمی دلوں پر جس انداز سے اپنے اخلاص کی مرہم رکھی۔ ان کے کھانے پینے اور دیگر ضروریات کو پورا کرنے کے لئے جس فراخدلی اور ایثار کا ثبوت دیا اس سے قرونِ اولیٰ کے انصار کے جذبۂ اخوت کی یاد تازہ ہو گئی تھی۔ یہاں اس امر کا تذکرہ بے محل نہ ہو گا کہ اس کتاب کا یہ ناچیز مصنف اپنے والدین کے ہمراہ ایک سپیشل ٹرین کے ذریعے ۲۴ اگست ۱۹۴۷ء کی شام کو لاہور پہنچا تو ریلوے سٹیشن کے اس پلیٹ فارم پر جہاں سے آج کل امرتسر کے لئے ٹرین روانہ ہوتی ہے، ہزاروں مہاجرین پریشانی کے عالم میں بیٹھے تھے۔ میں بھی اپنے گھریلو سامان ٹرنک کی اوٹ میں چھپ کر بیٹھا تھا کیونکہ لاہور سے ہندوستان جانے والی سپیشل ٹرین کے ہندو سکھ مسافر فائرنگ کر رہے تھے جس سے سٹیشن پر خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ چند لمحوں کے بعد جب وہ ٹرین گولیاں برساتی ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی تو امرتسر سے ہجرت کر کے آنے والے مسلمان اس بات پر حیرت کا اظہار کرنے لگے کہ ہندوستان سے پاکستان آنے والی سپیشل ٹرینوں پر ہندوؤں سکھوں کا گولیاں چلانا سمجھ میں آتا تھا لیکن لاہور تو پاکستان کا حصّہ ہے اور یہاں بھی ہندو سکھ دیدہ دلیری سے مسلمانوں پر گولیاں برسا رہے ہیں۔

الغرض لاہور کے ریلوے سٹیشن پر کہرام سا مچا ہوا تھا۔ ہم اس سوچ میں گم تھے کہ ریلوے سٹیشن سے باہر جائیں تو کس طرح۔ کہ اس اثنا۔ میں زندہ دلانِ لاہور مہاجرین میں روٹیاں تقسیم کرتے دکھائی دیتے نوجوان رضاکاروں اور شہریوں کی ایک ٹولی

ہمارے قریب بھی آئی اور انہوں نے ہمیں روٹیاں پیش کیں۔ میں نے بے ساختگی سے ان نوجوانوں کی طرف اپنا دایاں ہاتھ بڑھا دیا اور ان سے پاکستان کی پہلی روٹی لے کر اس پر پڑی ہوئی چنے کی دال کھانے لگا۔ اس واقعہ کو گزرے آج ۴۳ برس کا طویل عرصہ گزر چکا ہے اور اس اثنا میں لاتعداد یاد رکھنے اور بھول جانے والے واقعات ظہور پذیر ہوئے۔ بے شمار خوشیاں دیکھنی نصیب ہوئیں۔ چند ایک صدمے بھی اٹھانے پڑے۔ لیکن ان تمام باتوں میں اگر کوئی بات یاد رہ گئی ہے تو ہندوؤں سکھوں کا مسلمانوں کے ساتھ معاندانہ سلوک یاد رہ گیا ہے۔ پاکستان کی سرزمین پر حاصل ہونے والی پہلی روٹی کی لذّت یاد رہ گئی ہے اور پاکستان کے اس کٹے ہوئے بازو کا ناقابل فراموش تصّور۔ آج بھی میرے حافظے میں ایک گہری خراش کی صورت میں موجود ہے جس کو ہم مشرقی پاکستان کے نام سے یاد کرتے تھے۔

پاکستان کی نئی پود سے مجھے کوئی شکوہ نہیں۔ شکایت اگر ہے تو وطنِ عزیز کے ان اکابرین سے جنہوں نے انہیں تواتر کے ساتھ ان حالات و واقعات سے آگاہ نہیں کیا جن کے تحت پاکستان معرضِ وجود میں آیا تھا۔

زیرِنظر کتاب اس خاکسار نے پاکستان کے ان نوجوانوں کے لئے سپردِ قلم کی ہے جن کو ہندوؤں سکھوں کی سرشت سے کماحقہٗ آگاہی نہیں اور جو امرتسر ٹیلی ویژن کی ثقافتی یلغار سے متاثر ہونے کے ساتھ ساتھ تحریکِ پاکستان کے مقاصد اور اس سلسلہ میں دی جانے والی بیش بہا قربانیوں سے بھی نابلد ہیں

میرا ایمان ہے کہ قائدِاعظمؒ کے فرمودات پر عمل پیرا ہو کر ہم آج بھی اپنی عظمتِ پارینہ کو لوٹا سکتے ہیں۔

خدا کرے میری یہ حقیر سی کوشش دوسرے اہلِ قلم کے لئے بھی تحریک و ترغیب کا ذریعہ بنے اور بالخصوص وہ لوگ جو آگ اور خون کے دریا کو عبور کر کے پاکستان

پہنچے' اپنے اور ہمسفر بھائیوں کے تجربات اور مشاہدات کو ضبطِ تحریر میں لانے کی طرف راغب ہوں تاکہ آنے والی نسلیں ہماری اس جدوجہد سے کما حقہ آگاہ ہو سکیں۔

جناب مجید نظامی' مولانا ذوالفقار انبالوی' ظہور عالم شہید ، ضیاالاسلام انصاری' سیف الدین سیف' اے حمید اور مسٹر جاوید اقبال کارٹونسٹ کا بے حد ممنون ہوں جنہوں نے اس کتاب کے حسن کو دو بالا کرنے کے لئے اپنی تخلیقات سے نوازا۔ ان کے علاوہ روزنامہ مشرق کے چیف آرٹ ایڈیٹر جناب شائف گلزار اور آرٹ ایڈیٹر مسٹر حبیب الرحمٰن کا شکر گزار ہوں جن کے مفید مشوروں نے قدم قدم پر میری رہنمائی کی۔

مسٹر عبدالعزیز خوشنویس نے اپنی والدہ ماجدہ کے انتقال کے باوجود کتابت کے کام کو جس خلوص سے جاری رکھا اس کے لئے ان کا بھی تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

برادرم ذوالفقار علی آغا نے کتاب کی پروف ریڈنگ میں جس اخلاص سے میرا ہاتھ بٹایا اس کے لئے وہ بھی شکریے کے مستحق ہیں۔

آخر میں مجیب الرحمان شامی صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے اس کتاب کا پہلا ایڈیشن شائع کر کے نہ صرف میری حوصلہ افزائی فرمائی بلکہ وقت کی اس اہم ضرورت کو پورا کیا جس کا ہمارے ملک کے حالات شدت سے تقاضا کر رہے تھے۔

خواجہ افتخار

۳۵۔ نسبت روڈ لاہور

ٹیلیفون : ۶۵۳۱۷ / ۶۶۲۶۴

مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے
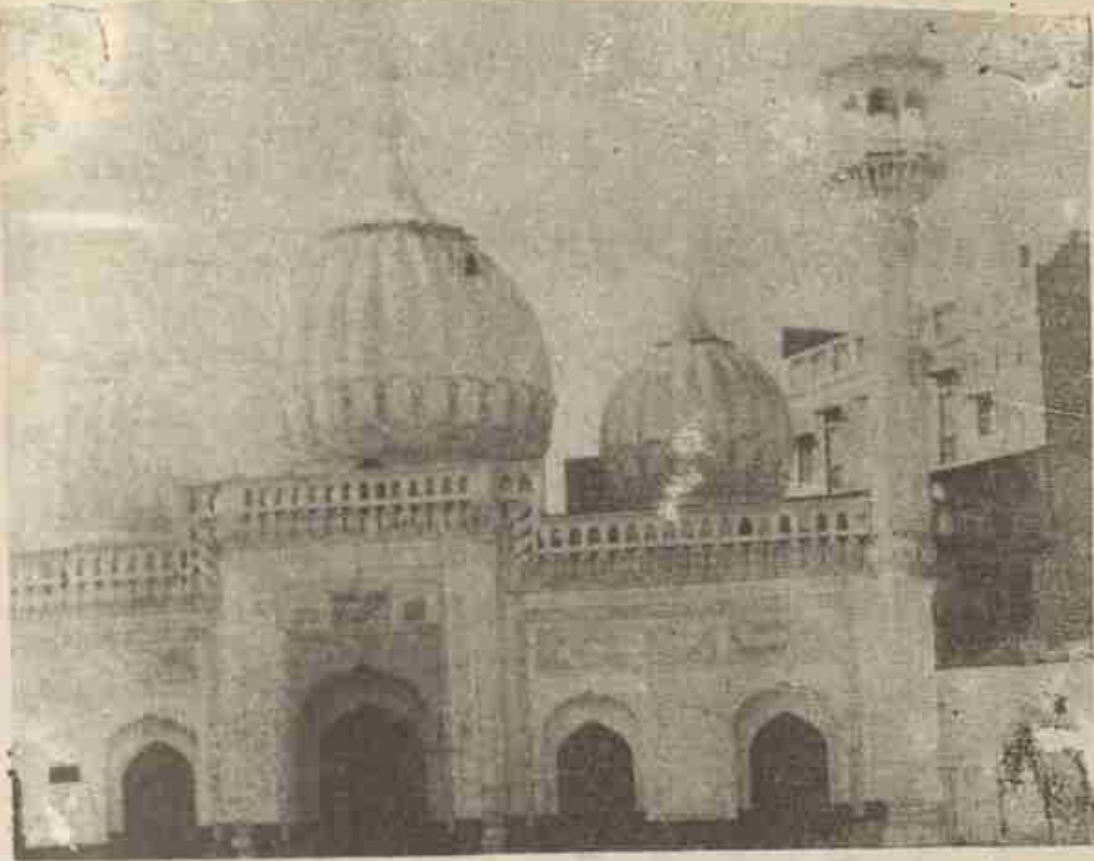
جامع مسجد خیرالدین مرحوم جہاں تحریکِ پاکستان کے دوران جلسے منعقد ہوتے تھے۔
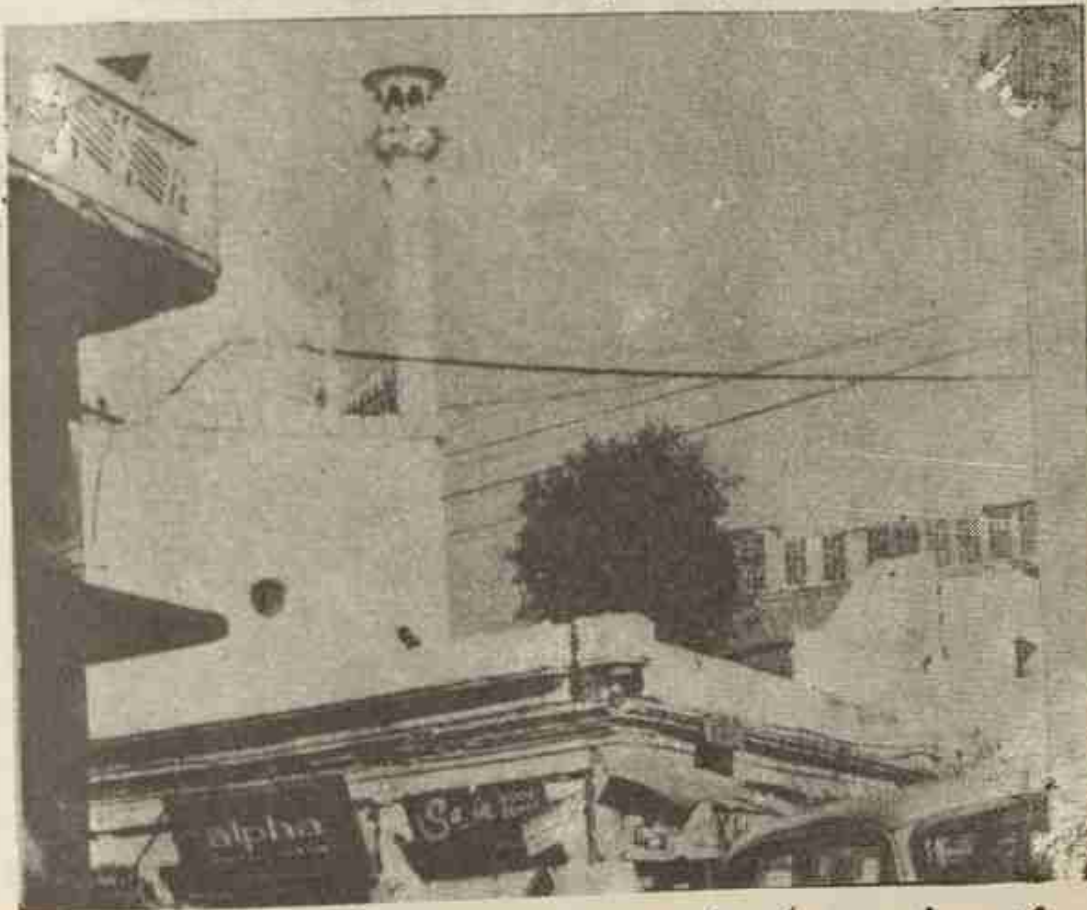
مسجد بان محمد مرحوم جس کے چوراہے پر ایاز محمود عرف جاجی نے انگریز ایس پی کا سر توڑا

کوئی چٹکی سی کلیجے میں لئے جاتا ہے — ہم تری یاد سے غافل نہیں ہونے پاتے
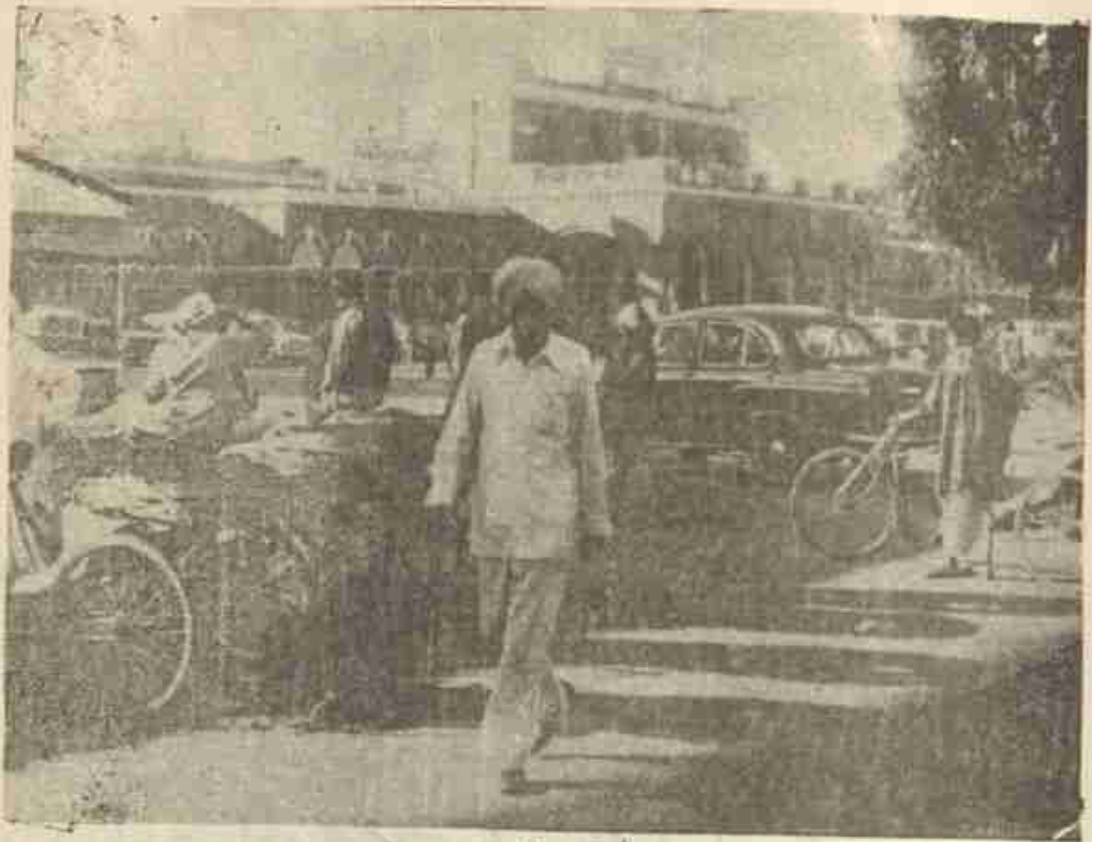
ریلوے سٹیشن امرتسر کا بیرونی منظر

ہال گیٹ امرتسر

شہر در شہر گھر جلاتے گئے
یوں بھی جشنِ طرب مناتے گئے
وقت کے ساتھ ہم بھی اے ناصر
خار و خس کی طرح بہاتے گئے

اے مرے شہر

سیف الدین سیفؔ

اے مرے شہر تیرے پہلو میں
کتنے شاداب دن گزارے ہیں

اب بھی رقصاں مری نگاہوں میں
کمپنی باغ کے نظارے ہیں

دل کو آغوش میں لئے اب تک
نہر کے شبنمی کنارے ہیں

جو کبھی رہزنِ دل و جاں تھے
آج بھی جان و دل سے پیارے ہیں

تیری دیکھی ہوئی بہاروں کے
دل پہ نقشے کئی اتارے ہیں

کتنی ویران ہو گئیں راتیں
اب نہ وہ چاند ہے نہ تارے ہیں

جن کے سائے دلوں کی ٹھنڈک تھے
وہ در و بام یاد آتے ہیں

دھیان پڑتے ہیں آشنا چہرے
اجنبی نام یاد آتے ہیں

یاد آتی ہے ہجر کی تلخی
وصل کے جام یاد آتے ہیں

کس قدر تہمتیں اٹھاتی تھیں
کتنے الزام یاد آتے ہیں

جن کی یادوں کے داغ دُھل نہ سکے
وہ دلآرام یاد آتے ہیں

دامنِ دل کے ریگزاروں میں
غم کے اہرام یاد آتے ہیں

اے مرے شہرِ تیرے پہلو میں — اوّلیں چوٹ دل پہ کھائی تھی
آرزوؤں کے لالہ زاروں میں — غم کی پہلی بہار آئی تھی
تو نے رکھی تھی درد کی بنیاد — تو نے تعمیرِ غم اٹھائی تھی
تو نے بخشا تھا ہجر کا صدمہ — تو نے شمعِ وفا جلائی تھی
وصل کی لذتیں نثار اُس پہ — وہ جُدائی بھی کیا جُدائی تھی

ہاں مجھے یاد ہے وہ گوشۂ غم
دل کی دولت جہاں لٹائی تھی

صبح دم بتکدے کی راہوں میں — جمگھٹے وہ پری جمالوں کے
دیکھتے تھے ابھر ابھر کے مجھے — اونچے اونچے کلس شوالوں کے
وہ تڑپنا تڑپنے والوں کا — وہ دلاسے گزرنے والوں کے
وہ تسلی شریر آنکھوں کی — وہ تقاضے خراب حالوں کے
وہ مہکتی ہوئی گزرگاہیں — مشکبو راستے خیالوں کے

ان کی بادہ فروش آنکھوں میں
سارے انداز تھے غزالوں کے

اے مرے شہر کتنی اُجلی تھی — چاندنی تیرے بوستانوں میں
تنگ راہوں میں نیند کے ساتے — نیلگوں روشنی مکانوں میں
اور گلیوں میں راہ چلتے ہوتے — لوریوں کی صدائیں کانوں میں
ہائے وہ لوگ چلمنوں سے اُدھر — جیسے کردار ہوں فسانوں میں
سبزہ زاروں میں دن گزرتا تھا — رات کٹتی تھی بادہ خانوں میں

اب کہاں وہ نگر کہاں وہ لوگ
رہ گیا ذکر داستانوں میں

وہ چھتوں پر بسنت رُت کا سماں — دل سراپا امنگ ہو جاتے
گورے گورے بھرے بھرے وہ بدن — ہر قبا جن پہ تنگ ہو جاتے
ایک آنچل اگر ہوا میں اُڑے — روشنی ہفت رنگ ہو جاتے
دلِ بیتاب کو اماں نہ ملے — شوقِ نظّارہ دنگ ہو جاتے
کیا سلیقہ تھا آنکھوں آنکھوں میں — صُلح ہو جاتے جنگ ہو جاتے

ہاتھ انگڑائی کو ذرا جو اُٹھیں
خود وہ کافر پتنگ ہو جاتے

لے اُڑی گو ہوا تے غم مجھ کو — وقت کے تیز رَو سفینے میں
تیری ہر آہ میرے لب پر ہے — تیرا ہر زخم میرے سینے میں
تیری مٹی مرے خمیر میں ہے — تیری خوشبو مرے پسینے میں
کوئی موسم نہ دل کو راس آیا — جی نہ بہلا کسی مہینے میں
تجھ میں جو گوہرِ وفا کھویا — پھر نہ پایا کسی خزینے میں

اب بھی ہوتے ہیں دل کے داغ ہرے
پھول کھلتے ہیں جس مہینے میں

پھر وہ دن آئے کہ سرِ بازار — وحشیوں کے ہجوم لڑنے لگے
اس طرح تیرگی نے کی یلغار — روشنی کے قدم اکھڑنے لگے
بستیوں میں فساد کے شعلے — بے گناہوں کی سمت بڑھنے لگے
جان کا خوف آن کا دھڑکا — چاند سے چہرے ماند پڑنے لگے
خاندانوں میں ابتری پھیلی — لوگ روتے ہوتے بچھڑنے لگے

جن کی رونق تھی رشکِ باغ عدن
وہ محلّے وہ گھر اُجڑنے لگے

رات روشن تھی سیلِ آتش سے
دن کا چہرہ دھوئیں سے کالا تھا

ہر طرف وحشیوں کے لشکر تھے
بربریت کا بول بالا تھا

تیغِ قاتل نے کمسنوں کا لہو
در و دیوار تک اُچھالا تھا

کتنی بہنیں تھیں بھائیوں نے جنہیں
اپنے ہاتھوں سے مار ڈالا تھا

اُن کی لاشیں بھی دفن کر نہ سکے
ناز و نعمت سے جن کو پالا تھا

بیکسوں نے دُعائیں کیں لیکن
اُس گھڑی کون سننے والا تھا

اک یقیں تھا خُدا تو سُنتا ہے
جب کوئی دوسرا نہیں سُنتا

لیکن آخر یہ مجھ پہ راز کھُلا
کیا وہ سُنتا ہے کیا نہیں سُنتا

وہ سمیع و بصیر ہے لیکن
بے عمل کی صدا نہیں سُنتا

ڈُوبتا ہے جو وقت سے پہلے
شورِ موجِ بلا نہیں سُنتا

شہر جل جائیں بستیاں مِٹ جائیں
غافلوں کی دُعا نہیں سُنتا

فیصلہ ہے یہ دینِ فطرت کا
بُزدلوں کی خُدا نہیں سُنتا

قوم پر جب زوال آتا ہے
رہنما بے ضمیر ہوتے ہیں

جو خوشامد کے فن میں کامل ہوں
وہ مشیر و وزیر ہوتے ہیں

جن کی فردِ عمل ہو اپنی سیاہ
وہی منکر نکیر ہوتے ہیں

چھُپتے پھرتے ہیں اس کے اہلِ ہُنر
اہلِ فن گوشہ گیر ہوتے ہیں

مُلک بٹتا ہے فوج کٹتی ہے
اُس کے بیٹے اسیر ہوتے ہیں

موت سے چھُپ کے بھاگنے والے
لقمۂ دار و گیر ہوتے ہیں

ہو گئی خواب نیند راتوں کی　　دن عجب خوف میں گزرنے لگے
زندگی جن پہ ناز کرتی تھی　　وہ حسیں زہر کھا کے مرنے لگے
جن پہ مغرور تھی بہار وہ پھول　　شاخ سے ٹوٹ کر بکھرنے لگے
کفر و ایمان کے تصادم میں　　بیٹیوں کے لباس اُترنے لگے
ایسا ہمسائے نے سلوک کیا　　اپنے سائے سے لوگ ڈرنے لگے

بچنے والوں نے وہ سماں دیکھا
مرنے والوں پہ رشک کرنے لگے

اے مرے شہر اُن دنوں تُو نے　　گو ہمیں خستہ حال دیکھا ہے
پھر بھی چشمِ فلک نے صدیوں میں　　یہ سماں خال خال دیکھا ہے
ہم نہتے بھی لڑ گئے اکثر　　تُو نے یہ بھی کمال دیکھا ہے
تیرے جلتے ہوئے دریچوں نے　　غازیوں کا جلال دیکھا ہے
تو نے جلتی ہوئی چھتوں کے تلے　　وہ جدال و قتال دیکھا ہے

راہِ حق میں لٹا دیا سب کچھ
جان دیکھی نہ مال دیکھا ہے

دل سے جاتا نہیں دھواں اب تک　　تیرے جلتے ہوئے مکانوں کا
آج بھی گونجتا ہے کانوں میں　　شورِ فریاد ناتوانوں کا
موت چھاتی ہوئی ضعیفوں پر　　رنگ اترا ہُوا جوانوں کا
ماؤں کی چھاتیوں سے لگ لگ کر　　دل دھڑکتا تھا بے زبانوں کا
دُور تک قافلے غریبوں کے　　ہاتے وہ عزم سخت جانوں کا

موت کی بے بسی نگاہوں میں
پیٹھ پہ بوجھ آسمانوں کا

ہائے وہ آخری شبِ وحشت نیند آتی نہ غم کے ماروں کو
ہم نے رخصت کیا تھا رو رو کر صبح کے ڈوبتے ستاروں کو
ساتھ لاکھوں کے چل دیتے ہم بھی بے کفن چھوڑ کر ہزاروں کو
آنکھوں آنکھوں میں کر لیا سجدہ مسجدِ شہر کے مناروں کو
کتنی حسرت سے ہم نے دیکھا تھا سبتلا کے حسیں نظاروں کو
دُور سے آخری سلام کیا اپنے اجداد کے مزاروں کو
روتے لگ کر تری فصیلوں سے چھوڑ کر تیری رہگزاروں کو

کیا خبر کھا گئی نظر کس کی
تیرے باغوں تری بہاروں کو

○

کیا کیا دیکھا

مولانا وقار انبالوی

ہو نہیں سکتا بیاں آنکھ نے کیا کیا دیکھا
دیر تک اپنے مقدر کا تماشا دیکھا

دیر تک صبحِ وطن شامِ غریباں ہی رہی
دیر تک دیس میں پردیس کا نقشہ دیکھا

ایک کی ہم نے ہزاروں سے لڑائی دیکھی
نرغۂ کفر میں ایمان کا جلوہ دیکھا

لڑ گئے، گرچہ نہتے بھی تھے محصور بھی تھے
دیکھا! یہ شوقِ شہادت کا تقاضا دیکھا

ہم نے بدلے ہوئے احباب کے تیور دیکھے
ہم نے بپھرے ہوئے اغیار کا تیہا دیکھا

ہم نے بدلی ہوئی ہر چیز کی صورت دیکھی
ہم نے بگڑا ہوا ہر کام کا نقشہ دیکھا

جان محفوظ نہ اولاد نہ عزت نہ منال
سامنے آنکھوں کے گھر بار کو لٹتا دیکھا

ہم نے قانون کو انصاف کو مُردہ پایا
ہم نے تہذیب کو اخلاق کو رُسوا دیکھا

زندگی خوف و تباہی کے سوا کچھ بھی نہ تھی
درد وہ درد کہ جس کا نہ مداوا دیکھا

ہم نے وہ دیکھا کہ دشمن کو دکھائے نہ خُدا
جس طرف اٹھی نظر موت کا پہرہ دیکھا

وہ سخی، حاتم ثانی جنہیں کہتے تھے سبھی
ان کا فاقوں سے اترتا ہوا چہرہ دیکھا

وہ جری، جن کے اشاروں پہ قضا کھیلتی تھی
ان کو مجبوری و حسرت کا سراپا دیکھا

بھوک میں سہمے ہوئے بچوں کی صورت دیکھی
چوٹ کھا کھا کے بزرگوں کو تڑپتا دیکھا

باپ کے سامنے بیٹوں کے گلے کٹتے تھے
ماؤں کی گود میں بچّوں کو بلکتا دیکھا

شیرخواروں کے گلے خوں میں تر دیکھے ہیں
نوجوانوں کو تہِ تیغ تڑپتا دیکھا

بارشوں میں کہیں سایہ تھا نہ دیوار نہ در
کبھی پالا نہ پڑا جس سے وہ پالا دیکھا

ہم نے بربادیٔ تہذیب کی صورت دیکھی
ہم نے بیدردیٔ کفّار کا نقشہ دیکھا

ہم نے توہینِ مساجد کے مناظر دیکھے
ہم نے تذلیلِ مقابر کا تماشا دیکھا

عصمتِ دخترِ اسلام سے کھیلے کافر
جبر کے کاندھوں پہ غیرت کا جنازہ دیکھا

ہم نے جس سوزِ حمیّت سے قفس پھونکے تھے
آشیانوں کو اسی آگ میں جلتا دیکھا

دیکھتے جاتے تھے اور کچھ بھی نہ کر سکتے تھے
تھے جو مجبورِ نظر، جو نظر آیا دیکھا

تیری منزل جو قریب آئی مرے پاک وطن!
خوں کے سیل میں ڈوبا ترا رستہ دیکھا

اتنے آلام و مصائب سے نمٹ کر نکلے
تب کہیں جا کے ترا چاند سا مکھڑا دیکھا

○

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی، جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے
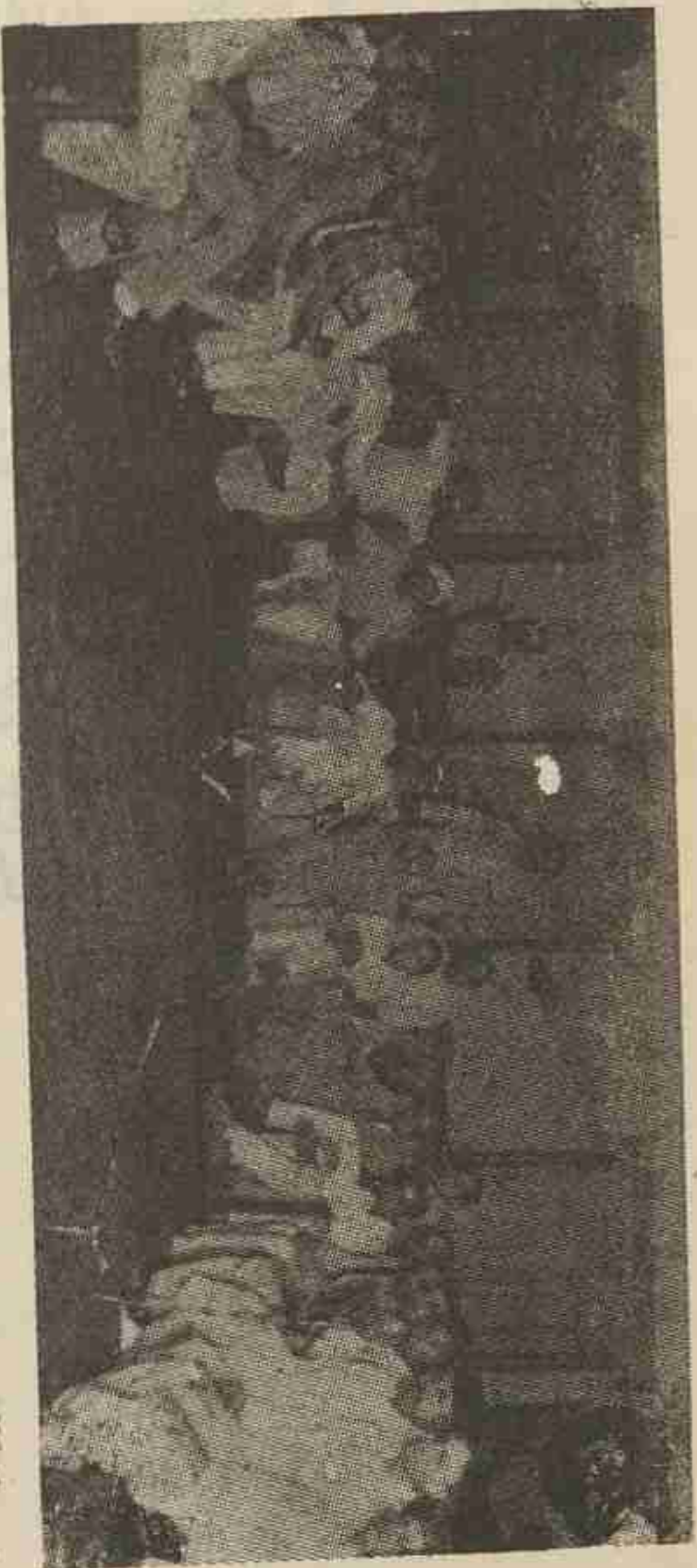
امرتسر مسلم لیگ الیکشن کمیٹی کے ارکان ایم اے او کالج کے غلام حسن ہال میں خان افتخار حسین خان ممدوٹ کے ساتھ۔ دائیں سے بائیں ۔ عبداللہ خلدی
شیخ عنایت اللہ، گاما پہلوان، خلیفہ احمد دین، خواجہ محمد رفیق شہید، ذکی الدین پال، ظہور الدین پال، میر انور سعید محمود، محمد حسین سائیاں، مولوی سراج الدین پال،
ملک غلام نبی، شیخ صادق حسن، خان افتخار حسین خان ممدوٹ، میاں اللہ دتہ، ملک محمد انور، میاں محمد امین پراچہ، شیخ آفتاب احمد، چاچا مصطفےٰ، خورشید پہلی،
خواجہ غلام نبی لیڈر، فتح محمد سلیم، مسٹر شبلی، صادق شاہ، نصیر خاں سب سے پیچھے خان عبداللہ خان اور خواجہ امیر الدین کھڑے ہیں۔

پہلا باب

حصولِ پاکستان اور اسلامیانِ امرتسر

یہ ان دنوں کی بات ہے جب پنجاب میں مسلم لیگ کی تحریک سول نافرمانی فروری، مارچ ۱۹۴۷ء کا آغاز ہو چکا تھا۔ امرتسر مسلم لیگ کے نیک دل صدر شیخ صادق حسن پنجاب مسلم لیگ کے اہم اجلاس میں شرکت کے لئے لاہور گئے ہوئے تھے اور پولیس نے انہیں اجلاس کے بعد امرتسر روانہ ہونے سے قبل مسلم لیگ کے صوبائی دفتر واقع رائل پارک لاہور سے گرفتار کر لیا تھا۔ شیخ صاحب کی گرفتاری کی خبر سنتے ہی امرتسر مسلم لیگ کے نائب صدر مولوی سراج الدین پال مرحوم نے مجلس عاملہ کا ہنگامی اجلاس ایم، اے، او کالج کے مرکنٹیڈ ہال میں طلب کر لیا جس میں متفقہ طور پر سول نافرمانی کی تحریک کو شروع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ چنانچہ اس اجلاس کے اختتام پر امرتسر مسلم لیگ کے جائنٹ سیکرٹری ملک غلام نبی ایم اے نے سب سے پہلے اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کیا۔ ان کے بعد اسی شام امرتسر مسلم لیگ کے اسسٹنٹ سیکرٹری بیرسٹر ایس، ایم حسین عرف سائیاں اور مشہور احراری کارکن مسٹر سلجی (مرحوم) نے بھی گرفتاری دی

امرتسر مسلم لیگ کے ممتاز رہنماؤں کی گرفتاری کے بعد تحریک کو زندہ اور جاری رکھنے میں امرتسر مسلم لیگ کے سینئر نائب صدر خلیفہ احمد دین، نائب صدر مولوی سراج الدین پال، جنرل سیکرٹری میر انور سعید محمود، سالارِ اعلیٰ مسلم لیگ نیشنل گارڈ خواجہ امیر الدین، شیخ عنایت اللہ، خواجہ غلام نبی لیڈر،

عبداللہ خاں، حاجی ثناءاللہ، مولوی ظہورالدین پال، محی الدین بٹ، ذکی الدین پال، علامہ عبداللہ منہاس، لالہ منو، غلام محی الدین شیخ، ملک محمد انور، تقی الدین پال، صادق شاہ، اختر میرواری، خواجہ مصطفےٰ، خواجہ محمد رفیق شہید، سردار محمد صادق، ملک حامد سرفراز، غلام حسن گلشن، ناصر شاہ، خورشید دائی، خواجہ صدیق الحسن، شیخ محمد سلیم، مسٹر احسن، چاچا مصطفےٰ اور کارکنوں کی بھی کچھی تعداد اہم کردار ادا کر رہی تھی۔ اس کے علاوہ جنڈیالہ گرو کے ممتاز مسلم لیگی کارکن اور پنجابی کے مشہور شاعر منظور جھلا مرحوم کی قومی نظمیں مسلمانوں کے ملی جذبات ابھار رہی تھیں

پرنسپل دلاور حسین کی دلاوری

امرتسر میں روزانہ جلوس کا نکلنا، آنسو گیس کا استعمال اور لاٹھی چارج ایک معمول سا بن گیا تھا۔ ایم اے او کالج جو امرتسر مسلم لیگ کا ہیڈ کوارٹر بنا ہوا تھا۔ وہاں علی الصبح لوگ جمع ہونے شروع ہو جاتے۔ دس بجے کے قریب گرفتاری کے لئے پیش ہونے والے اصحاب کو ہاروں سے لاد کر جلوس کی شکل میں کوتوالی پہنچایا جاتا۔ راستہ میں جگہ جگہ پولیس مزاحمت کرتی تاکہ پولیس ہیڈ کوارٹر تک پہنچتے پہنچتے جلوس کی اصل طاقت کا شیرازہ بکھر جاتے۔ مگر پولیس کی ان مزاحمتوں کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلتا۔ لوگ پولیس کی مزاحمت کے بعد مختلف گلی کوچوں سے ہوتے ہوتے مختلف ٹولیوں میں بٹ جاتے۔ لیکن کوتوالی کے پاس جا کر پھر جمع ہو جاتے۔ جوش کا ایک سمندر امڈ آتا۔ نعروں سے فضا گونج اٹھتی۔ اشک آور گیس کے گولے چلتے۔ پتھراؤ ہوتا اور کبھی کبھی لاٹھی چارج کی بھی نوبت آجاتی

ایم اے او کالج کے پرنسپل جناب دلاور حسین مرحوم نے اس تحریک کے دوران اپنی دلاوری کے دل کھول کر جوہر دکھائے۔ انہوں نے نہ صرف اپنے کالج کے طالب علموں کو اس قومی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے پر آمادہ کیا بلکہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک روز معمول کے مطابق ایم اے او کالج سے ہم جلوس نکالنے کی تیاری کر رہے تھے کہ مقامی پولیس نے ایک انگریز پولیس افسر

کی موجودگی میں کالج کی حدود کے اندر اشک آور گیس کے گولے پھینکنے شروع کر دیتے تاکہ کالج سے جلوس نکلنے بند ہو جائیں لیکن دلاور حسین صاحب اس موقعہ پر جرأت کے ساتھ تن تنہا کالج کے بڑے دروازے تک پہنچ کر اس انگریز پولیس افسر کے ساتھ اُلجھ پڑے اور کہنے لگے کہ آپ لوگوں کو تعلیمی ادارے کے تقدس کا بھی پاس نہیں رہا۔ اگر آپ نے یہ سلسلہ بند نہ کیا تو طلباء کے اشتعال کے نتیجے میں ہونے والے نقصان کے آپ ذمہ دار ہوں گے؟

پرنسپل دلاور حسین کی دلآویز شخصیت، انگریزی لب و لہجہ کی لطافت، حالات کی نزاکت اور اُن کے حتمی اندازِ گفتگو نے اس انگریز پولیس افسر کو معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا اور وہ اپنے عملے سمیت خاموشی کے ساتھ واپس چلا گیا۔ پرنسپل دلاور حسین کے علاوہ پروفیسر کرامت حسین جعفری، ڈاکٹر عبدالرؤف اور کالج کے دیگر اساتذہ نے بھی طالب علموں کی ذہنی آبیاری میں اہم کردار ادا کیا۔

اس سے اگلے روز ایم اے او کالج کے طلباء اور مسلم لیگی کارکن جلوس نکالنے کے ارادے سے جمع ہو رہے تھے کہ پولیس کی ایک ڈنڈا بردار پارٹی کالج کے بڑے دروازے کے قریب پہنچ کر مظاہرین کو منتشر ہونے کی تلقین کرنے لگی۔ لڑکوں نے منتشر ہونے سے انکار کیا تو پولیس نے کالج کے ایک طالب علم اختر حسین خاں (جو آجکل فیصل آباد میں ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن آفیسر ہیں) کی طرف موٹے رسّے کی کمند پھینکی۔ جس کے نتیجے میں کمند کا پھندہ اختر حسین خاں کے گلے میں پھنس گیا۔

ایک طرف پولیس رسّہ کشی میں مصروف تھی تو دوسری طرف کالج کے طلباء اور مظاہرین اس رسّے کو اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ دونوں طرف سے طاقت آزمائی کا سلسلہ جاری تھا کہ اس اثناء میں کالج کے مین گیٹ کے قریب پھل فروخت کرنے والا خوانچہ فروش اپنے ہاتھ میں چھری لئے نہایت جرأت سے آگے بڑھا اور اس نے چشم زدن میں وہ مضبوط رسّہ کاٹ دیا جس کی گرفت نے مسٹر اختر حسین خاں کو جکڑ رکھا تھا

تھانہ رام باغ پر مسلم لیگی پرچم

الغرض امرتسر میں مسلم لیگ کی تحریک دن بدن زور پکڑتی جا رہی تھی اور جلوسوں کو روکنے کے سلسلہ میں مقامی پولیس کی تمام تدبیریں خاک میں ملتی جا رہی تھیں اور منظاہرین شہر کے مختلف تھانوں اور سرکاری دفاتر پر مسلم لیگی پرچم لہرانے کی سعی کر کے اپنے قومی جذبہ اور جوش کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ ایک روز مظاہرین کی ایک ٹولی شیخ عنایت اللہ، خواجہ غلام نبی لیڈر اور چاچا مصطفےٰ سالار مسلم لیگ نیشنل گارڈ کی قیادت میں ہال بازار سے ہوتی ہوتی تھانہ رام باغ کے چوک میں پہنچ گئی۔ مظاہرین پاکستان کی حمایت میں زوردار نعرے لگا رہے تھے کہ اس چوک میں ٹریفک کا نظام درہم برہم ہو گیا۔ اس موقع پر ممتاز مسلم لیگی کارکن آغا امان اللہ خاں نے پرجوش تقریر کی۔ ان کی تقریر کے بعد ابھی مسٹر نذیر اور صادق پاکستانی نے تقریر کرنا تھی کہ جلوس کے شرکاء پر پولیس نے لاٹھیاں برسانی شروع کر دیں۔ مظاہرین نے جوابی کارروائی کے طور پر اینٹیں چلائیں۔ یہ تصادم جاری تھا کہ چند کارکن عقبی دیوار کے ذریعے تھانے کی چھت پر چڑھ گئے۔ انہوں نے چھت پر چڑھ کر تھانے کی عمارت پر سبز ہلالی پرچم لہرا دیا۔ پولیس کے سپاہی مظاہرین کی کثرت اور اپنی نفری کی کمی کے باعث بدحواس ہو چکے تھے۔ یہ آنکھ مچولی جاری تھی کہ چند منچلوں نے پولیس کی اُن لاریوں کے ٹائر پنکچر کر دیئے جو تھانے کے عقبی بازار میں کھڑی تھیں۔ اس تصادم میں جہاں بعض سپاہی زخمی ہوتے وہاں مسٹر جان محمد (آجکل بیڈن روڈ پر اخبار بیچتے ہیں) اور بجلی گھر امرتسر کے ملازم خوشی محمد عرف خوشیا کو بھی شدید چوٹیں آئیں۔ چنانچہ تھانہ رام باغ کے انچارج یوسف خاں نے متعدد کارکنوں کے خلاف مقدمات درج کر کے انہیں گرفتار کر لیا۔

رام باغ کے تھانے پر مسلم لیگی پرچم لہرانے اور کارکنوں کی گرفتاری کے واقعہ نے اسلامیانِ امرتسر کو ایک نیا ولولہ عطا کیا اور وہ اس تحریک میں غیر معمولی دلچسپی لینے لگے۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ ایم، اے او کالج سے معمول کے مطابق جلوس نکلا۔ خواجہ محمد رفیق شہید نے گول ہٹی کے چوراہے میں جلوس

کے شرکا سے خطاب کیا۔ ان کی تقریر کے بعد جب جلوس کوتوالی کے قریب پہنچا تو مظاہرین کا پولیس کے ساتھ تصادم ہو گیا۔ پولیس نے پہلے تو ہجوم کو اشک آور گیس کے ذریعے منتشر کرنا چاہا مگر لوگوں نے پانی کی بالٹیاں بھر بھر کر رومالوں کے ذریعے اشک آور گیس کا اثر زائل کر دیا تو پولیس نے شدید لاٹھی چارج شروع کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں نے میونسپل کمیٹی کے قریب پڑے ہوئے پتھروں سے جوابی کارروائی شروع کر دی۔ اس کے بعد گھوڑ سوار پولیس نمودار ہوئی۔ جس نے انتہائی بیدردی سے لاٹھیاں برسائیں اور بعض مظاہرین کو گھوڑوں کے پاؤں تلے روند ڈالا۔ جس کے نتیجے میں کافی لوگ زخمی ہوئے اور بہت سے افراد کو خواجہ محمد رفیق شہید سمیت حراست میں لے لیا گیا۔ اس طرح مسلم لیگ کی تحریک ایک نئے موڑ پر آ گئی۔

"تمام شہر میں پولیس کے سنگدلانہ لاٹھی چارج کے خلاف نفرت کی لہر دوڑ گئی۔ گھر گھر میں پکار پڑ گئی۔ کسی کے بھائی کا بازو زخمی تھا تو کسی کے بیٹے کا سر پھٹا ہوا تھا۔ کسی کے شوہر کی گرفتاری عمل میں آ چکی تھی تو کوئی زخموں سے تڑپ رہا تھا

امرتسر کی کوئی گلی کوئی کوچہ اور محلہ ایسا نہ تھا جس کا کوئی نہ کوئی فرد اس ظلم اور زیادتی کا شکار نہ ہوا ہو۔

مسلم خواتین کا یادگار جلوس

اس ظلم اور زیادتی کے خلاف تمام شہر میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ اگلے روز احتجاج کے طور پر امرتسر کی طالبات اور خواتین نے شیخ صادق حسن مرحوم کے گھرانے کی مستورات کی قیادت میں ایک زبردست جلوس نکالا۔ یہ جلوس اتنا منظم اور طویل تھا کہ امرتسر کی تاریخ میں اس سے قبل مسلم خواتین کا ایسا جلوس نہ کبھی دیکھا نہ سنا تھا۔ یہ جلوس ہزاروں برقع پوش لڑکیوں، طالبات اور سینکڑوں خواتین پر مشتمل تھا۔ جلوس میں سب سے آگے ایک خاتون نے مسلم لیگ کا پرچم اٹھا رکھا تھا۔ اس کے پیچھے کالی جھنڈیاں اٹھائے امرتسر کی طالبات "پولیس راج مردہ باد" "لے کے رہیں گے پاکستان" "بنا

پڑے گا پاکستان اور پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ کے فلک شگاف نعرے لگا رہی تھیں۔ جلوس ہال بازار سے ہوتا ہوا پرجوش نعرے لگاتا چلا جا رہا تھا اور دوسری طرف ڈپٹی کمشنر ایڈی سن اور انگریز سپرنٹنڈنٹ پولیس رابنسن نے بھی آج پہلے کی نسبت حفاظت کے کڑے انتظامات کر رکھے تھے۔ کوتوالی کے آس پاس خاردار تاریں بچھا دی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ گھوڑ سوار پولیس کی بھی بھاری تعداد مستعد کھڑی تھی۔ طالبات اور خواتین کا یہ تاریخی جلوس ٹھاٹھیں مارتے سمندر کی طرح کوتوالی کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ مسلم لیگ کے رضا کار جلوس کو پرامن طریقے سے چلانے میں کوشاں تھے

ایاز محمود کی جراتِ رندانہ

جلوس بجلی والے چوک پہنچا تو ٹاؤن ہال کی ڈیوڑھی کے قریب ڈپٹی کمشنر ایڈی سن اور ایس پی رابنسن دیگر پولیس افسروں سمیت کھڑے تھے۔ جب جلوس مسجد جان محمد مرحوم کے قریب پہنچ گیا تو امرتسر کا ایس پی رابنسن آگے بڑھا اور اس نے اس خاتون کو روکنے کی کوشش کی جو جلوس میں سب سے آگے مسلم لیگی پرچم اٹھائے ہوئے تھی۔ رابنسن کے ارادے کو بھانپتے ہوئے اس شیر دل خاتون نے مسلم لیگی پرچم کو اپنے ہاتھوں میں مضبوطی سے تھام لیا اور منتشر ہونے کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ رابنسن نے فی الفور اپنی بغل سے ہنٹر نکالا اور چشم زدن میں اس خاتون کے ہاتھ پر زور سے دے مارا تاکہ اس کے ہاتھ سے پرچم گر پڑے۔ مگر آفرین ہے اس شیر دل خاتون پر کہ اس نے اپنے ہاتھ کو بری طرح زخمی کرا لیا لیکن پرچم کو ذرا سا بھی نہ جھکنے دیا۔ رابنسن دوسرا وار کرنے ہی والا تھا کہ بجلی والے چوک کے ایک غیور اور گرانڈیل نوجوان ایاز محمود عرف حاجی نے آناً فاناً ایک سپاہی سے لاٹھی چھینی اور اس کا آہنی حصہ پورے زور سے گھما کر رابنسن کے سر پر دے مارا۔ رابنسن چکرا کر دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔ وہ ایک ہفتے تک ہسپتال میں بے ہوش رہا اور اس کی کھوپڑی کی ہڈی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ناکارہ ہو گئی۔ مسٹر ایاز محمود عرف حاجی کو اقدام قتل اور دیگر سنگین قسم کے جرائم کے سلسلہ میں گرفتار کر لیا گیا اور ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء تک محبوس رہے۔ بعد ازاں جب دونوں مملکتوں کے

قیدیوں کا تبادلہ ہوا تو انہیں رہائی ملی۔ وہ رہا ہو کر لاہور پہنچے تو گوالمنڈی اور نسبت روڈ کے زندہ دلوں نے ان کی آمد اور رہائی کی خوشی میں نہ صرف انہیں ہاروں سے لاد دیا بلکہ تمام علاقہ میں مٹھائیاں بھی بانٹی گئی تھیں۔

ایاز محمود حاجی میرے بچپن کے دوست تھے۔ امرتسر کے کوچہ نیم والا میں ہم جوان ہوئے، ایک ساتھ کھیلے اور تحریک پاکستان میں شانہ بشانہ کام کیا۔ چنانچہ اس ناطے سے لاہور آ کر بھی ہم دونوں میں گاہے گاہے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ افسوس موت کے بے رحم ہاتھوں نے ۲۹ ستمبر ۷۹ء کی صبح کو ہماری دنیاوی ملاقاتوں کا سلسلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ اس روز معمول کے مطابق وہ باغ جناح کی سیر کرنے گئے تو وہاں سے واپسی پر انہیں سینے میں شدید درد محسوس ہوا۔ باغ سے سیدھے گنگارام ہسپتال کے ایمرجنسی مرکز پہنچے تو ابتدائی طبی امداد ملنے سے قبل ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔

ع ما ئیں بچے جنتی ہیں ایسے بہادر خال خال

امرتسر پولیس کے وہ دستے جو مسلمانوں پر مشتمل تھے مسلم خواتین کے جلوس پر لاٹھیاں برستی دیکھ کر کچھ دیر کے لئے غیر جانبدار سے ہو گئے چنانچہ لوگوں نے پولیس کی لاٹھیاں چھین کر انہی کی لاٹھیوں سے ان کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا۔

یہاں یاد رکھنا چاہیے کہ اس خوفناک تصادم کی وجہ سے وہ بھگدڑ بالکل نہیں مچی جو ایسے موقعوں پر عام طور پر متوقع ہوتی ہے کیونکہ ایک تو خواتین کے جلوس کے ساتھ مسلم لیگی رضاکار بھاری تعداد میں موجود تھے جن کی قیادت امرتسر مسلم لیگ نیشنل گارڈز کے سالار اعلیٰ خواجہ امیر الدین مرحوم کر رہے تھے۔ دوسرے جس محلے میں یہ واقعہ ہوا تھا وہ مسلم اکثریت کا علاقہ تھا۔ اس لئے خواتین کو اس ہنگامے کی وجہ سے زیادہ پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور وہ کچھ دیر کے بعد جب اپنے اپنے گھروں کو واپس ہوئیں تو کسی کے برقع کا ایک حصہ غائب تھا تو کوئی اپنے زخموں کی مرہم پٹی کرانے کی فکر میں تھی۔ کئی خواتین نے اپنے دوپٹے پھاڑ کر پانی میں بھگو لئے تھے۔ ان کے رومال اشک آور گیس کا اثر زائل کرنے کے کام آ گئے تھے۔

انگریز پولیس افسر کی اس زیادتی پر ایک مرتبہ پھر ہر گھر میں کہرام مچ گیا۔ مسلم لیگ سے اختلاف رکھنے والے مسلمان بھی پولیس کی اس حرکت کے خلاف نفرت کا اظہار کرنے لگے۔

تمام شہر میں عجیب سا سناٹا تھا۔ ایسا سکوت اور ایسی خاموشی جس کے پردے میں ہزاروں طوفان چھپے ہوتے تھے۔ اگلے روز جمعہ تھا۔ مسلم لیگ کی طرف سے جامع مسجد خیر الدین مرحوم میں نماز جمعہ کے بعد جلسہ ہوا۔ آج مقررین کی گفتار میں بھی شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک نظر آ رہی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے آج تمام شہر کے مسلمانوں نے سروں پر کفن باندھ لئے ہیں اور گزشتہ روز کی زیادتی کے خلاف آج کا احتجاج رائیگاں نہیں جائے گا۔ چنانچہ جلسہ کے بعد ہال گیٹ کے باہر انجمن پارک سے ایک بہت بڑا احتجاجی جلوس نکلا۔ بے شمار رضا کار گھوڑوں پر سوار تھے۔ جلوس کے آگے لوگوں نے کاغذ کا ہوائی جہاز اٹھا رکھا تھا اور اس کے پیچھے متحدہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ سردار خضر حیات ٹوانہ کی شبیہہ کو گدھے پر سوار کیا ہوا تھا جلوس انجمن پارک سے روانہ ہوا تو مجلس عمل نے اس کا رخ کوتوالی کے بجائے امرتسر ڈسٹرکٹ جیل کی طرف موڑ دیا۔ جہاں ایاز محمود حاجی اور دوسرے مقامی لیڈر اور کارکن محبوس تھے۔ یہ جلوس بھی طالبات کے جلوس کی طرح امرتسر کی تاریخ میں اپنی مثال آپ تھا۔ جن بزرگوں نے اس جلوس کو دیکھا، ان کا کہنا تھا کہ امرتسر میں مسلمانوں کا اس سے عظیم جلوس ماضی قریب و بعید میں کبھی دیکھنے سننے میں نہیں آیا۔ الغرض جلوس کے شرکا۔ اپنے محبوس لیڈروں سے ہمدردی کا اظہار کرنے کے لئے جیل کی طرف روانہ ہوتے۔ راستے میں کئی جگہ پولیس نے جلوس کو روکنے اور منتشر کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔

جلوس کے آگے گھوڑ سوار رضا کاروں کا دستہ اس کے بعد طالبات کے جلوس کا پرچم تھامنے والی خاتون اپنے دائیں ہاتھ پر پٹی باندھے آزادی کے ہزاروں پروانوں سمیت جلوس کے ساتھ چل رہی تھیں۔ جب جلوس ریالٹو سینما کے پاس پہنچا تو وہاں سے ڈسٹرکٹ جیل اور ضلع کچہری کا چوراہا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ امرتسر کے اے ڈی ایم شیخ اکرام الحق

اور دیگر پولیس افسر جلوس کا راستہ روکنے کے لئے چوراہے میں کھڑے تھے۔ ابھی مظاہرین چوراہے کے قریب پہنچنے بھی نہ پاتے تھے کہ اشک آور گولوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ لوگ جو پہلے ہی منظّم ہو کر پانی کی بالٹیاں تک ساتھ لاتے تھے مقابلے پر اُتر آئے۔ مسلم لیگ کے رضا کاروں کے گھوڑ سوار دستے نے بھی پولیس کے گھوڑ سوار دستے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور دست بدست لڑائی شروع ہو گئی۔ اشک آور گیس کے دو تین گولے میرے قریب آ کر گرے۔ اتفاق سے میں تو بچ گیا مگر میرے پرانے دوست اور تحریکِ پاکستان کے سرگرم کارکن سردار محمد صادق مرحوم کی ران پر ایک گولہ آ کر لگا اور وہ بُری طرح زخمی ہو گئے۔ ان کے علاوہ شر رسالتی (جو آجکل ریلوے ہیڈ کوارٹرز میں ہوتے ہیں) شدید زخمی ہوئے۔

یونین جیک کی جگہ سبز ہلالی پرچم

ہر طرف ایک عجیب کیفیت تھی۔ کہیں پولیس اور انتظامیہ کے افسروں کی پٹائی ہو رہی تھی تو کہیں کسی پولیس والے کو لوگوں نے زمین پر لٹایا ہوا تھا اور کہیں کوئی رضا کار پولیس کی لاٹھیوں کا نشانہ بن رہا تھا۔ مظاہرین اور پولیس کے اس تصادم کی وجہ سے جلوس دو تین حصوں میں بٹ گیا۔ ایک حصّہ ضلع کچہری کی طرف بڑھ گیا اور ڈپٹی کمشنر کے دفتر سے یونین جیک اتارنے کی جدوجہد کرنے لگا۔ دوسرا حصّہ ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی کی طرف روانہ ہو گیا۔ تیسرا حصّہ ڈسٹرکٹ جیل کی طرف پیش قدمی میں مصروف ہو گیا۔ امرتسر کے ڈپٹی کمشنر کے دفتر سے یونین جیک اتارنے کے لئے جب شریف پورہ امرتسر کے ایک غیوّر نوجوان مصطفٰے کالیا نے پیش رفت کی تو ایک پولیس افسر نے اس عمارت سے ملحقہ درخت پر لگے ہوئے شہد کی مکھیوں کے چھتے پر گولی چلا دی جس کے نتیجے میں مصطفٰے کالیا پر شہد کی مکھیوں نے حملہ کر دیا۔ اس کے تمام بدن اور چہرے پر شہد کی مکھیاں حملہ آور تھیں لیکن وہ مردِ مجاہد پہاڑ بن کر اس وقت تک اپنی جگہ پر ڈٹا رہا جب تک یونین جیک کو تار تار کر کے مسلم لیگ کا سبز ہلالی پرچم نہ لہرا دیا۔ جلوس کا وہ حصّہ جو ڈسٹرکٹ

جیل کی عمارت کی طرف بڑھ رہا تھا اس کو منتشر کرنے کے لئے انتظامیہ نے ایڑی چوٹی کا زور لگا رکھا تھا۔ مظاہرین پولیس کا حلقہ توڑ کر جیل پر مسلم لیگی پرچم لہرانے کے پرجوش نعرے لگاتے ہوئے جیل کی عمارت کی طرف بڑھے۔ نعروں نے جلتی آگ پر تیل کا کام دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے مظاہرین جیل کی سنگین دیوار تک پہنچ گئے۔

جیل کے اندر محبوس مسلم لیگی قائدین اور کارکن بھی پُرجوش نعرے لگا کر مظاہرین کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے اور جیل کے آس پاس کی فضائیں "قائداعظم زندہ باد" "لے کے رہیں گے پاکستان" "دینا پڑے گا پاکستان" کے فلک شگاف نعروں سے گونج رہی تھیں۔ یہ سلسلہ جاری تھا کہ اچانک ملک غلام نبی اپنے اسیر ساتھیوں سمیت ڈرامائی انداز میں جیل کی چھت پر نمودار ہو گئے۔ انہوں نے چھت پر کھڑے ہو کر مظاہرین سے خطاب کیا۔ ان کی جوشیلی تقریر نے جلتی آگ پر تیل کا کام کیا اور مظاہرین کے جوش و خروش میں زبردست اضافہ ہو گیا۔

امرتسر کا پہلا شہید

پولیس اتنے بڑے ہجوم پر قابو پانے میں یکسر ناکام ہو چکی تھی۔ امرتسر کا کوئی مسلمان، جوان، بچہ اور بوڑھا گھر میں نہیں بیٹھا تھا۔ گولیوں کے چلنے کی آوازیں بڑھتی جا رہی تھیں اور اشک آور گیس کی دھندلاہٹ آنکھوں میں نشتر چبھو رہی تھی۔ پولیس کے اکثر سپاہی میدان چھوڑ کر بھاگ چکے تھے اور کچھ درختوں اور جھاڑیوں کی اوٹ سے فائرنگ کر رہے تھے۔ جب مظاہرین جیل کی عمارت کے قریب پہنچے تو کچھ رضاکار جیل کی دیوار پر چڑھ کر جھنڈا لہرانے کی کوشش میں مصروف ہو گئے۔ اچانک ایک نوجوان اس کوشش میں کامیاب ہو گیا۔ وہ اس فریضہ کی ادائیگی کے بعد جیل کی دیوار سے اُتر ہی رہا تھا کہ ایک گولی سنسناتی ہوئی آئی اور اس کی کنپٹی پر لگی اور وہ اسی جگہ زمین پر گر پڑا۔ راقم الحروف دوڑ کر اپنے چند نوجوان ساتھیوں خواجہ عبدالرشید مرحوم آف گوکل پورہ اور عزیز احمد عرف جیجو وغیرہ سمیت اس مجاہد کے قریب

پہنچا تو دیکھا کہ یہ مجاہد محمد شریف (مجیٹھے والا) تھا۔ جس کے چہرے پر مجھے ایک لازوال فاتحانہ تبسم جھلکتا نظر آیا۔ لوگوں نے امرتسر کی تحریک کے اس پہلے شہید محمد شریف کو اٹھا لیا اور یہ جلوس لے کے رہیں گے پاکستان، دینا پڑے گا پاکستان اور پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ کے پُرجوش نعرے لگاتا شہر کی طرف بڑھ رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ امرتسر کے اس پہلے شہید نے جیل کی خوفناک دیوار پر پاکستان کا پرچم لہرا کر ان ماؤں بہنوں اور بیٹیوں کی لاج رکھ لی تھی جو اس پرچم کی سربلندی کے لئے گھروں سے باہر نکل آئی تھیں

اُس نے اپنے خون کی قربانی دے کر ان کی آرزوؤں کا خون ہونے سے بچا لیا تھا۔ وہ شہادت کا جام پی کر مسکرا رہا تھا اور اس کی مسکراہٹ میں ملتِ اسلامیہ کی کروڑوں مسکراہٹیں جھلک رہی تھیں۔

اس ایک مسکراہٹ نے کتنی مسکراہٹوں کو محفوظ کر لیا تھا۔

مظاہرین محمد شریف شہید کی لاش کو اٹھاتے بپھرے ہوئے سیلاب کی مانند شہر کی طرف لوٹ رہے تھے کہ ان کی یلغار کے زوردار ریلے سے کمپنی باغ اور رام باغ کے درمیان والا ریلوے کا آہنی پھاٹک ٹوٹ گیا۔

اس روز پولیس کی فائرنگ سے محمد شریف شہید ہوئے اور مظاہرین کے ہاتھوں ایک سکھ سپاہی مارا گیا نیز ایک سو کے لگ بھگ مسلمان اور پچیس تیس کے قریب پولیس والے زخمی ہوئے۔

مقامی پولیس سینکڑوں مسلمانوں کو گرفتار کر چکی تھی اور امرتسر کی ڈسٹرکٹ جیل مسلم لیگی لیڈروں اور کارکنوں سے کھچا کھچ بھر چکی تھی۔ انتظامیہ نے جگہ کی قلت کے پیشِ نظر بیشتر گرفتار شدگان میر انور سعید محمود، ملک غلام نبی اور خان عبداللہ خاں وغیرہ کو گورداسپور جیل میں منتقل کر دیا تھا۔ گورداسپور کی جیل بھی لاہور، بٹالہ، گورداسپور، لدھیانہ، انبالہ اور دیگر اضلاع کے گرفتار شدگان سے بھری ہوئی تھی۔ امرتسر مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری میر انور سعید محمود کے بیان کے مطابق جب وہ

گورداسپور جیل پہنچے تو اسلامیہ کالج لاہور کے ہر دلعزیز پرنسپل عمر حیات ملک، میاں محمود علی قصوری، احمد سعید کرمانی اور ملک شوکت علی وغیرہ بھی لاہور سے گرفتار کر کے وہاں پہنچا دیئے گئے تھے۔ گورداسپور کے سیشن جج مسٹر ایم آر کیانی اور ڈپٹی کمشنر راجہ حسن اختر (مرحومین) کی سرپرستی نے جیل کے سکھ سپرنٹنڈنٹ کو گرفتار شدگان کے ساتھ نرم رویہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا

اسلامیانِ امرتسر کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ وہ گرفتاریوں پر گرفتاریاں پیش کرتے جا رہے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس تحریک کو منضبط طریقے سے چلانے کے لئے قدرت نے آسمان سے فرشتے بھیج دیئے تھے۔ کیونکہ سینکڑوں مسلمانوں کی گرفتاری کے باوجود مظاہرین کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا تھا

یہاں اس امر کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ اسیر کارکنوں کی اکثریت سفید پوش تھی چنانچہ ان کی گرفتاریوں سے متعدد گھرانوں میں معاشی مسائل پیدا ہو گئے تھے جن سے نمٹنے کے لئے گلی گلی میں چندے فراہم کئے جا رہے تھے اور نہ صرف گرفتار شدگان کے لئے خورد و نوش کی اشیاء تواتر کے ساتھ جیل میں پہنچائی جا رہی تھیں بلکہ نادار اسیروں کے بیوی بچوں کی غذائی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے امرتسر کے صاحب ثروت اصحاب میاں محمد امین پراچہ، میاں محمد شفیع، خان بہادر حبیب اللہ، ایس محمد دین مالک نیشنل نیپ، میاں غلام نبی، میاں نذیر احمد گھی والے، غلام محمد حصاریہ اور نکلسن روڈ لاہور میں قالینوں کا کاروبار کرنے والے ادارے صحاف کارپوریشن کے مالک خواجہ صلاح الدین کے والد حاجی قمر الدین، حاجی شاہ دین کے صاحبزادگان حاجی ظہیر الدین، حاجی شمس الدین شال مرچنٹ، شیخ عبدالغفور کرتال والے، میاں محمد شریف، خواجہ غلام حسن صراف، معراج الدین دھامی اور دوسرے مخیر مسلمانوں نے مالی ایثار کا ناقابلِ فراموش ثبوت دیا۔

دیہاتی مسلمانوں کی مہمان نوازی

مقامی انتظامیہ مسلمانوں کی دیوانہ وار گرفتاریوں سے اس حد تک عاجز آ چکی تھی کہ اب

مظاہرین کو حوالات یا جیل بھیجنے کے بجائے شہر کی آبادی سے دس دس پندرہ پندرہ میل دُور لے جا کر ویران مقامات پر چھوڑ دیا جاتا تھا تاکہ مظاہرین تھک ہار کر تحریک سے کنارہ کش ہو جائیں لیکن انتظامیہ کی ان تدبیروں سے کارکن بددل اور مایوس ہونے کے بجائے آس پاس کے دیہات میں پھیل جاتے تھے اور دیہی علاقوں کے مسلمانوں کی روایتی مہمان نوازی سے لُطف اندوز ہونے اور انہیں تحریکِ پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لینے کی تلقین کرنے کے بعد نئے عزم اور ولولے کے ساتھ جلوسوں میں شامل ہو جاتے تھے۔ جس سے ایک طرف دیہاتی مسلمان تحریکِ پاکستان کے مقاصد سے روشناس ہو رہے تھے تو دوسری طرف اس تحریک سے نوجوان طبقہ کی دلچسپی میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

اسلامیانِ امرتسر حصولِ پاکستان کی جدوجہد کے چراغ کو اپنے خُون کے آخری قطرے تک روشن رکھنے کا عزم صمیم کئے ہوتے تھے کہ امرتسر کی طرح پنجاب کے تمام اضلاع کی جیلوں کو مسلم لیگی کارکنوں نے بھر دیا۔

اہلِ لاہور کا جوش و خروش

اسلامیانِ لاہور نے بھی اس تحریک میں دل کھول کر جان و مال کے نذرانے پیش کئے اور اسلامیہ کالج لاہور کے طالب علم مسٹر عبدالمالک نے شہادت کا جام نوش کر کے مسلمانانِ لاہور کے خُون کو گرمایا۔

عبدالمالک شہید کی شہادت کا واقعہ بیان کرتے ہوتے روزنامہ نوائے وقت کے چیف ایڈیٹر جناب مجید نظامی (جو خود بھی اس جلوس میں شامل تھے) کہتے ہیں کہ مسلم لیگ کی تائید و حمایت میں لاہور کے مسلمان طالب علموں کا ایک جلوس آزادی کے نعرے لگاتا جا رہا تھا کہ لیڈی میکلیگن ٹریننگ کالج کے قریبی چوراہے میں ایم اے او کالج (جو تقسیم سے قبل ایس' ڈی' کالج کہلاتا تھا) کی چھت سے اس کالج کے ہندو طالب علموں نے جلوس کے شرکاء پر زبردست خشت باری

کی جس کے نتیجے میں ان کا کلاس فیلو عبدالمالک شہید ہوگیا۔

لاہور کے جن مسلم لیگی راہنماؤں اور کارکنوں نے اس تحریک میں نمایاں حصّہ لیا، ان میں خان افتخار حسین خان ممدوٹ، سردار شوکت حیات خان، میاں ممتاز محمد خان دولتانہ، میاں افتخار الدین، ملک فیروز خان نون، حمید نظامی، مولانا عبدالستار خان نیازی، میاں امیرالدین، علامہ علاؤالدین صدیقی، مولانا داؤد غزنوی، میاں بشیر احمد، میاں محمود علی قصوری، سید محسن شاہ، احمد سعید کرمانی، ملک شوکت علی، نوابزادہ رشید علی خان، سردار محمد ظفر اللہ، حکیم اللہ دتہ، شیخ خورشید احمد، چوہدری عبدالکبیر، چودھری عبدالکریم، گل محمد بٹ، مولانا غلام مرشد، ابوالحسنات سیّد محمد احمد قادری، مولانا محمد بخش مسلم، چودھری کلیم الدین، چودھری محمد حسین، امیر عبداللہ خان لوکڑی، ظہور عالم شہید، میاں محمد شفیع، عبدالسلام خورشید، مجید نظامی، سید نسیم حسن شاہ، میاں مشتاق احمد، ملک وزیر محمد، ابوسعید انور، اقبال شیخ، ملک محمد اختر، آفتاب قرشی، ڈاکٹر ضیاالاسلام، حمید الملکی، شباب مفتی، ریاض شاہد، تاج محمود چشتی، اورنگزیب خان، الطاف پرواز، صالح محمد صدیق، میاں منظر بشیر، میاں معراج دین، میاں ذکاالرحمان، میاں شجاع الرحمان، شیخ ظفر حسین، میاں سرفراز محمود، شیخ حفیظ، ظہور شیخ، ڈاکٹر الیاس مسعود، مسٹر بدیع الزمان، میاں محمد یوسف، محمد علی شمسی، سردار محمد بٹ، عالم نما، سید اور طاہر علی رضوی کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ایک روز کا واقعہ ہے کہ بیگم صغریٰ غلام حسین ہدایت اللہ (گورنر سندھ) کی قیادت میں لاہور کی مسلم خواتین نے سول سیکرٹریٹ پر ہلّہ بول دیا۔ جلوس میں شامل نوجوان لڑکیوں نے نہ صرف سرکاری افسروں کے دفتروں پر قبضہ کر لیا بلکہ ایک لڑکی محترمہ فاطمہ صغریٰ نے گورنر پنجاب کے دفتر کی چھت پر چڑھ کر وہاں سے یونین جیک اتار پھینکا اور اس کی جگہ مسلم لیگی پرچم لہرادیا۔ علاوہ ازیں خواتین نے اُس وقت کے آئی جی پولیس مسٹر بینٹ کو دفتر سے گھسیٹ کر باہر پھینک دیا اور اس کے منہ پر تھوکا۔ اس وقت کے ہوم سیکرٹری مسٹر میکڈانلڈ پر لڑکیاں اس طرح جھپٹیں کہ اُسے چھٹی کا دُودھ یاد دلا دیا۔

لاہور میں خواتین اور طالبات کے جلوسوں کو منظم کرنے میں بیگم شاہنواز، بیگم سلمیٰ تصدق حسین، فاطمہ بیگم، زینب کاکاخیل، بیگم گیتی آرا، فاطمہ صغریٰ، ناصرہ صدیقی اور متعدد طالبات نے اہم کردار ادا کیا۔

یہ سلسلہ جاری تھا کہ حکومت نے پنجاب کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی اس تحریک کی مقبولیت کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور ۲۷ فروری ۱۹۴۷ء کے روز پنجاب کی تمام جیلوں سے مسلم لیگی اسیروں کو رہا کر دیا گیا۔ چنانچہ امرتسر کے مسلمانوں کی خدمات کا اعتراف کرنے کے لئے ۲۸ فروری ۴۷ء کو صوبائی مسلم لیگ کی طرف سے میاں افتخار الدین، سردار شوکت حیات خاں اور میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ امرتسر تشریف لائے

جی ٹی روڈ پر واقع عیدگاہ کے میدان میں جلسہ ہوا جس میں سردار شوکت حیات خاں نے اپنے مخصوص جذباتی انداز میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "میں امرتسر تقریر کرنے نہیں آیا بلکہ اپنے جانباز بھائیوں کے قدم چومنے آیا ہوں۔"

اس سے اگلے روز صوبائی مسلم لیگ کی طرف سے تحریک کی کامیابی کی خوشی میں ۲ مارچ ۴۷ء کو "یوم فتح" منانے اور چراغاں کرنے کا اعلان کیا گیا

اسلامیان پنجاب ۲ مارچ ۴۷ء کے روز تحریک کی کامیابی کا بھرپور جشن فتح منانے میں محو تھے کہ متحدہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ سردار خضر حیات خاں ٹوانہ نے حالات سے مجبور ہو کر اسی شام استعفےٰ دے دیا۔ ان کے مستعفی ہونے کی خبر ریڈیو پر نشر ہوئی تو پنجاب بھر کے اُن گلی کوچوں میں (جن میں تحریک کے دوران خضر حیات مُردہ باد اور "ککڑا ککڑا بانگ دے" کے معنی خیز نعرے گونجتے تھے) مسلمانوں نے فرط مسرت سے بھنگڑے ڈالتے ہوئے "تازہ خبر آئی ہے خضر ہمارا بھائی ہے" کے نعرے لگانے شروع کر دیئے

○

آسمانِ امرتسر کے روشن ستارے
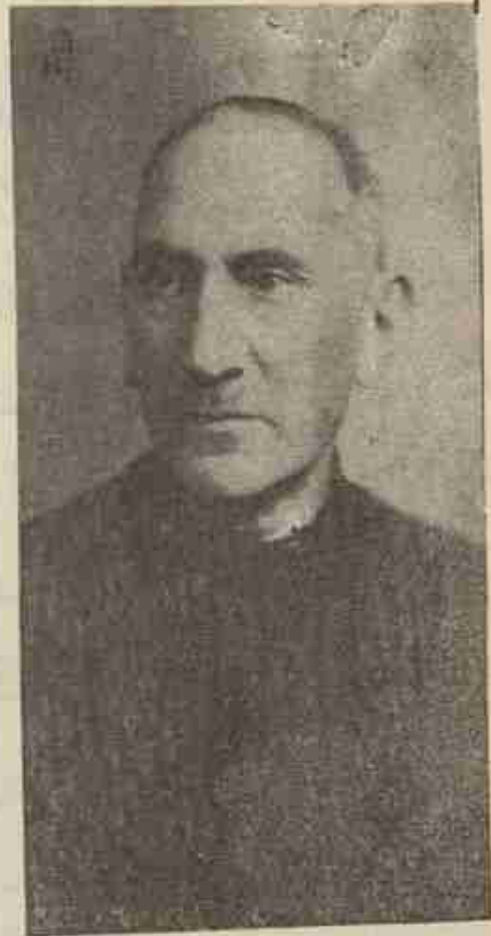
شیخ صادق حسن

میرانور سعید محمود

ملک غلام نبی

مولوی سراج الدین پال

شیخ عنایت اللہ

ذکی الدین پال

میاں محمد امین پیراچہ
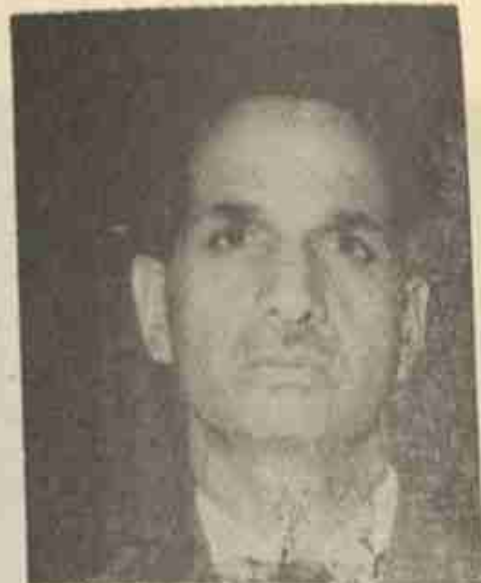
خواجہ غلام نبی لیڈر

خان عبداللہ خان

خواجہ محمد رفیق شہید

خواجہ امیرالدین
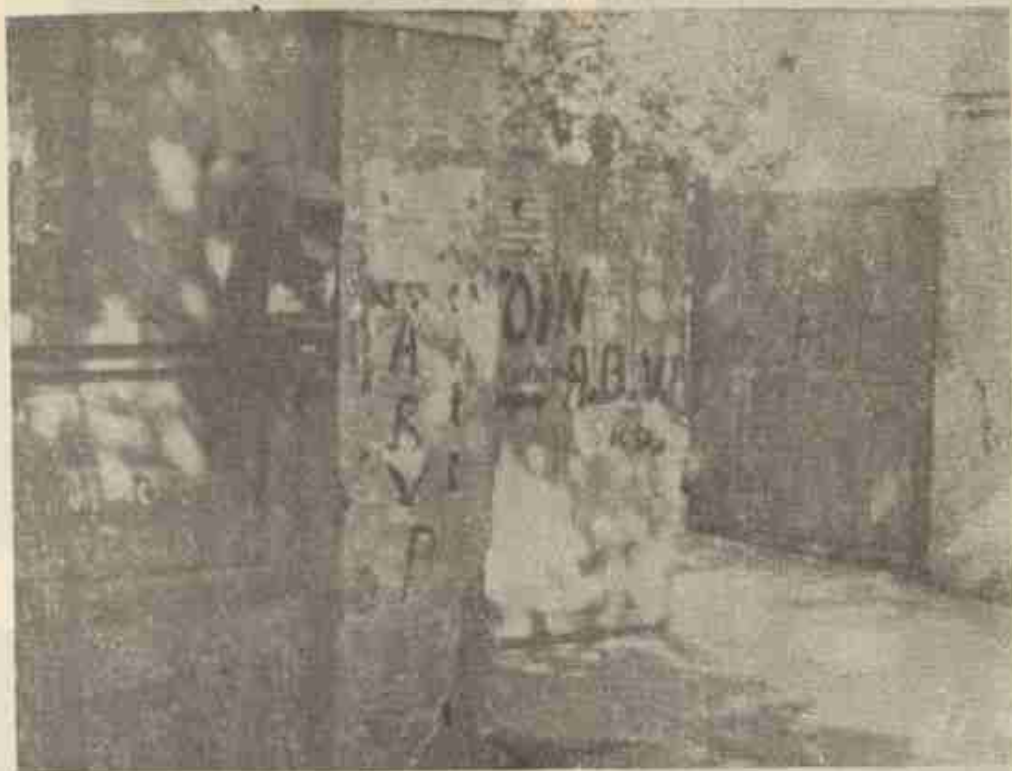
ایم، اے، او کالج امرتسر کا صدر دروازہ جو پاکستان کی حمایت میں طلبا کے جلوسوں کا نقطۂ آغاز تھا۔

ایم، اے، او کالج امرتسر کی عمارت کا نیا رُوپ۔ پُرانی عمارت فسادیوں نے جلا دی تھی۔

ایم اے او کالج امرتسر کے پرنسپل جناب دلاور حسین اور کالج کے استاد ڈاکٹر عبد الرؤف کمانڈر یونیورسٹی آفیسرز ٹریننگ کور (حال ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن محکمہ تعلیم پنجاب) کا طلبا کے ساتھ گروپ فوٹو

امرتسر کا شیر دل نوجوان ایاز محمود حاجی جس نے مسلم خواتین کے جلوس پر تشدد کرنے والے انگریز ایس پی رابنسن کا سر پھوڑ دیا۔

ہال بازار بجلی والے چوک اور ٹاؤن ہال کی درمیانی گزرگاہ جہاں مسلم خواتین کے جلوس پر تشدد کیا گیا

ٹاؤن ہال امرتسر میں واقع پولیس کا ہیڈ کوارٹر (کوتوالی) جہاں سول نافرمانی کی تحریک کے دوران مسلم لیگی کارکن خود کو گرفتاری کے لئے پیش کرتے تھے۔

ریالٹو سینما امرتسر جس کے چوراہے میں مسلم لیگی کارکنوں اور پولیس کے درمیان خوفناک تصادم ہوا۔

امرتسر کے ڈپٹی کمشنر کا دفتر جس پر چڑھ کر شریف پورہ کے جیالے مصطفٰے کالیا نے یونین جیک پھاڑا

امرتسر ڈسٹرکٹ جیل کی سنگین دیوار جس پر محمد شریف شہید نے گولیوں کی بوچھاڑ میں پاکستان کا پرچم لہرا لیا

جذبۂ انسانیت تھا اِس قدر سہما ہُوا
دوستوں کی مہربانی سے بھی ڈر جاتے تھے لوگ

دُوسرا باب

فسادات کا آغاز

اکالی پارٹی کے شترِ بے مہار ماسٹر تارا سنگھ نے جب تحریکِ پاکستان کو منزل کے قریب پہنچتے دیکھا تو ۳ مارچ ۱۹۴۷ء کو لاہور میں اسمبلی ہال کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر ننگی تلوار لہراتی اور "راج کرے گا خالصہ" کا نعرہ بلند کر کے "پنتھ خطرے میں ہے" کا اعلان کر دیا۔ اس موقعہ پر موچی دروازہ لاہور کے رکن اسمبلی ملک وزیر محمد اور دیگر مسلم لیگی کارکن ماسٹر تارا سنگھ کا مزاج درست کرنے کے لئے اپنی آستینیں چڑھا کر آگے بڑھے تو قائداعظمؒ کے دستِ راست نواب افتخار حسین خان ممدوٹ کی مداخلت سے معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ چنانچہ اس سے اگلے روز امرتسر کے اکالیوں نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت شہر کے مختلف چوراہوں میں منادی کرتے وقت بڑے اشتعال انگیز نعرے لگاتے۔

جو مانگے گا پاکستان
اس کو دیں گے قبرستان
نہیں بنے گا پاکستان
بن کے رہے گا سکھستان

یہ دلآزار منادی کرنے والے اکالیوں کا تانگہ جب ہال بازار کے گول ہٹی والے چوراہے میں پہنچا تو انہوں نے نوبت بجا کر لوگوں کو اکٹھا کیا اور مسلمانوں کے خلاف ایک

سکھ نے تقریر کی جس کے جواب میں سکھوں کی دوکان گول ہٹی کے مالکوں نے تانگے میں بیٹھے ہوئے اکالیوں کی طرف تلواریں اچھال دیں۔ چوک میں موجود رام باغ اور بجلی والے چوک کے مسلمانوں نے جب ان اکالیوں کو پاکستان کا تمسخر اڑاتے دیکھا تو انہوں نے جواباً

بن کے رہے گا پاکستان　　　　لے کے رہیں گے پاکستان

کا نعرہ لگایا۔ گول ہٹی کے چوراہے میں بھگدڑ مچ گئی۔ اکالیوں نے تانگے سے چھلانگیں لگا کر مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ مسلمان نہتے تھے۔ انہوں نے اینٹ، پتھر اور سوڈے کی بوتلوں سے مقابلہ کیا۔ پولیس آگئی اور بازار بند ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد یہ اندوہناک خبر جنگل کی آگ کی طرح تمام شہر میں پھیل گئی کہ نوآرے والے چوک سے گزرنے والے سات مسلمان راہگیروں کو شہید کرنے کے علاوہ گھنٹہ گھر (دربار صاحب) کے قریب سکھوں نے ایک مسلمان کو جوان کے ہاتھ کاٹ دیتے ہیں۔ یہ خبر لوگوں میں گشت کر رہی تھی کہ ہندو مہاسبھائی غنڈوں نے بازار خاکروباں کے قریب چوک پاسیاں میں ایک نہتے مسلمان کو سرِ بازار شہید کر کے اس کی لاش پر قبضہ کر لیا۔ اس محلّے کے ایک نوجوان شیخ حمید عرف "حمیدا" دوڑتے ہوتے قریبی مسلمان محلّے چوک فرید آتے اور امداد طلب کرتے ہوتے متذکرہ لاش کو گھسیٹ کرلے جانے کی اطلاع دی۔ چنانچہ مہاسبھائی غنڈوں کے قبضے سے اس شہید کی لاش واپس لینے کے لئے چوک فرید کے جیالے معراج دین عرف بھولا، انور ملٹو، ممص پہلوان مرحوم، نصیر خاں مرحوم، بشیر پہاڑیہ، مولوی حسن، رفیق گوٹے والا، جاوا، گوگی اور گامی وغیرہ کفن بردوش چوک پاسیاں کی طرف چل پڑے۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے دیکھا کہ ہندو اور مسلمان آمنے سامنے کھڑے نعرے لگا رہے تھے اور ہندوؤں سکھوں کے ہجوم کے قریب مسلمان شہید کی لاش پڑی تھی۔ دونوں گروہ کچھ کچھ وقفے بعد ایک دوسرے پر خشت باری بھی کر رہے تھے۔ اس اثناء میں بھولا، ملٹو اور ممص پہلوان مرحوم نے اپنے رفقاء سمیت زوردار نعرہ لگایا۔

"پانچ نعرے پنجتن کے ایک نعرہ حیدری" مسلمانوں نے جواب میں یک زبان ہو کر

پورے زور سے "یا علی" کہا اور بھولا، منٹو، مٹھ پہلوان اور نصیر خان مرحوم اپنے ساتھیوں سمیت چوک پاپیاں کی جانب کافروں پر پتھراؤ کرنے لگے۔

ابھی یہ سلسلہ شروع ہوتے چند لمحے گزرے ہوں گے کہ اینٹوں کا سٹاک ختم ہو گیا۔ چنانچہ ایک سوڈا واٹر کی دوکان (جو بند تھی) اسی وقت توڑ دی گئی اور مسلمانوں نے سوڈے کی بوتلیں برساتے ہوتے پیش قدمی شروع کر دی۔ مجاہدین کا حملہ کامیاب رہا اور ہندو سکھ بوکھلا کر پیچھے ہٹنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد چوک فرید کے ان نوجوانوں کی یلغار کی تاب نہ لاتے ہوتے غیر مسلموں کا ہجوم میدان چھوڑ کر بھاگ اٹھا۔

بھولا، منٹو وغیرہ نے آگے بڑھ کر شہید کی لاش کو اٹھا لیا اور چوک فرید کے ان بزرگوں کو (جو افواہوں پر یقین نہ کرنے اور پُرامن رہنے کی تلقین کر رہے تھے) شہید کی لاش دکھانے چل پڑے۔ یہ لوگ ابھی پشم والے چوک سے مڑ کر سبزی فروش مسلمانوں کی دوکانوں کے سامنے سے گزر رہے تھے کہ جھجو مصر کی گلی کے قریب چند ہندوؤں اور سکھوں سے سامنا ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی آس پاس کے مکانوں سے مسلمانوں پر پتھر برسنے لگے۔ چوک فرید کے متذکرہ نوجوانوں نے اس موقع پر چوک نرآرہ میں شہید کئے جانے والے سات مسلمانوں، دربار صاحب کے قریب مسلمان کوچوان کے ہاتھ کاٹنے اور کوچہ خاکروباں کے شہید کے خونِ ناحق کا بدلہ لے لیا۔ اس تصادم میں کام آنے والے غیر مسلموں کی کچھ لاشیں ملحقہ کنوئیں میں پھینک دی گئیں اور کچھ ریڑھی میں رکھ کر بیج ناتھ ہائی سکول اور بجلی گھر کے درمیان بہنے والے گندے نالے کی نذر کر دی گئیں۔

لیڈی ماؤنٹ بیٹن کی کھہ مکرنی

رات نصف سے زیادہ گزر چکی تھی لیکن شہر کے تمام لوگوں کو آج نیند نہیں آ رہی تھی۔ پولیس کی کچھ ٹولیاں مختلف بازاروں میں نمائشی گشت کر رہی تھیں۔ چوک فرید کے بھولا منٹو

اور نصیر خان مرحوم مختلف مسلمان محلّوں کی خیریت دریافت کر کے لوٹ رہے تھے کہ انہیں گرل ہٹی کے دروازے پر رام باغ کے چند مسلمان نوجوان پٹرول چھڑکتے دکھائی دیتے۔ انہوں نے قریب جاکر ان نوجوانوں کی اعانت کی اور اس طرح امرتسر کے سکھوں کی مشہور دوکان "گرل ہٹی" اور "بھراواں دی ہٹی" لاکھوں رُپے کے آرائشی سامان سمیت جل کر راکھ کا ڈھیر ہو گئی جس کے مالکوں نے ۴ مارچ ۴۷ء کے روز تانگہ میں بیٹھ کر منادی کرنے والے اکالیوں کی طرف تلواریں اُچھالی تھیں اور انہیں مسلمانوں کا قتل عام کرنے کی ترغیب دی تھی۔ الغرض اس رات ہندوؤں سکھوں نے بھی نہ صرف شہر کے بعض مقامات پر مسلمانوں کی دکانیں لوٹ لیں بلکہ مخلوط علاقوں میں بسنے والے مسلمانوں کو تشدد کا نشانہ بھی بنایا اور نمک منڈی کے قریب چند پونی چوک میں ایک بارہ سالہ مسلمان لڑکے لیاقت حسین عرف غازی (جو آج کل رآل پارک لاہور میں مقیم ہے) کے دونوں ہاتھ کاٹ دیتے گئے۔ یہی وہ نوجوان ہے جس کو بعد میں امرتسر کے سول ہسپتال میں لیڈی ماؤنٹ بیٹن نے زخمیوں کی مزاج پُرسی کرنے وقت دیکھا تو مصنوعی ہاتھ لگوا کر دینے کا اعلان کیا اور اخبارات نے اس خبر کو صفحہ اوّل پر جگہ دی تھی۔ مگر افسوس کہ لیڈی ماؤنٹ بیٹن کی یہ پیشکش ایشیائی محبوب کی کہہ مکرنی ہو کر رہ گئی وہ لڑکا (جواب جوان ہو چکا ہے) جب کبھی تنہائی کے عالم میں اپنے [illegible] کو دیکھتا ہے تو لیڈی ماؤنٹ بیٹن کے منہ سے نکلے ہوتے الفاظ کی صدائے بازگشت اس کے کانوں میں گونج اٹھتی ہے اور اس کی آنکھوں کے سامنے لیڈی اور مسٹر ماؤنٹ بیٹن کی ان ناانصافیوں کی تصویر ابھرنے لگتی ہے جو انہوں نے برصغیر کی تقسیم کے سلسلے میں مسلمانوں کے ساتھ روا رکھیں۔

بہرحال ۴ اور ۵ مارچ کی درمیانی شب امرتسر کے نہتے مسلمانوں نے انتہائی بے چینی کے عالم میں جاگ کر گزاری کیونکہ ان کے پاس اپنے تحفظ کے لئے نہ تو اسلحہ تھا اور نہ مہلک قسم کے ہتھیار جن کے ذریعے وہ اپنی مدافعت کر سکتے۔ کوئی ہاکی لے کر پہرہ دے

رہا تھا کوئی لاٹھی اور لوہے کا پائپ لے کر۔

سورج طلوع ہونے ہی شہر کے ہر محلے میں ڈیفنس کمیٹیاں بن گئیں۔ چندوں کی فراہمی شروع ہوئی اور ڈھلائی کی چھوٹی چھوٹی بھٹیوں سے لے کر کارخانے تک حرکت میں آ گئے۔ کہیں برچھیاں ڈھالی جا رہی تھیں تو کہیں دستی بم تیار ہو رہے تھے۔ کہیں خنجر اور تلواریں فروخت ہو رہی تھیں تو کہیں فولادی ٹوپیوں کی خرید کا بازار گرم تھا۔ اس کے برعکس ہندو سکھ بڑے مطمئن نظر آ رہے تھے کیونکہ وہ مسلمانوں کی طرح سر پر مصیبت آ جانے کے وقت سوچنے کے قائل نہیں تھے۔ انہوں نے تو بہار اور کلکتہ کے فسادات سے لے کر مسلم لیگ کی تحریک سول نافرمانی کے آخری ایّام تک اندر ہی اندر تمام تیاریاں مکمّل کر رکھی تھیں۔ اپنے علاقوں کو محفوظ کرنے کے لیے اپنی گلیوں کے باہر لوہے کے حفاظتی دروازے نصب کر لئے تھے اور بڑے بڑے ہندو سیٹھ' مہا سبھائی اور جن سنگھی تنظیموں کی دامے' درمے' قدمے' سخنے امداد کر رہے تھے۔ اس کے برعکس امرتسر کے مسلمان (جن کی غالب اکثریت سفید پوش تھی) اس سوچ میں ڈوبے ہوتے تھے کہ وہ بندوقیں اور پستول خریدنے کی استطاعت کہاں سے لائیں کہ ہندو سکھ سورماؤں نے پانچ' چھ اور سات مارچ ۴۷ء کے درمیان سوچے سمجھے منصوبے کے تحت شہر کے مسلمانوں کے متعدد قلیتی علاقوں پر منظّم حملے شروع کر دیئے مگر نہتے مسلمانوں نے ان کا نہایت بے جگری سے مقابلہ کیا۔ امرتسر کے تمام مسلمانوں کے پاس بمشکل دس پندرہ بندوقیں تھیں اور وہ بھی اس طرح کہ کسی محلے میں ایک' کسی میں دو' اور کسی میں کچھ بھی نہیں۔

اگر کچھ تھا تو اسلام اور پاکستان کے نام پر مر مٹنے کا لازوال جذبہ۔ چند برچھیاں اور گنتی کی چند تلواریں۔ اور یا پھر منڈیریں توڑ کر جمع کی ہوئی اینٹیں؟

اس کے برعکس غیر مسلم پوری طرح مسلّح تھے۔ ان کے پاس دولت تھی' اثر تھا' رسوخ تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کی پشت پر انگریز گورنر ایون جینکنز تھا جس نے مسلمانوں

پر ہتھیار نو در کنار چھڑی رکھنے پر بھی پابندی عاید کر رکھی تھی لیکن سکھوں کو کرپان لے کر برسرِ عام چلنے پھرنے کی آزادی دے رکھی تھی۔ علاوہ ازیں ایک مصدقہ اطلاع کے مطابق اُس انگریز گورنر نے ماسٹر تارا سنگھ کو امرتسر کے مسلمان ختم کرنے کے لئے تین روز کی کھلی چھٹی دی تھی اور کہا تھا

"ماسٹر جی - امید ہے آپ ان تین دنوں کی مہلت میں امرتسر کی مسلمان آبادی کو چٹکیوں میں مَسل کر رکھ دیں گے۔"

ماسٹر جی اپنے ہیڈ ماسٹر کی ہدایت کے مطابق لاہور کے اسمبلی ہال کی سیڑھیوں پر کرپان لہرانے کے بعد سیدھے گرو کی نگری پہنچ چکے تھے اور انگریز گورنر کی عطا کردہ تین دنوں کی مہلت سے فائدہ اٹھانے کی کوششوں میں مصروف تھے۔

مہاں سنگھ گیٹ کا مقابلہ

اس سلسلے کا اولین حملہ ۵ مارچ ۱۹۴۷ء کے روز مہاں سنگھ گیٹ کے مسلمانوں پر بھولا سنگھ کے بُرج کے اکالیوں نے کیا چنانچہ وہاں سے سکھوں کا ایک مسلح جتھہ نکلا اور اس نے پہلے نو بودی سائیں کے تکیہ کے ضعیف العمر مسلمانوں کو تہ تیغ کیا۔ پھر یہ دوسرے محلوں کی طرف بڑھا۔

کڑہ مہاں سنگھ، کوچہ ڈبگراں، جیل منڈی اور ملحقہ گلی کوچوں کے مسلمانوں نے حملہ آوروں کی پیش قدمی روکنے کے لئے اینٹیں برسانی شروع کر دیں۔ حملہ آور چونکہ بندوقوں، برچھوں اور تلواروں وغیرہ سے مسلح تھے اس لئے انہیں آگے بڑھنے میں دقت پیش نہ آئی۔ یہ سلسلہ ابھی جاری تھا کہ مہاں سنگھ گیٹ کے شیر دل مسلمان (جن میں چودھری عبدالقادر، مرزا بیضا خاں کے فرزند مرزا احمد حسن، دین ماشکی، شفیع گاڈی، حامد بٹ، اکرام بٹ، عبداللہ جان، ناظر، محمد بخش، اسحاق قریشی، رشید کالو، محفوظ الحق خان، بٹ سویٹ مارٹ میکلوڈ روڈ لاہور کے

مالک حاجی نذیر بٹ کے والد غلام قادر بٹ، بڑے بھائیوں عبدالمجید بٹ، عبدالحمید بٹ، ضیا دھامی، مرتضیٰ دھامی اور دیگر محلے دار اپنے سروں پر کفن باندھ کر نہتے ہی حملہ آوروں کی صفوں میں گھس گئے۔

اس پاس کے مکانوں کی چھتوں سے اس علاقے کے ایک متمول تاجر امیر خان کھڈیاں والے، احسان قریشی صابری (سابق پرنسپل گورنمنٹ کمرشل کالج سیالکوٹ) اور محکمہ جنگلات کے رینج آفیسر سید نور شاہ نے فائرنگ کر کے حملہ آوروں کو پیش قدمی سے روکا۔

چودھری عبدالقادر (جو قادر باٹا والا کے نام سے مشہور تھے اور آج کل بیڈن روڈ پر رہتے ہیں) امرتسر کے پُرجوش نوجوانوں میں سے تھے۔ وہ حملہ آوروں کی صف میں اُچھل ہوتے ہی انہیں اینٹ مارنے کے خیال سے زمین پر پڑی ہوئی اینٹ اٹھانے کے لئے جُھکے ہی تھے کہ ایک گرانڈیل سکھ جتھیدار اُچھل کر قریب پہنچا اور چودھری قادر کی گردن پر اس زور سے تلوار ماری کہ ایک ہی وار میں ان جیسے کڑیل جوان کی نصف گردن کٹ گئی اور وہ بیدم ہو کر گر پڑے۔ ان کے بعد دین ماشکی بھی بُری طرح زخمی ہوتے۔ مسلمان یہ کیفیت دیکھ کر نئے عزم اور ولولے کے ساتھ حملہ آوروں پر جھپٹ پڑے۔ دشمن کے اوسان خطا ہو گئے اور ایک سکھ حملہ آور اپنی ہی تلوار سے اپنی گردن کٹوا بیٹھا۔

یہ لڑائی جاری تھی کہ شفیع گاڈی نے بھی شہادت کا جام پی لیا۔ اپنے اس شہید بھائی اور زخمیوں کو خون میں لت پت دیکھ کر سب کے سب مسلمان میدانِ کارزار میں کود پڑے۔

اس موقع پر جس بہادری سے انہوں نے حملہ آوروں کو لوہے کے پاپڑ مارے اور میدان سے انہیں دُم دبا کر بھاگنے پر مجبور کیا وہ ایک الگ داستان ہے۔

چوک فرید کا معرکہ

پھولا سنگھ کے برج کے اکالیوں کا حملہ دشمنانِ پاکستان کو کافی مہنگا پڑا تھا۔ چنانچہ اس پٹائی کے بعد دوسرا منظم حملہ ۶ مارچ ۱۹۴۷ء کے روز چوک فرید کے سرفروش مسلمانوں

پر ہوا۔ ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ یہ سب حملے کرفیو کے دوران مسلمانوں کے علاقوں پر ہو رہے تھے تاکہ دوسرے محلوں کے مسلمان ان کو کمک نہ پہنچا سکیں۔

مشہور اکالی لیڈر اودھم سنگھ ناگوکے اور امرتسر کے بدنام غنڈے بجلی پہلوان کے لڑکے مدن عرف مدّی پہلوان کی قیادت میں سینکڑوں فسادیوں پر مشتمل جلوس امرتسر کے گولڈن ٹمپل سے نکلا۔ یہ جلوس گرو بازار، کرموں ڈیوڑھی اور کٹڑہ جیمل سنگھ سے ہوتا ہوا پشم والے بازار میں پہنچ چکا تھا۔ سب سے آگے ایک سکھ جتھیدار ہاتھ میں چمکیلا برچھا لئے تھا۔ اس کے پیچھے جن سنگھی، مہا سبھائی غنڈے، اکالی سینا کے رضاکار اور متعدد ہندو سکھ فرقہ پرست ہاتھوں میں بندوقیں، پستول، تلواریں اور پٹرول کے کنستر اٹھائے چوک فرید کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ادھر چوک فرید کے مسلمانوں نے اس آنے والے خطرے کا الارم سن لیا تھا۔ چوک فرید کے نصیر خان مرحوم اپنے رفقاء کے ہمراہ ڈاکٹر حفیظ طوسی، میاں محمود اور شیخ عبدالرحیم (جو اسی محلے میں رہتے تھے) کے مکانوں کی طرف ان سے بندوقیں مستعار لینے کے لئے سرپٹ دوڑ رہے تھے۔ حملہ آوروں کی پیش قدمی روکنے کے لئے ایک طرف حکیم غلام قادر کے دواخانے کے اوپر والے مکان سے تار گھر امرتسر کے مکینک مسٹر محمد رمضان کی بہادر بیوی اینٹیں برسا رہی تھی تو دوسری طرف سڑک کے دوسرے کنارے پر واقع مسجد کوتوال کی چھت سے امرتسر کے مشہور شاعر بیدل امرتسری حملہ آوروں کو مٹی کے لوٹے مار رہے تھے۔

مُص پہلوان کی شجاعت

حملہ آور چوک فرید کے قریب پہنچے تو سب سے پہلے چوک فرید کے غلام مصطفیٰ عرف مُص پہلوان مرحوم (لاہور آکر فوت ہوئے، ان کا مزار ٹکسالی دروازے کی دیام شالہ کے پاس ہے) ہاتھ میں برچھا لئے میدان میں اترے اور حملہ آوروں کے سرغنہ

سکھ جتھیدار کو للکارا (جو مُص پہلوان کی طرح ہی کڑیل جوان تھا) یوں لگتا تھا جیسے دو خونخوار شیر پنجرے سے نکل آتے ہیں اور ایک دوسرے کا خون پینے اور تکہ بوٹی کرنے پر تُلے ہوتے ہیں۔ مقابلہ برابر کا تھا۔ پہلے سکھ جتھیدار نے مُص پہلوان پر وار کیا۔ مُص پہلوان نے اس خطرناک وار سے اپنے آپ کو اس خوبصورتی سے بچایا کہ دیکھنے والے انگشت بدنداں رہ گئے۔ یہ لڑائی چوک فرید کے مشرقی حصے شمشاد، امتیاز، ممتاز اور شہناز طوائفوں کے مکان کے پاس ہو رہی تھی کہ سکھ جتھیدار کے اوّلین وار کے جواب میں مُص پہلوان نے ایک بھرپور وار کیا۔ دونوں کے برچھے آپس میں زور سے ٹکرائے جس کے نتیجے میں سکھ جتھیدار کے ہاتھ سے برچھا گر پڑا۔ چنانچہ مُص پہلوان نے جتھیدار کے پیٹ میں برچھا گھونپ دیا۔ وہ سنبھالا لینے لگا تو مُص پہلوان نے بجلی کی تیزی سے اس کے پیٹ سے برچھا نکال کر چشم زدن میں دوسرا وار کیا جس کے نتیجے میں حملہ آوروں کا سرغنہ سکھ دھڑام سے زمین پر گر گیا۔ اس کے گرتے ہی حملہ آوروں نے مُص پہلوان کی طرف دونالی بندوقوں کے رُخ پھیر دیئے۔ مگر مُص پہلوان تھے کہ چھرّوں سے چھلنی ہونے کے باوجود اپنے برچھے کے جوہر دکھا رہے تھے۔ ان کے عقب میں اور دائیں بائیں ان کے رفقاء جن میں نصیر خان، نثار خان، خواجہ حفیظ، امین، سعید جولی، خواجہ ضیاء، برکت قصائی، حامد حسن، لطیف پٹھان، خواجہ محمد اسلم، حسّہ، گامی، علی شاہ، جلال دین، اکرم عرف بچھو، غلام محمد عرف بلا پہلوان، قادر نائی، ڈوڈا پہلوان، حکیم محمد موسیٰ، کوچہ نور شاہ کے منظر شاہ اور ملحقہ گلیوں کے متعدد نوجوان سیسہ پلائی دیوار بن کر ڈٹے ہوتے تھے۔ یہ معرکہ خیز تصادم جاری تھا کہ ایک گولی برکت قصائی کی ٹانگ پر لگی جس سے وہ لڑکھڑا کر گر پڑے۔ ان کو گرتے دیکھ کر مسلمانوں کی طرف سے نصیر خان مرحوم، نثار خان مرحوم اور بزرگ شاہ کے ٹال کے لطیف پٹھان نے ڈاکٹر حفیظ طوسی، میاں محمود اور شیخ عبدالرحیم سے مستعار لی ہوئی بندوقوں سے تڑاتڑ تڑاتڑ جواباً فائرنگ کی جس کے نتیجے میں دو سکھ اسی وقت واصل جہنم ہو گئے۔ اس کے بعد گنج

کی موری کے نامور کھلاڑی حامد حسن کی آنکھ پر گولی لگی (وہ امرتسر کے نامی گرامی نوجوان تھے اور ریلوے میں ملازم تھے) حامد حسن جیسے خوبصورت جوان کی آنکھ سے خون بہتا دیکھ کر شیخ عبدالکریم کے لڑکے مسٹر جمید کی اہلیہ کی حرکتِ قلب بند ہو گئی۔ حامد حسن کی آنکھ ضائع ہونے کے دلخراش منظر نے مسلمانوں کی آتشِ انتقام کو بھڑکا دیا۔ وہ عقابی انداز میں حملہ آوروں پر جھپٹے اور دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے دو مزید حملہ آوروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ کوچہ نور شاہ کے مسٹر شاہ (خالی ہاتھ) گولیوں اور چھروں کی بوچھاڑ کی پرواہ کئے بغیر ایک بندوق بردار سکھ کی طرف سینکڑوں چھرے کھاتے اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ انہوں نے اس سکھ کی دونالی بندوق چھین کر حکیم الامت علامہ اقبالؒ کے اس شعر میں حقیقت کا رنگ بھر دیا ؎

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

خواجہ حفیظ مرحوم نے بھی اس موقع پر مثالی جرأت کا ثبوت دیا اور مسکراتے ہوئے شہادت کا جام نوش کیا۔ ان کے علاوہ امین نامی نوجوان (جو آجکل بارود خانہ لاہور میں مقیم ہیں) غلام نبی بیپ (جو رام گلی لاہور میں مقیم ہیں) اور بہت سے بہادر محلے داروں نے اپنی چھاتیوں پر گولیوں، چھروں اور برچھوں کے زخم کھائے اور اس وقت تک چین نہ لیا جب تک دشمن میدان سے بھاگنے پر مجبور نہ ہو گیا۔

اس تصادم میں مسلمانوں کی طرف سے خواجہ حفیظ شہید ہوئے اور حملہ آوروں کے پانچ آدمی غارت ہوئے۔ چنانچہ دشمن کی پسپائی کے بعد مُص پہلوان زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے بیہوش ہو گئے۔ لوگوں نے انہیں چارپائی پر لٹا کر اٹھایا تو محلے کی مستورات فرطِ جذبات سے مغلوب ہو کر نہ صرف خوشی کے آنسو بہا رہی تھیں بلکہ اپنے مکانوں کی چھتوں اور کھڑکیوں سے اپنے سروں کے دوپٹے اس مردِ مجاہد کی چارپائی پر نچھاور کر کے دعائیں دے رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں کہ مُص پہلوان خدا تجھے اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ تو نے اپنی جان پر کھیل کر

ہماری عزتوں اور عصمتوں کو بچایا ہے' ہماری دعا ہے کہ باری تعالیٰ تجھے عمر دراز عطا فرماتے اور ہماری عمریں تجھے لگا دے۔

مُس پہلوان کو اہل محلہ ڈاکٹر عبدالحفیظ کے کلینک میں لے گئے (جو لاہور کارپوریشن کے ہیلتھ آفیسر رہ چکے ہیں اور آجکل نسبت روڈ پر مقیم ہیں) ڈاکٹر عبدالحفیظ کے بیان کے مطابق انہوں نے اپنے بھتیجوں محمد حنیف' محمد انور اور میڈیکل کالج کے دو طالب علموں محمد رفیق اور لقمان وغیرہ کے تعاون سے مُس پہلوان کے جسم سے ۲۷ کے قریب چھرے نکالے جس کے بعد قدرت نے اسلام اور پاکستان کے نام پر فدا ہونے کا عزم بالجزم رکھنے والے اس غیرت مند فرزند کو دوبارہ زندگی دے دی۔ ڈاکٹر عبدالحفیظ نے مُس پہلوان کے علاوہ اس محلے کے دیگر زخمی مسلمانوں کو جس جانفشانی سے بلا معاوضہ طبی امداد مہیا کی اس سے نہ صرف ان کی عزت' عظمت اور شہرت کو چار چاند لگے بلکہ انہیں مقامی پولیس کی سختیوں کا نشانہ بھی بننا پڑا جس کی انہوں نے کوئی پرواہ نہ کی

کٹڑہ جیمل سنگھ کی بے زبان بکری

چوک فرید کی اس تاریخی پٹائی کے بعد حملہ آور واپس جاتے ہوتے جب پشم والے بازار سے گزر رہے تھے تو انہوں نے آریہ سماج سے ملحقہ کوچہ بیم والا (مصنف کی جائے پیدائش) کے مسلمانوں کے ساتھ بھی زور آزمانا چاہا مگر معراج دین بٹ' غنی پہلوان اور دیگر محلے داروں نے سوڈے کی دو بوتلیں برسائیں کہ حملہ آوروں کے منہ پھیر کے رکھ دیتے

بلوائیوں کی خوش قسمتی تھی کہ چوک فرید کے مقابلہ کے موقع پر اس محلے کے دو نامور جیالے بھولا اور منٹو اس وقت اپنے محلہ میں موجود نہ تھے۔ وہ دونوں اس حملے سے تھوڑی دیر قبل ایک مسلمان سپاہی کے ذریعے منٹو کے والدین کے بھیجے ہوئے پیغام کے جواب میں ہی پہلوان مرحوم جانی اور انارکلی لاہور کے وکٹری ٹرنک ہاؤس کے مالک رفیق خواجہ دہر کی ہمراہی میں ہندو

آبادی کرموں ڈیوڑھی (سندوک سر) کے خطرناک علاقہ میں گئے ہوئے تھے۔ منٹو، بھولا اور دیگر مجاہدین منٹو کے والدین کو وہاں سے بحفاظت نکال کر چوک فرید پہنچے تو انہیں اس خوفناک تصادم کی تفصیل معلوم کر کے جہاں مسلمانوں کی شجاعت سے خوشی ہوتی وہاں اس بات کا ملال بھی ہوا کہ وہ اس موقع پر اپنے جوہر نہ دکھا سکے۔

حملہ آور چوک فرید سے واپس ہوتے تو انہوں نے "کھسیانی بلی کھمبا نوچے" کے مصداق کٹڑہ جیمل سنگھ کے مسلمانوں کی بے شمار دکانوں کو (جو کرفیو کے باعث بند تھیں) نذر آتش کر کے اپنی خفت مٹائی اور اس طرح امرتسر میں آتشزدگی کی سب سے بڑی واردات ہوئی جس کے نتیجے میں مسلمانوں کو لاکھوں روپے کا نقصان ہوا۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ کچھ دنوں کے بعد جب قدرے امن ہوا اور کرفیو کی پابندیاں نرم ہوئیں تو کٹڑہ جیمل سنگھ میں شہاب الدین عرف شہابہ فالودے والے کی دوکان (جو جل چکی تھی) کے ملحقہ مکان کی جلی ہوئی دیوار کے ساتھ ایک بے زبان بکری لوہے کی زنجیر کے ساتھ بندھی لٹک رہی تھی اور ہندو سکھ سورماؤں کے میدان سے فرار کے وقت کی لگائی ہوئی آگ میں جھلس چکی تھی۔ لوگ اس بے زبان کی حسرتناک موت پر طرح طرح کے تبصرے کر رہے تھے اور اس کے خاکستر کو دیکھ کر عدم تشدد کے نام نہاد دعویداروں کے اس "کارنامے" پر تاسف کا اظہار کرتے ہوئے اس کی آخری تڑپ کا تصور کر کے کانوں کو ہاتھ لگا رہے تھے۔ انہی دنوں کٹڑہ جیمل سنگھ کے مسلمانوں کی قیمتی املاک کے کھنڈروں کو دیکھنے کے لئے روزنامہ نوائے وقت کے بانی حمید نظامی مرحوم بھی بزرگ صحافی حاجی صالح محمد صدیقی اور دیگر صحافیوں کے ساتھ لاہور سے امرتسر آئے۔ حاجی صالح محمد صدیقی (جو آج بھی نوائے وقت سے وابستہ ہیں) کے بیان کے مطابق صحافیوں کی اس جماعت نے امرتسر کے انگریز ڈپٹی کمشنر سے تباہ شدہ علاقہ دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو انہوں نے نامساعد حالات کے پیش نظر اس علاقہ کا دورہ منسوخ کرنے کا مشورہ دیا۔ لیکن حمید نظامی مرحوم فساد زدہ علاقوں کا معائنہ کرنے پر مصر رہے چنانچہ صحافیوں کی یہ جماعت فوجی ٹرک میں سوار ہو کر کٹڑہ جیمل سنگھ پہنچی تو بڑی

بڑی عمارتیں زمین بوس ہو چکی تھیں۔ حاجی صاحب کے ارشاد کے مطابق ان کا ٹرک کریموں ڈیوڑھی میں داخل ہوا تو حمید نظامی مرحوم نے ٹرک ڈرائیور سے کہا کہ گاڑی روکو۔ ڈرائیور نے بریک لگائی تو حمید نظامی نے ٹرک سے چھلانگ لگا دی اور دوڑ کر ایک موٹی سی کتاب سینے سے لگا لی۔ حاجی صاحب حمید نظامی مرحوم کے قریب پہنچے تو نظامی صاحب پانی میں بھیگے ہوئے قرآن پاک کو چوم رہے تھے، آنکھوں سے لگا رہے تھے۔ اور مسلمانوں کے اس تجارتی مرکز کی تباہی پر آنسو بہا رہے تھے۔

چوک پراگ داس کا المیہ

چوک فرید کے ۱۶ مارچ ، ۱۹۴۷ء والے مذکورہ بالا واقعہ سے ایک روز قبل حالات کی صحیح نبض شناسی کرتے ہوئے شیخ صادق حسن مرحوم کی صدارت میں ایم اے او کالج کے بریڈ لو ہال میں اسلامیان امرتسر کا ہنگامی اجلاس منعقد ہو چکا تھا۔ اس میں میاں محمد امین، مولوی سراج الدین پال، ملک غلام نبی، میر انور سعید محمود، خلیفہ احمد دین، شیخ عنایت اللہ، گاماں پہلوان، چودھری ظہور الدین پال، خان عبداللہ خان، خواجہ امیر الدین، خواجہ غلام نبی لیڈر، شیخ غلام محی الدین، ڈاکٹر محمد عبداللہ، مولانا اسمٰعیل غزنوی، ذکی الدین پال، عبداللہ منہاس، حاجی ثناء اللہ، خان محمد خاناں، ملک عبید اللہ، نصیر خان، محی الدین بٹ، لالہ منو، چاچا مصطفٰے، خورشید دائیں، فتح محمد سلیم، خواجہ مصطفٰے، مسٹر سلجی، میاں اللہ دتہ، شیخ آفتاب احمد، محمد حسین سائیاں، عبداللہ خلدی، چوہدری نصر اللہ خان، ملک محمد انور، خان بہادر حبیب اللہ، میاں محمد اسلم، میاں محمود احمد، مسٹر احسن، غلام نبی بٹ، غلام حسن گلگشن، خواجہ محمد رفیق اور دیگر عمائدین شہر یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ جس قدر جلد ممکن ہو ان آبادیوں سے مسلمانوں کو فی الفور نکال لیا جائے جو ہندوؤں سکھوں کے اکثریتی علاقوں میں گھری ہوئی ہیں۔ اسی روز متعدد لاریاں اس مقصد کے لئے متعلقہ علاقوں میں بھیج دی گئی تھیں اور بہت سے مسلمانوں کو ان کے اہل و عیال سمیت وہاں سے نکال کر محفوظ مقامات پر پہنچا دیا

گیا تھا۔ چوک پراگ داس اور چوک متاں سنگھ کی ملحقہ آبادی جزیرے کی طرح چار اطراف سے ہندوؤں سکھوں کے ہزارہا مکانوں میں گھری ہوئی تھی۔ اس علاقے کی مسلم آبادی کو وہاں سے نکالنے کے لئے لاریاں لے کر سب سے پہلے امرتسر مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری میر انور سعید محمود اور سالار اعلیٰ مسلم لیگ نیشنل گارڈ خواجہ امیر الدین (جو نعت رُوڈ لاہور کے سابق بی ڈی ممبر خواجہ عزیز الدین اور بیڈمنٹن کے انٹرنیشنل کھلاڑی اور پیشل ہینڈلنگ ایجنسی پی آئی اے لاہور ایئرپورٹ خواجہ صلاح الدین کے والد تھے)

متعدد رضاکاروں سمیت وہاں پہنچے۔ تھوڑی دیر کے بعد عبداللہ خان، جمال بٹ اور مسٹر ذکی الدین پال بھی اپنے رفقا سمیت لاریاں لے کر پہنچ گئے۔ انہوں نے اس محلہ کے سرکردہ لوگوں کو محفوظ مقامات پر منتقل ہونے کا مشورہ دیا تو چوک پراگ داس کی اونچی مسجد کے مولوی محمد یوسف اور دیگر معززین علاقہ نے یہ کہہ کر وہاں سے منتقل ہونے سے انکار کر دیا کہ محلّے کے سرکردہ ہندوؤں سکھوں کے ساتھ ہمارا "معاہدہ امن" ہو چکا ہے اور وہ ہماری حفاظت کا ذمّہ لے چکے ہیں اس لئے آپ لوگ بے فکر رہیں وہ ہمیں کچھ نہیں کہیں گے۔ چنانچہ طوعاً کرہاً اس محلے کے جتنے بھی دُور اندیش اور معاملہ فہم مسلمان اپنے بیوی بچّوں سمیت لاریوں میں بیٹھ سکے انہیں وہاں سے محفوظ مقامات پر پہنچا دیا گیا۔ جو لوگ اپنے آپ کو محض نیشلسٹ ہونے یا مجلسِ احرار کے ساتھ اپنی وابستگی کو اپنی حفاظت کی ڈھال سمجھتے تھے یا ہندوؤں سکھوں کے متعلق ضرورت سے زیادہ خوش فہمی رکھتے تھے وہیں رہ گئے۔ میر انور سعید محمود، خواجہ امیر الدین، عبداللہ خاں، جمال بٹ اور مسٹر ذکی الدین پال وغیرہ بے شمار مسلمانوں کو لاریوں میں بٹھا کر جب وہاں سے روانہ ہوتے تو راستے میں کسی جگہ اس کارواں پر فائرنگ اور خشت باری کی گئی مگر یہ لوگ وہاں سے بخیریت نکل گئے۔ انہیں وہاں سے روانہ ہوتے ابھی تھوڑی ہی دیر گذری ہوگی کہ چوک پراگ داس کے چند سکھ (جن میں مہندر سنگھ اور دھیان سنگھ پیش پیش تھے) ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مولوی محمد یوسف کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ

ہم اپنے کئے ہوئے عہد کے مطابق گزشتہ دو تین روز سے آپ لوگوں کی دن رات رکھوالی کر رہے ہیں۔ لیکن ہمیں پتہ چلا ہے کہ آپ لوگوں نے مسجد میں بہت سا اسلحہ، بندوقیں اور بم وغیرہ چھپا رکھے ہیں۔ اگر یہ اطلاع درست ہے تو وہ اسلحہ ہمارے پاس جمع کرا دیں یا ضائع کر دیں ورنہ محلے کے بعض جوشیلے لوگوں کے سامنے ہم بے بس ہو جائیں گے۔ لہٰذا آپ لوگ مسجد اور بعض مشکوک گھروں کی تلاشی دے دیں۔

مہندر سنگھ اور دھیان سنگھ کا تیر نشانے پر بیٹھا اور مولوی محمد یوسف دیگر معززین محلہ سمیت انتہائی سادگی سے ان کے جھکمے میں آ گئے۔ انہوں نے مسجد اور "مشکوک گھرانوں" کی تلاشی دے دی۔ انہیں تلاشی دیتے ابھی چند لمحے ہی گزرے ہوں گے کہ بازار متاں سنگھ میں ایک ضعیف العمر مسلمان گوالن کو سڑک کے کنارے شہید کر دیا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد چوک پراگ داس کے قریب سکھوں نے غلام محمد عرف جندو ابکردان کو شہید کر دیا۔ اس کے بعد اسی بازار کے ملحقہ طویلے سے مسلمان کوچوانوں کے خالی تانگے نکال کر جلا دیئے گئے اور ان شعلوں میں جندو نامی مسلمان کی سسکتی لاش پھینک دی گئی۔ قتل کی ان بہیمانہ وارداتوں نے اگرچہ مولوی محمد یوسف اور دیگر محلے داروں کی آنکھیں کھول دی تھیں لیکن اب پچھتائے کیا ہوت، جب چڑیاں چگ گئیں کھیت کے مصداق تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ میر انور سعید محمود، خواجہ امیر الدین، عبداللہ خان، جمال بٹ اور مسٹر ذکی الدین پال بہت سے لوگوں کو محفوظ مقامات پر لے جا چکے تھے۔

مولوی محمد یوسف سینکڑوں مسلمانوں سمیت نہ صرف معاہدۂ امن کے جال میں بری طرح پھنس چکے تھے بلکہ مہندر سنگھ اور دھیان سنگھ وغیرہ کے کہنے پر اونچی مسجد اور دیگر مسلمانوں کے گھروں کی تلاشی بھی دے چکے تھے۔ اب ان سب کے لئے وہاں سے نکلنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ تاہم انہوں نے حالات کو مخدوش ہوتے دیکھا تو جندو ابکردان اور مسلمان گوالن کے ساتھ کئے گئے سلوک کا تذکرہ معاہدہ امن کے محرک سے کیا تو اس نے جواباً کہا کہ "یہ حرکت دوسرے بازار میں ہوتی ہے۔ آپ لوگ بالکل بے فکر رہیں۔ آپ کی حفاظت کا

ہم نے ذمہ لیا ہے اور ہم اپنے قول پر پورے اتریں گے۔"

۶ اور ۷ مارچ ۴۷ء کی درمیانی شب گرو رام داس کی سرائے جیسی مقدس عبادت گاہ میں ہندوؤں سکھوں کا زبردست اجتماع ہوا جو نصف شب تک جاری رہا۔ اس اجلاس میں گزشتہ دو روز کے منظم حملوں کی ناکامی کے اسباب پر غور کیا گیا۔ نیز مقررین نے متعدد سکھ ریاستوں کپورتھلہ، نابھہ، پٹیالہ، فرید کوٹ اور مختلف اضلاع سے بلائے ہوئے سکھ فوجیوں، دیہاتی بدمعاشوں، مہاسبھائی غنڈوں اور جن سنگھی درندوں کو خطاب کرتے ہوئے مسلمانوں کے عہدِ حکومت کے ہندوؤں سکھوں پر ڈھائے گئے مفروضہ مظالم کی داستانیں سنائیں اور ان کے جذبات کو بھڑکایا۔

رات نصف سے زیادہ گزر چکی تھی اور گرو رام داس کی سرائے قاتلوں کی سازشوں کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ امرتسر کے باہر سے آئے ہوئے سکھ بدمعاشوں اور سابق فوجیوں کو مختلف ٹولیوں کی صورت میں تقسیم کر کے ہدایات دی جا رہی تھیں اور ان کی رہنمائی کے لئے مختلف محلّوں کے ہندو سکھوں کو مامور کیا جا رہا تھا کہ وہ ان ٹولیوں کو پَو پھٹنے سے کچھ دیر قبل اپنے اپنے گلی کوچوں میں لے جا کر مسلمانوں کے گھروں کی نشاندہی کر کے ان کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دیں۔ چنانچہ ابھی پَو پھٹنے میں چند لمحے باقی تھے کہ مولوی محمد یوسف کے ساتھ معاہدۂ امن کرنے والے عیّار محلّے دار سینکڑوں مسلح ہندو سکھ غنڈوں کی معیت میں چوک پراگ داس اور چوک منّاں سنگھ میں دبے پاؤں داخل ہوئے اور سب سے پہلے کٹڑہ رام گڑھ کی اس مسجد کا محاصرہ کیا جو اونچی مسجد کے نام سے مشہور تھی۔ اس مسجد میں محلّہ کی نوجوان لڑکیاں، بچے، عورتیں اور مرد (جن کی تعداد پندرہ بیس کے لگ بھگ تھی) چھپے ہوئے تھے۔ فسادیوں نے بندوقیں، اور برچھیاں لہرا کر اس مسجد کا محاصرہ کر لیا اور اس کے بعد پٹرول کے کنستر انڈیل کر آگ لگا دی۔ مسجد میں موجود مردوں، عورتوں، لڑکیوں اور بچوں میں سے بعض نے آگ کے شعلوں اور دھوئیں سے گھبرا کر جب باہر نکلنے کی کوشش کی

خانۂ خدا کی بے حرمتی
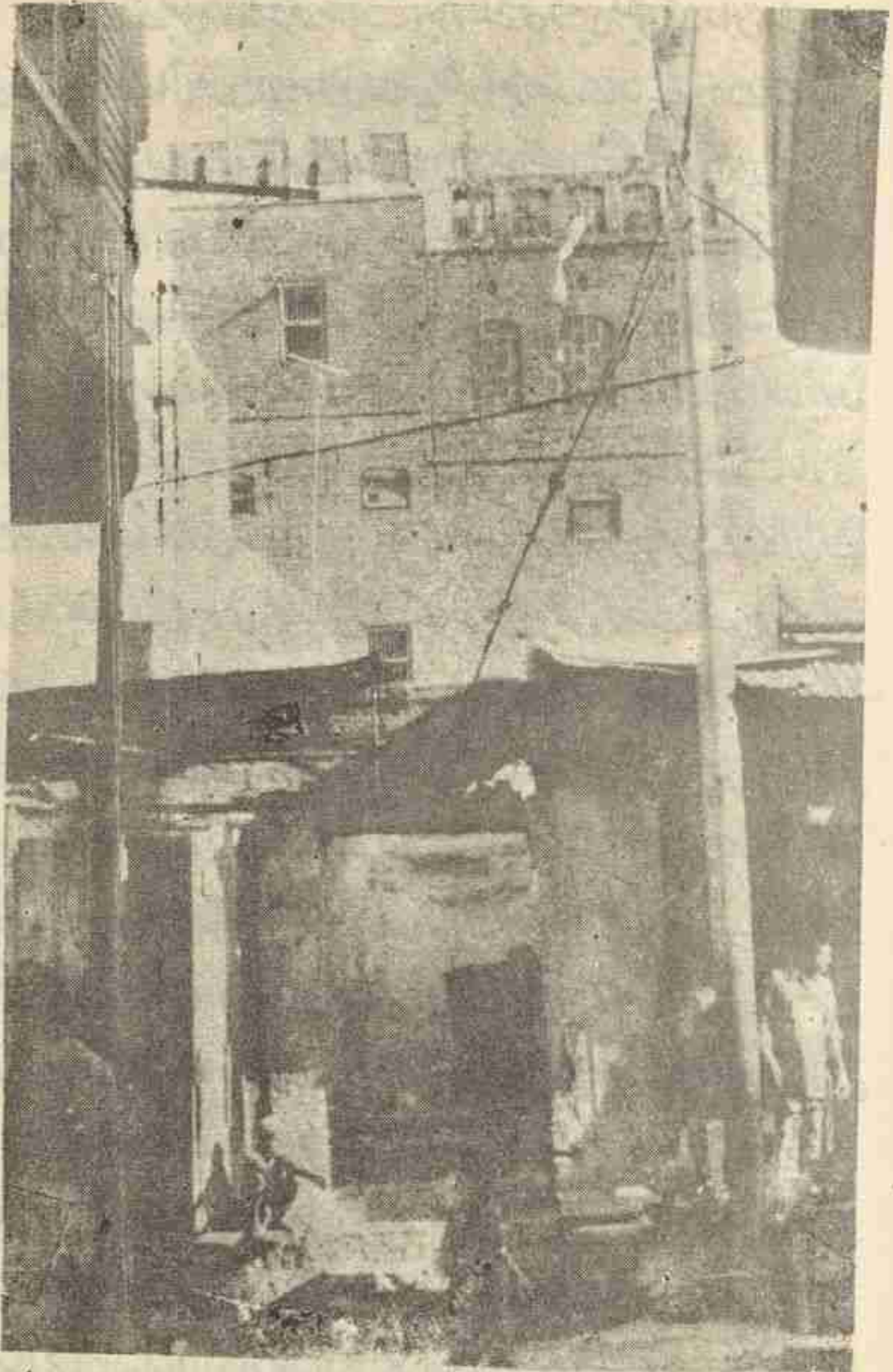
چوک پراگ داس کی اونچی مسجد جس میں چھپے ہوئے مسلمان مردوں عورتوں اور بچوں کو زندہ جلا دیا گیا

تو انہیں برچھے دکھا کر زندہ جل جانے پر مجبور کر دیا گیا۔

اس المیے کے عینی شاہد مسٹر محمد شریف (جو گوالمنڈی یونین کمیٹی کے سابق چیئرمین میاں عبدالرشید کے بھائی ہیں) اور مولوی غلام دستگیر (جو مسجد کے سامنے والے مکانوں کی قطار میں بھٹے والے چاچا فتح محمد کے مکان میں اپنے کنبے اور دیگر محلے داروں سمیت چھپے ہوتے تھے) ابھی یہ دلخراش منظر کھڑکیوں پر لگی ہوتی چلمنوں میں سے جھانک کر دیکھ ہی رہے تھے کہ ایک ٹولی محلے کے چند سکھوں کی قیادت میں اس مکان کی طرف بھی بڑھی جس میں وہ چھپے ہوتے تھے۔ حملہ آوروں نے جب اس مکان کا صدر دروازہ کلہاڑیوں سے توڑنے کی کوشش کی تو مسلمانوں نے جلدی سے کوٹھے کی منڈیر توڑ کر خشت باری شروع کر دی۔ جب مسلمانوں نے اپنا دفاع کرنا شروع کیا تو آس پاس کے مکانوں سے گولیوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ چاچا فتح محمد کے صاحبزادہ محمود کو سب سے پہلی گولی لگی۔ ان کے بعد مولوی مختار احمد نامی نوجوان نے اینٹیں برساتے ہوئے شہادت کا جام نوش کیا۔ گولیوں کی زبردست بوچھاڑ سے بچنے کے لئے باقی نوجوان زخمی حالت میں چھت سے اتر کر نچلی منزل میں چلے گئے۔ جہاں انہوں نے سب سے پچھلے کمرے میں عورتوں، لڑکیوں، بچوں اور بڑے بوڑھوں کو چھپا رکھا تھا۔ حملہ آوروں کو جب یقین ہو گیا کہ اینٹیں برسانے والے کچھ تو شہید ہو گئے ہیں اور کچھ زخمی ہو کر نیچے اتر گئے ہیں تو وہ بھٹے والوں کے ملحقہ مکان (جو ایک سکھ کا تھا) کی چھت پھلانگ کر اس مکان میں کود پڑے اور چھت پھاڑنی شروع کر دی۔ جب چھت پھٹ گئی تو چھت کے شگاف سے انہوں نے نچلے کمرے میں گولیاں برسائیں جس کے نتیجے میں چاچا فتح محمد کا جواں سال خوبرو فرزند صابر شہید ہو گیا۔ اس نے شہادت سے قبل نہتا ہونے کے باوجود حملہ آوروں کی پیش قدمی روکنے کے لئے بے مثال جرأت دکھائی۔ صابر کا بھائی محمود بھی گولی لگنے سے زخمی ہو چکا تھا۔ بعد میں وہ بھی اللہ کو پیارا ہو کر اپنے بھائی صابر کے ساتھ جا ملا۔

چاچی خیراں کی آہ و زاری

یہ افسوسناک سلسلہ جاری تھا کہ ایک گروہ جو کلہاڑیوں سے اس مکان کا صدر دروازہ توڑنے میں مصروف تھا کامیاب ہوگیا اور اس طرح اس گھر کے اندر ہندو سکھ بھیڑیوں نے قتل و غارت گری کا بازار گرم کردیا۔ سب سے پچھلے کمرے میں محلّے کی مستورات، جوان لڑکیاں، بچے اور بزرگ چھپے ہوتے تھے۔ فسادیوں نے اس کمرے میں داخل ہونا چاہا تو اس موقعہ پر غلام حسن بٹ (جو تقسیم کے بعد لاہور کارپوریشن میں ملازم تھے) کے صاحبزادے "دادا" نے مزاحمت کی اور شہید ہوگئے۔ جس کمرے میں مسٹر محمد شریف اور مولوی غلام دستگیر تھے اس کا دروازہ بھی ٹوٹ چکا تھا اور فسادی انہیں بھی برچھیوں اور تلواروں سے ستم کا نشانہ بنا رہے تھے۔ دوسری طرف عورتوں والا کمرہ بھی ٹوٹ چکا تھا (جس میں چاچا فتح محمد اور ان کے بھائی علی محمد تھے) انہوں نے ضعیف العمری کے باوجود حملہ آوروں کا مقابلہ کرنا چاہا مگر ایک تو ضعیفی دوسرے نہ ہتھیار نہ اوزار۔ چنانچہ یہ دونوں بزرگ بھی بیدردی سے شہید کردیئے گئے۔

ان کے بعد دیگر محلے داروں اور عورتوں کی باری آئی تو چاچا فتح محمد کی اہلیہ چاچی خیراں نے آگے بڑھ کر بڑے درد بھرے الفاظ میں محلّے کے نوجوانوں سے کہا۔

"میں نے تمہیں اپنی گود میں پہروں کیا اسی دن کے لئے لوریاں دی تھیں کہ تم بڑے ہوکر میری آنکھوں کے سامنے ہی میرے گھر کے چراغوں کو گل کردو۔"

چاچی خیراں انسانیت، شرافت، مروّت اور دیرینہ تعلقات کی دہائی دیتی رہی مگر درندے تو اپنے کانوں میں جیسے روئی ٹھونس کر آتے تھے۔ انہوں نے چاچی خیراں کی ایک نہ سنی اور اسے بھی اس کے جوان بیٹوں کے پاس بھیج دیا۔ چاچی خیراں کی شہادت کے بعد چاچا فتح محمد کے بھائی علی محمد کی اہلیہ ہاجرہ نے بھی محلّے کے سکھ نوجوانوں کو ان کی ماؤں اور

بہنوں کے واسطے دیتے اور کہا کہ

"کیا تم اس مکان پر آنے سے پہلے اپنی ماتا جی سے پوچھ آتے ہو؟ تمہیں پتہ نہیں تمہاری ماں ہمارے مکان کے اسی کمرے میں میرے ساتھ بیٹھا کرتی تھی۔ تمہیں یہ بھی یاد نہیں کہ تمہاری ماتا میرے بچپن کی عزیز ترین سہیلیوں میں سے ہے؟"

وہ مجبور و مظلوم طرح طرح کے واسطے دے کر فسادیوں کے جذبہ رحم کو ابھارنے کی کوشش کرتی رہی۔ مگر فسادیوں نے اپنی آنکھوں پر تعصب کی پٹی باندھ رکھی تھی۔ مسٹر محمد شریف اور مولوی غلام دستگیر کو حملہ آور مردہ جان کر نیم مردہ حالت میں چھوڑ کر اس مکان کے قیمتی قالینوں، زیورات اور دوسری اشیاء لوٹنے میں مصروف ہو گئے۔ یہ دونوں نوجوان بمشکل ملحقہ مکان (جو خالی تھا) میں گرتے پڑتے جا کر چھپ گئے۔ علی محمد مرحوم کی اہلیہ ہاجرہ کو بھی حملہ آور مردہ تصور کر کے چلے گئے مگر وہ اتفاق سے بچ گئیں — راقم الحروف کے تین چچا خواجہ غلام نبی، خواجہ ظہور الدین اور خواجہ قمر الدین (مرحومین) اسی محلہ میں سات پشتوں سے رہتے چلے آ رہے تھے۔ انہیں بھی قبل از فساد وہاں سے نکالنے کی کوشش کی گئی تو خواجہ غلام نبی اور خواجہ ظہور الدین معہ اہل و عیال ہمارے ہاں شریف پورہ میں آ گئے۔ لیکن خواجہ قمر الدین محلہ کے سکھوں کے کہتے ہوتے عیارانہ معاہدے کا شکار ہو گئے اور صرف ان کے جسم پر تلواروں اور برچھیوں کے ان گنت زخم لگے۔ ان کے دونوں ہاتھوں کی بیشتر انگلیاں کاٹ دی گئیں۔ چہرے، کلائیوں اور جسم کے دیگر حصوں پر تلوار کی گہری کاٹ کے بے شمار نشانات نے ان کی صورت بھیانک بنا دی تھی۔

اس المیے کے عینی شاہد مسٹر محمد شریف اور مولوی محمد یوسف کے بھتیجے مولوی غلام دستگیر کے ہاتھوں اور چہروں کے زخم اس محلہ کے باشندوں پر ڈھائے گئے مظالم کی خونچکاں داستان سناتے ہیں۔

خواجہ قمرالدین جس مکان میں پوشیدہ تھے وہ کوچہ نشا نچیاں میں تھو نبلی کا مکان تھا۔ ان کے بیان کے مطابق اس مکان میں بھی حملہ آور چھت پھاڑ کر داخل ہوتے۔ اس مکان میں سترہ مرد اور پچیس تیس کے لگ بھگ عورتیں، لڑکیاں اور بچے چھپے ہوتے تھے۔ سترہ کے سترہ مردوں کو فسادی بزعم خویش شہید کر کے چلے گئے۔ لیکن ان میں سے تین چار شدید زخمی بمشکل جاں بر ہو سکے۔ سترہ مردوں میں سے چودہ کو شہید اور تین چار کو موت و حیات کی کش مکش میں مبتلا کرنے کے بعد حملہ آور نڈھال ہو چکے تھے۔ اس لئے حسنِ اتفاق سے ان کی نظر مکان کے اس حصے کی طرف مبذول نہ ہو سکی جہاں عورتیں، لڑکیاں اور بچے چھپے ہوتے تھے۔

کوچہ نشا نچیاں، چوک پراگ داس کی اونچی مسجد کے مقابل واقع تھا۔ یہی وہ کوچہ ہے جہاں اونچی مسجد کی نچلی دوکان میں پرچون کا کاروبار کرنے والے نہایت خوبصورت کشمیری نوجوان مصطفےٰ (جو صوفی خالق کے فرزند تھے) کو اس کے بچپن کے ساتھ کھیلے ہوتے سکھ دوستوں نے ایک روز پیار سے بلا کر جس منافقانہ طریقے سے شہید کیا، شاید ہی دنیا میں کسی دوست نے اس بیدردی سے کسی دوست کے اعتماد کو دھوکہ دیا ہو۔ بقول شخصے ؎

خلق پھرتے کے آئی وہ بھی ان کے ساتھ تھے
میں خطائیں جن کی اپنے نام لکھواتا رہا

مولوی محمد یوسف کو بھی سکھوں کے چکمہ میں آ کر سادہ لوحی کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ ان کا یہ خیال کہ ہندو سکھ، کانگریسی یا احراری مسلمانوں کو کچھ نہیں کہیں گے خیالِ خام ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ تو صرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سب نام لیواؤں کے دشمن تھے۔ انہوں نے جلیانوالہ باغ میں (جو اِس آبادی کے قریب ہی واقع تھا) مسلمانوں کی طرف سے دی گئی قربانیوں کو یکسر فراموش کر دیا تھا۔ ایک ہی پیالہ میں پانی پینے کا درس دینے والے مہنت خونخوار بھیڑیوں کا روپ دھار چکے تھے۔ کانگرسی اور غیر کانگرسی کی تمیز مٹ چکی تھی۔ مولوی

محمد یوسف کے حقیقی بھائی مولوی حمید کو ایک روز قبل ان کی قضا گھیر کر مولوی محمد یوسف کے پاس لے آئی۔ مولوی حمید مرحوم بڑے درد مند انسان تھے اور اپنے بھائیوں مولوی محمد یوسف اور مولوی عبدالعزیز کے خاندان کے دیگر افراد کو اس آبادی سے نکالنے کے لئے آئے تھے۔ لیکن جب ان کے عزیز و اقارب نے ان کی نصیحت پر کان نہ دھرے تو وہ بھی کوچہ لشاپچیاں میں ایک رات گزارنے اور کلمہ گوئی کے جرم کی پاداش میں شہید کر دیئے گئے۔ اسی طرح مولوی محمد یوسف کے فرزند مولوی محمد اسلم کو حملہ آوروں نے پیٹ میں کئی برچھے مارے۔ وہ ہسپتال جا کر زخموں کی تاب نہ لاتے ہوتے شہید ہو گئے۔ ان کے علاوہ مولوی محمد یوسف کی ایک لڑکی کے سر میں کرپان کا گہرا زخم آیا۔ اس محلہ کے حاجی محمد حسین (جو خود بمبئی گئے ہوتے تھے) کی بھاوج کو ان کے گیارہ روزہ بچے سمیت شہید کر دیا گیا۔ ایک اطلاع کے مطابق بعد میں اس بچے کو برچھے کی نوک پر چڑھا کر امرتسر کے مشہور ہندو بدمعاش بکے جھٹکی نے جلوس نکالا۔

مسلمان لڑکیوں کا برہنہ جلوس

یہ سلسلہ جاری تھا کہ محلے کے جلتے ہوتے مکانوں کے بھڑکتے ہوتے شعلوں میں ان شہدار کی سسکتی لاشوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر پھینکا گیا تاکہ اگر بعد میں پولیس آتے تو ان کا نام و نشان بھی نہ مل سکے۔ اس کے بعد فسادی کوچہ لشاپچیاں اور چوک پراگ داس سے برآمد ہونے والی ان مستورات کو برہنہ جلوس کی شکل میں گرو رام داس کی سرائے کی طرف لے گئے، جنہیں آفتاب و ماہتاب کی کرنوں نے بھی کبھی بے نقاب نہ دیکھا تھا۔

چوک پراگ داس سے ملحق مشرق کی جانب چوک منّاں سنگھ تھا۔ یہاں کے مسلمانوں کے ساتھ بھی انتہائی بہیمانہ سلوک روا رکھا گیا۔ اس بازار کے چودھری محمد ابراہیم خان کو فسادیوں نے شہید کیا تو ان کی اہلیہ مختار خانم اپنی عزّت و عصمت بچانے کے لئے اپنے مکان کی کھڑکی سے چھلانگ

لگا کر شہید ہو گئی۔ اس کے بعد حملہ آور اس محلے کے مختلف گھروں کے صدر دروازے توڑنے لگے۔ جن مکانوں کے دروازے مضبوط تھے ان سے ملحقہ گھروں کی منڈیریں پھاند کر ان مکانوں کی چھتیں پھاڑی گئیں اور زخموں سے سسکتے اور درد سے کراہتے مسلمانوں کو آگ کے شعلوں کی نذر کیا گیا۔ اس محلہ کے ایک شخص محمد بخش عرف مہند نامی مسلمان حلوائی کے مکان میں پچیس تیس نہتے مسلمان (جن میں عورتوں اور بچوں کی اکثریت تھی) چھپے ہوتے تھے۔ انہوں نے ایک کمرے کو اندر سے مقفل کر کے رضائیاں اوڑھ رکھی تھیں۔ حملہ آور جب صدر دروازہ توڑ کر مکان میں داخل ہوتے تو انہوں نے اس مقفل کمرے کو بھی کلہاڑیوں سے توڑ ڈالا جس میں متذکرہ مسلمان چھپے ہوتے تھے

فسادی "جو بولے سو نہال۔ ست سری اکال" کے بھیانک نعروں اور بے بس مسلمانوں کی چیخوں اور فریادوں کی ملی جلی آوازوں کے دوران برچھیوں کے پھلوں کے ذریعے ان کے لحاف اٹھا اٹھا کر ایک کونے میں پھینک رہے تھے۔ اتفاق سے اسی کونے میں محمد بخش حلوائی بھی ایک لحاف میں چھپا ہوا تھا۔ ایک کے بعد دوسرا لحاف اس کے اوپر گر رہا تھا اور دوسرے کے بعد تیسرا۔ مگر وہ دم سادھے، سانس روکے انتہائی بے بسی کے عالم میں ان چیخوں اور فریادوں کو سن رہا تھا جو شہید ہوتے وقت اس کے عزیز و اقارب اور محلے دار بلند کر رہے تھے۔ جب فسادی راہ فرار اختیار کر چکے اور بعد میں پولیس آئی تو اس وقت محمد بخش ان لحافوں کے نیچے سے برآمد ہوا۔ محمد بخش خود تو بچ گیا مگر اس کی بہو کو فسادیوں نے جب ہوس کا نشانہ بنانے کے لئے اس کی گود سے اس کا شیر خوار بچہ چھینا تو وہ اپنے لخت جگر کے مقابلے میں اپنی عزت و عصمت کو ترجیح دیتے ہوئے مسجد کی بالائی چھت سے کود کر شہید ہو گئی۔ بعد میں فسادیوں نے اس کے شیر خوار بچے کو برچھے کی نوک پر اچھال کر اس کی ماں کے پاس پہنچا دیا۔ اسی محلہ کے ایک باشندے خواجہ رشید (جو قیام پاکستان کے بعد راولپنڈی میں آباد ہو گئے) کا واقعہ بھی اپنے اندر بڑی عبرت رکھتا ہے۔ خواجہ رشید جان بچانے

کے لئے ایک مکان میں چھپے ہوتے تھے کہ ان کے ایک دیرینہ ہمسائے نے "حق ہمسائیگی" ادا کرتے ہوئے فسادیوں کو بتایا کہ خواجہ رشید فلاں مکان میں چھپا ہوا ہے۔ اس مُسلے (مسلمان) کو بھی قتل کرو۔ خواجہ صاحب نے اپنے اس غیر مسلم "مہربان" کی آواز سننے کے فوراً بعد جان بچانے کے لئے برابر والے مکان میں چھلانگ لگا دی (جو تاریک بھی تھا اور ویران بھی) اور اس کی اندھیری سیڑھیوں میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ جب فسادی مسلمانوں کے خونِ ناحق سے اپنی تلواروں کی پیاس بجھا کر چلے گئے تو خواجہ رشید نے رات کی تاریکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سلطان وِنڈ کی جرنیلی سڑک کے ساتھ ساتھ بہنے والے گہرے گندے نالے میں کبھی ڈوب کر اور کبھی تیر کر اپنی جان بچائی۔

باوا گھنشام اور بے بے ڈاکٹرنی کی انسان دوستی

چوک پراگ داس کی اونچی مسجد کے مولوی محمد یوسف (جن کی قسمت میں ابھی زندگی کی مزید بہاریں دیکھنی لکھی تھیں) کٹڑہ رام گڑھ کے ایک فرشتہ سیرت سکھ باوا گھنشام کی حویلی میں محلے کے ایک سو کے لگ بھگ مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں سمیت چھپے ہوتے تھے۔ باوا گھنشام کمیونسٹ ذہن کے مالک تھے ان کے مکان میں ان کے جگری دوست میاں عبدالرشید (جو گوالمنڈی یونین کمیٹی لاہور کے چیئرمین رہ چکے ہیں) بھی اپنے اہل و عیال سمیت چھپے ہوتے تھے۔ باوا گھنشام نے احتیاطاً اپنی حویلی کا صدر دروازہ بند کر کے دروازے کے ساتھ اندر کی طرف اینٹوں کی دیوار چُن دی تاکہ اگر باہر سے کوئی اسے توڑنے کی کوشش کرے تو اینٹیں دروازے کی پشت پناہی کر سکیں۔ اس مکان میں پناہ لینے والے میاں عبدالرشید کے بیان کے مطابق باوا گھنشام کی والدہ دن رات شیرنی کی طرح مستعد پہرہ دیتی تھی اور اپنی پناہ میں آتے ہوتے مسلمانوں کو یقین دلاتی تھی کہ حملہ آوروں کو آپ لوگوں تک پہنچنے سے قبل ہماری لاشوں سے گزرنا پڑے گا۔ جب ایک دو مرتبہ حملہ آوروں نے باوا گھنشام کو للکارا اور

کہا کہ تم نے مسلمانوں کو اپنی حویلی میں چھپا رکھا ہے۔ انہیں ہمارے حوالے کر دو، ورنہ تمہیں بھی ان کے ساتھ پاکستان پہنچا دیں گے (یعنی ہلاک کر دیں گے) تو باوا گھنشام حسن تدبر سے طرح دے گئے۔

اسی طرح کا ایک ناقابلِ فراموش واقعہ اس بازار کی ایک نیک دل خاتون بے بے ڈاکٹرنی سے بھی منسوب ہے جس کے راوی مسٹر محمد شریف اور مولوی دستگیر ہیں۔ بے بے ڈاکٹرنی ایک سکھ عورت تھی۔ اس کا خاوند ڈاکٹر تھا اور اسی نسبت سے وہ بے بے ڈاکٹرنی کے نام سے مشہور تھی۔ وہ اس محلے کے کئی مسلمانوں کو گود کھلا چکی تھی بلکہ کئی بچوں کو اپنے گلے سے لگا کر تھپکیاں دے کر لوریاں دیتی اور پریوں کی کہانیاں سنا کر انہیں نیند کی سندر نگری کی سیر کرایا کرتی تھی۔ بے بے ڈاکٹرنی کا مکان میرے حقیقی پھوپھا خواجہ حفیظ اللہ مرحوم کے مکان کے برابر تھا۔ جب بچپن اور لڑکپن کے زمانے میں راقم اپنے پھوپھا جی کے گھر جاتا تو بے بے ڈاکٹرنی نہ صرف بے حد پیار کرتی بلکہ کئی دنوں کی ٹوٹی ہوتی پتنگیں اور ڈور میرے لئے سنبھال کر رکھتی تھی۔ میں کٹڑہ رام گڑھ (چوک پراگ داس) جاتا تو وہ مذکورہ اشیاء میرے حوالے کر دیتی۔ الغرض بے بے ڈاکٹرنی نے قیامت کی اس گھڑی میں اپنی جان خطرے میں ڈال کر جس دلیری سے دس بارہ مسلمانوں کو اپنے مکان میں چھپائے رکھا اسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا

چوک پراگ داس اور رمتاں سنگھ کے چوک کے مسلمانوں کی المناک تباہی کی اطلاع اسی محلہ کی ایک فاطمہ نامی مسلمان عورت (جو تقسیم کے بعد نسبت روڈ لاہور کی مسجد نور کے سامنے تنور کی مالکہ تھی) نے بڑے ڈرامائی انداز میں تھانے جا کر دی۔ فاطمہ کے تھانے کی طرف جانے کی روداد بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس نے مخدوش حالات کے پیشِ نظر اپنی باہوں میں سکھوں کا مذہبی نشان آہنی کڑا اور ساڑھی پہن کر سکھ عورت کا بہروپ اس خوبی سے دھارا کہ جب وا ہگورو کی مالا جپتی ہوئی اس راستے کو طے کر رہی تھی تو کسی کو شک بھی نہ گزرا کہ یہ مسلمان عورت ہے۔ فاطمہ ابھی بمشکل تھانے تک پہنچی تھی کہ چوک پراگ داس کے مرزا محمد علی (جو ام تسر میونسپلٹی

میں ملازم تھے) کے ایک دوست جو پولیس افسر تھے ان کی خیریت دریافت کرنے وہاں پہنچے تو مسلمانوں کے ٹوٹے پھوٹے اور جلے ہوئے مکانوں سے دھواں اٹھ رہا تھا اور بازار میں جگہ جگہ پڑے ہوئے خون کے دھبے بہت کچھ کہہ رہے تھے ؎

مٹانے والوں نے کچھ اس طرح مٹایا ہے

کہ قبر کا بھی ہماری نشاں نہیں ملتا

بلوائی لوٹ مار کرنے کے بعد جائے واردات سے بھاگ چکے تھے۔ مذکرہ مسلمان افسر کے ہمراہ جو تین چار مسلح سپاہی تھے انہوں نے باآواز بلند کہا کہ اگر کوئی مسلمان زندہ کہیں چھپا ہوا ہے تو باہر نکل آئے ہم اسے بحفاظت اپنے ساتھ لے چلیں گے۔

پہلے تو بے بے ڈاکٹرنی کے گھر میں چھپے ہوئے مسلمان اس آواز سے خوفزدہ ہو گئے اور اس خیال سے ہچکچاتے رہے کہ مبادا یہ بھی دشمنوں کی کوئی چال ہو۔ لیکن جب ایک مسلمان نے اس پولیس افسر کو جھروکے میں سے دیکھ کر پہچان لیا تو وہ بے بے ڈاکٹرنی کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرنے کے بعد بازار میں نکل آئے۔ انہی کے پکارنے پر چاچا فتح محمد مرحوم بھٹے والے کے مکان میں نیم مُردہ حالت میں پڑے ہوئے مسٹر محمد شریف اور مولوی غلام دستگیر بقیہ مسلمان زخمیوں سمیت اس مسلمان پولیس افسر کی پناہ میں آ گئے۔ یہ لوگ ابھی اپنے دوسرے ساتھیوں کو آوازیں دے کر بلا ہی رہے تھے کہ پولیس اور انتظامیہ کے اعلیٰ افسر برین گنوں، سٹین گنوں کے دہانے مکانوں کی طرف اٹھائے چند ہوائی فائر کرتے اس محلے میں داخل ہوئے۔ اس کے بعد مسلمانوں کے مقامی قائدین بھی جائے واردات پر پہنچ گئے۔ انہوں نے چوک پراگ داس اور منّاں سنگھ کے چوک کی اس مسلمان آبادی کو خاک و خون میں لت پت دیکھا تو ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ پولیس کی ابتدائی کارروائی کی تکمیل کے بعد جلی ہوئی ہڈیوں کی چار بوریاں خواجہ امیرالدین سالار مسلم لیگ نیشنل گارڈ امرتسر نے قبرستان بلاقہ سنگھ اور ملک محمد انور صدر شریف پورہ مسلم لیگ نے شاہ دین وغیرہ کے تعاون سے ۵۵ لاشیں گھی منڈی کے

قبرستان میں دفن کیں۔ پولیس اور انتظامیہ کے اعلیٰ افسروں نے چوک پراگ داس کی جائے واردات کے معائنہ کے فوراً بعد کوتوالی میں امرتسر کے تمام فرقوں کے سرکردہ لیڈروں کو طلب کر لیا۔

اسلامی رواداری کا ناقابلِ فراموش مظاہرہ

اس اجلاس کے انعقاد سے ایک روز قبل امرتسر مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری میر انور سعید محمود ہاتھی دروازے کے پاس کھڑے تھے کہ دو سکھ لڑکیاں اس علاقے کے مسلمانوں کے نرغے میں پھنس گئیں۔ جس وقت یہ واقعہ پیش آیا کرفیو کے نفاذ کا سائرن بج رہا تھا چنانچہ میر صاحب مشتعل مسلمانوں کو سمجھانے بجھانے کے بعد ان دونوں لڑکیوں کو اپنے گھر لے گئے اور رات بھر انہیں اپنی بیٹیوں کی طرح عزیز رکھا۔

میر صاحب کے بیان کے مطابق ان لڑکیوں نے میر صاحب اور ان کے گھر کی مستورات کے اصرار کے باوجود اپنا صحیح نام، پتہ اور ولدیت بتانے سے گریز کیا۔ اگلے روز کرفیو کا وقفہ شروع ہوا تو میر صاحب مختلف فرقوں کے مجوزہ اجلاس میں جاتے وقت ان لڑکیوں کو اپنے ساتھ کوتوالی لے گئے۔ میر صاحب کوتوالی پہنچے تو ان لڑکیوں کا باپ ٹھاکر گیان سنگھ (بینکر) اپنی بیٹیوں کو دیکھ کر خوشی سے اچھل پڑا۔

ٹھاکر گیان سنگھ میر صاحب کی احسان مندی کا شکریہ ادا کر ہی رہا تھا کہ ماسٹر تارا سنگھ بھی اس اجلاس میں شرکت کرنے کوتوالی پہنچ گیا۔

تارا سنگھ نے ٹھاکر گیان سنگھ کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو دیکھے تو اس نے معنی خیز انداز میں ان لڑکیوں سے ان کی خیریت دریافت کی۔ چنانچہ ان لڑکیوں نے میر صاحب کے شریفانہ سلوک کی تعریف کرتے ہوتے ماسٹر تارا سنگھ کی بدگمانی دور کر دی۔ اس اثناء میں شیخ صادق حسن، ملک غلام نبی، خواجہ امیر الدین، عبداللہ خاں، خواجہ غلام نبی لیڈر، صوفی غلام محمد ترک اور بشیر احمد خاں مختیار بھی کوتوالی پہنچ گئے۔ اجلاس میں چوک پراگ داس کی

مسلمان لڑکیوں کے اغوا کا مسئلہ پیش ہوا تو ماسٹر تارا سنگھ بڑی معصومیت اور عیاری سے اپنی لاعلمی کا اظہار کرنے لگا۔ مسلمانوں کے مذکورہ بالا نمائندوں کا اصرار بڑھا تو ماسٹر تارا سنگھ نے ان لڑکیوں کی مشروط واپسی کی پیش کش کی اور کہا کہ اگر پولیس کی بھاری جمعیت میرے ہمراہ چلے تو میں گرو رام داس کی سرائے سے ان لڑکیوں کو برآمد کرا دوں گا۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے کہ مسلمان لیڈر محلہ بکروانان کی ارائیوں کی حویلی میں گھرے ہوئے ہندو سکھ گھرانوں کو بحفاظت کوتوالی پہنچا دیں۔ چنانچہ اسی وقت اس معاہدے کے تحت پراگ داس اور چوک متاں سنگھ کی مسلمان مغویہ خواتین کی بازیابی ہوئی۔ اجلاس کے اختتام پر ماسٹر تارا سنگھ روانہ ہونے لگا تو عبداللہ خاں مرحوم نے میر انور سعید محمود سے رازدارانہ انداز میں کہا کہ آپ کسی طرح ماسٹر تارا سنگھ کو لفٹ دینے کے بہانے میری گاڑی میں بٹھا دیں۔ چنانچہ میر صاحب نے ماسٹر تارا سنگھ کو جب لفٹ کی پیش کش کی تو مدن گھی والے نے میر صاحب کو جواب دیتے ہوئے کہا کہ ہم اپنے "محبوب لیڈر" کو کسی قیمت پر آپ کے ساتھ نہیں جانے دیں گے۔ جس کے نتیجے میں عبداللہ خاں کا منصوبہ ناکام ہو گیا ورنہ مسلمانوں کے اس قاتلِ اعظم کا اُسی روز خاتمہ ہو گیا ہوتا۔

صوفی غلام محمد ترک اور بشیر احمد خاں بختیار اجلاس کے بعد کوتوالی سے ملحقہ میونسپل کمیٹی کے دفتر میں امرتسر کے ہیلتھ آفیسر ڈاکٹر شونارائن (روز ڈن) کے پاس پہنچے تو ڈاکٹر روز ڈن کی آنکھوں سے آنسو چھلک رہے تھے اور وہ مسلمان لڑکیوں کے اغوا پر تاسف کا اظہار کرتے ہوئے ہندوؤں سکھوں کی زیادتی کی واشگاف لفظوں میں مذمت کر رہے تھے۔

مغویہ خواتین کی بازیابی کے بعد پولیس نے قتل، آتشزنی اور لوٹ مار کے مقدمات درج کر کے اس علاقے کے مہندر سنگھ، گیجا سنگھ، ہرنام سنگھ، نھا سنگھ اور رگوپال سنگھ کے علاوہ ۲۱ مزید سکھوں کو گرفتار کر لیا۔ اس مقدمہ کی سماعت امرتسر کے سیشن جج مسٹر سے کی عدالت میں شروع ہوئی جنہوں نے مقدمے کی سماعت کے دوران مسلمان گواہوں کے بیان کردہ واقعات

کو محیر العقول اور بعید از قیاس تصور کرتے ہوئے موقع پر جا کر ایک ایک گواہ کی روشنی میں مقدمے کے بعض اُلجھے ہوئے پہلو ذہن نشین کئے چنانچہ عدالت نے ان سب ملزموں کو عمر قید کی سزا کا حکم سنایا۔ لیکن ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو بھارت کی سیکولر سٹیٹ کے ارباب بست وکشاد نے ان خونخوار بھیڑیوں کو رہا کر دیا۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اس مقدمے کی پیروی کے لئے لاہور سے سابق جسٹس میاں آفتاب فرخ، بکرم اللہ بزرگوار بیرسٹر فرخ حسین اور خواجہ فیروز الدین احمد (مرحومین) کی خدمات حاصل کی گئیں۔ خواجہ صاحب علامہ اقبالؒ کے ہمزلف اور لاہور کے ممتاز وکلاء خواجہ سلطان احمد، خواجہ محمد افضل (سابق ایڈیشنل ایڈووکیٹ جنرل) کے والد تھے۔ خواجہ فیروز الدین احمد اور بیرسٹر فرخ حسین نے امرتسر کے نوجوان وکیل ملک عبید اللہ (جو تقسیم کے بعد راولپنڈی آباد ہوتے) کے تعاون سے اتنی جاں سوزی سے مقدمہ تیار کیا کہ ملزموں کے نامور وکلاء بغلیں جھانکتے رہ گئے۔

چوک پراگ داس اور رمتاں سنگھ کے چوک کے المیے نے جہاں امرتسر کے مسلمانوں کو اپنے شہید بھائیوں کا بدلہ لینے کا بھرپور جذبہ بخشا وہاں پنڈت جواہر لال نہرو بھی اس محلے کی تباہی دیکھے بغیر نہ رہ سکے۔ وہ جب لاہور اور امرتسر کے احراری اور مسلمان کانگرسی لیڈروں کی معیت میں پولیس اور انتظامیہ کے ہمراہ جائے واردات پر پہنچے تو امرتسر کے احراری لیڈر حاجی محمد اسحاق حنیف مرحوم کے بیان کے مطابق ان کی آنکھوں میں بھی آنسو تیر رہے تھے۔ ان کی نمناک پلکوں کو دیکھ کر مسلمانوں کے اس تباہ شدہ محلے کے کھنڈروں سے شہیدوں کی راکھ شدہ ہڈیاں پکار پکار کر کہہ رہی تھیں ؎

وہ آبدیدہ بیٹھے ہیں بیدم کی لاش پر

اب پانی لے کے آئے ہیں جب پیاس مر گئی

پنڈت جواہر لال نہرو کے علاوہ بہت سے ملکی اور غیر ملکی اخباری مبصرین بھی جائے واردات پر پہنچے۔ انہوں نے مسلمانوں کے خون سے کھیلی گئی اس ہولی کے خونیں چھینٹے جب اس محلے کی شکستہ

اور جلی ہوئی دیواروں، کھڑکیوں، پھٹی ہوئی چھتوں اور مسجدوں کے ٹوٹے پھوٹے میناروں پر ثبت دیکھے تو اپنے آنسوؤں پر قابو نہ پا سکے۔ سردار عبدالرب نشتر، نواب افتخار حسین ممدوٹ، ملک فیروز خاں نون (مرحومین) بیگم شاہنواز اور ابوسعید انور بھی مقامی مسلم لیگی لیڈروں کے ہمراہ چوک پراگ داس کی تباہی دیکھنے کے لئے گئے اور وہاں کے دلخراش مناظر دیکھ کر تڑپ اُٹھے۔

پنڈت نہرو کی فرقہ پرستی

بھارت کے مشہور سرودیہ لیڈر پنڈت جے پرکاش نارائن (آنجہانی) بھی یہ قیامت خیز منظر دیکھ کر بے اختیار رو دئے۔ انہوں نے مسلمانوں کے تباہ شدہ محلے کی بربادی کے معائنہ کے بعد اس روز ایک بیان کے ذریعے ہندو سکھ فرقہ پرستوں کی اس مذموم حرکت کی بڑے واضح اور واشگاف لفظوں میں مذمت کی جس سے ہندوستان کے متعصب ہندوؤں میں کھلبلی مچ گئی اور وہ پنجے جھاڑ کر پنڈت جے پرکاش نرائن کے پیچھے پڑ گئے۔ پنڈت جواہر لال نہرو چوک پراگ داس سے لوٹتے وقت دبی زبان میں کہہ گئے کہ مسلمانوں نے بھی بعض مقامات پر اسی قسم کے مظالم کا ارتکاب کیا ہے چنانچہ مسٹر جے پرکاش نارائن کے اخباری بیان کے الفاظ مسلمانوں کے زخمی دلوں پر مرہم کا کام دے رہے تھے اور جواہر لال نہرو کا تبصرہ ان کے زخموں پر نمک پاشی کر رہا تھا۔

پنڈت نہرو نے دبی زبان میں جن مقامات پر مسلمانوں کے مظالم کی طرف اشارہ کیا وہ دراصل امرتسر کے چوک لوہگڑھ کے ہندوؤں سکھوں کے چند مکانوں کی آتشزدگی کے طول دیتے ہوئے افسانے کا ذکر تھا۔ البتہ چوک پراگ داس کے اگلے روز چوک لوہگڑھ کے چند غیور مسلمانوں چاچا عمر، سیٹھ محمد اسحاق سابق بی ڈی ممبر گوالمنڈی لاہور، شیخ یٰسین محمد امین عرف بینو (جو تقسیم کے بعد نسبت روڈ لاہور آباد ہوتے تھے) خواجہ غلام احمد، محمد غوث الو قصاب، شفیع قصاب، محمد یعقوب

عرف بوبا، محمد اسحاق عرف ساتا، یٰسین پھینا، محمد شریف اور میاں منصور احمد وغیرہ

نے لوہگڑھ کے چند ہندو سکھوں کے خالی مکانوں کو نذرِ آتش کیا تو امرتسر کے ہندوؤں سکھوں نے

سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ان چند مکانوں کی آتشزدگی کے واقعہ کو بہت طول دیا اور ایک

من گھڑت افسانہ بنا کر پنڈت نہرو اور اعلیٰ حکام کو انتہائی مکاری کے ساتھ تاریں ارسال

کیں اور چوک پراگ داس کے شہیدوں پر ڈھاتے جانے والے مظالم کو ثانوی حیثیت دینے

کی ناکام کوشش کی نیز ملک محمد مست پر (جو اس علاقہ کی پولیس چوکی کے سربراہ تھے) یہ

الزام لگایا کہ انہوں نے اس محلہ کے مسلمانوں کو اکسا کر اپنی نگرانی میں آگ لگوائی ہے۔ چوک

پراگ داس میں سینکڑوں مسلمان شہید ہو چکے تھے۔ ان کی لاکھوں روپوں کی املاک راکھ کا

ڈھیر بن چکی تھیں مگر اس کے باوجود اس علاقہ کی چوکی یا تھانے کا کوئی پولیس افسر معطل نہ ہوا

تھا۔ جب پنڈت نہرو امرتسر سے جانے لگے تو انہوں نے ملک محمد مست کو چوک لوہگڑھ کی متذکرہ

معمولی سی آتشزدگی کی سربراہی کے الزام میں معطل کر دیا۔ کسی نے شاید ایسے ہی موقع کے

لئے کہا ہے ؎ ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام

وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

ملک محمد مست نے امرتسر کے نہتے مسلمانوں کی جس خلوص سے خدمت کی انہیں ہندو قتل

سکھوں کے اکثریتی علاقوں سے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر جس بے خوفی سے محفوظ مقامات پر

پہنچایا۔ اسے امرتسر کے مسلمان کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔

قیامِ پاکستان کے بعد ملک محمد مست پر جس طرح مصیبت کے بادل چھائے اس کی

تفصیل کی طرف جب دھیان جاتا ہے تو دل میں عجیب سی خلش اور چبھن محسوس ہونے

لگتی ہے۔

پاکستان بننے کے بعد ملک محمد مست جب لاہور پہنچے تو انہیں ان کی شاندار خدمات

کا صلہ دینے کے بجائے اس وقت کے آئی جی قربان علی خان نے ان کی مسلسل کوششوں اور

درخواستوں کے باوجود بحال نہ کیا۔ چنانچہ ملک محمد مست نے تنگ آکر ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور سیالکوٹ جاکر اپنا ذاتی کاروبار کرنے لگ پڑے۔ شاعر نے غلط نہیں کہا ؎

وہ لوگ ہم نے ایک ہی شوخی میں کھو دیے

ڈھونڈا تھا آسماں نے جنہیں خاک چھان کر

اغیار کا رویہ دیکھئے کہ انہوں نے چوک پراگ داس کے المیہ کے بعد متعلقہ تھانے کا ایک سپاہی بھی معطل نہ ہونے دیا بلکہ یوم آزادی کے موقعہ پر ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے روز ایسے خطرناک قاتلوں کو رہا کر دیا جن کے ہاتھ سینکڑوں بے گناہ مسلمانوں کے خون سے رنگے ہوتے تھے۔ لیکن ہم سے اسلامیانِ امرتسر کا محسن اور دشمنوں کی آنکھ کا کانٹا ملک محمد مست پاکستان بننے کے بعد بھی بحال نہ ہو سکا۔ علاوہ ازیں امرتسر کے جن مسلمان پولیس ملازمین نے ۱۰ اگست ۱۹۴۷ء کے روز اس وقت کی ہندو نواز حکومت کے سرکاری اسلحہ واپس کرنے کی بابت بدنیتی پر مبنی احکام کی تعمیل کرنے کے بجائے اس اسلحہ کو اپنے بیوی بچوں اور اسلامیانِ امرتسر کا دفاع کرنے کے خیال سے واپس نہ کیا تھا ان کو قیامِ پاکستان کے بعد یہ کہہ کر بحال نہ کیا گیا کہ تم لوگوں نے چونکہ دفتری قاعدے کی خلاف ورزی کی تھی اس لئے تم پولیس کے محکمے کی ملازمت کے اہل نہیں ہو۔

شاید ہماری ایسی ہی کوتاہیوں اور غلط اندازِ فکر کا نتیجہ ہے کہ ہم بلندیوں کی طرف پرواز کرنے کے بجائے پستیوں کی طرف لڑھکتے چلے گئے اور شمع آزادی کے پروانوں کی ناقدری کو اپنا شعار بنا کر وطن عزیز کو دو لخت کرا بیٹھے۔

O

ولایت حسین غازی کے دونوں ہاتھ فسادیوں نے کاٹ دیئے۔ لیڈی ماؤنٹ بیٹن نے مصنوعی ہاتھ لگوانے کا وعدہ کیا جو "ایشیائی محبوب" کی گیدڑ بھبکی ثابت ہوا۔

گول ہٹی بال بازار کا چوک جہاں اکالیوں نے تانگے میں بیٹھ کر شر انگیز منادی کی

چودھری عبدالقادر کی نصف گردن چوک
جہاں سنگھ کے مقابلے میں کٹ گئی

احسان قریشی صابری نے جہاں سنگھ گیٹ
کے مسلمانوں کی شب و روز خدمت کی

بھولا سنگھ کا برج جہاں سے اکالیوں نے جہاں سنگھ گیٹ کے نہتے مسلمانوں پر حملہ کیا۔
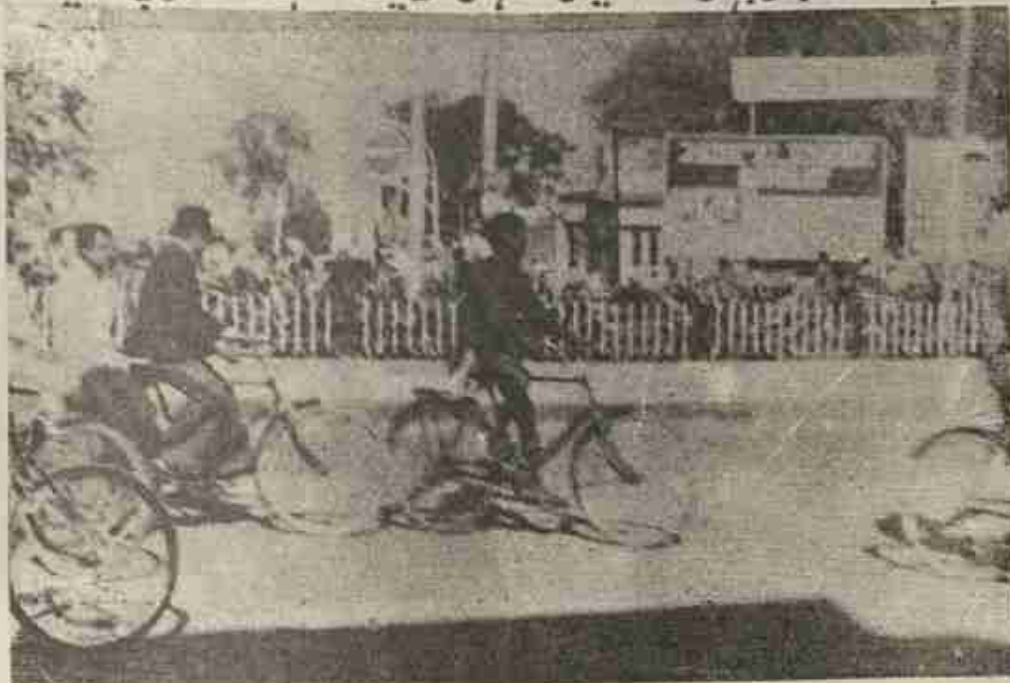
چوک جہاں سنگھ گیٹ جہاں حملہ آوروں کے ساتھ گھمسان کا رن پڑا۔

چوک فرید کے جیالے

ڈاکٹر عبدالحفیظ نے ممس پہلوان
کے بدن سے اسی چھرے نکالے

غلام مصطفےٰ عرف ممس پہلوان نے چوک فرید کے حملہ میں مثالی جرأت کا مظاہرہ کیا

نصیر خاں نے چوک فرید کے معرکہ میں نمایاں کردار ادا کیا۔ چوک فرید کے مقابلہ میں حامد حسن کی ایک آنکھ کام آئی

معراج دین عرف بھولا پہلوان

انور حسین عرف منٹو پہلوان

سیٹھ محمد اسحاق

خواجہ محمد اسلم

چوک فرید کی مسجد کوتوال کی چھت پر چڑھ کر بیدل امرتسری نے حملہ آوروں پر لوٹے برسائے۔

کٹڑہ گھنیاں کی آتشزدگی

کٹڑہ جیمل سنگھ کی تباہی کا خوفناک منظر

بازار ریشم والا کے کھنڈرات ——— بشکریہ اکرام بٹ لاہور
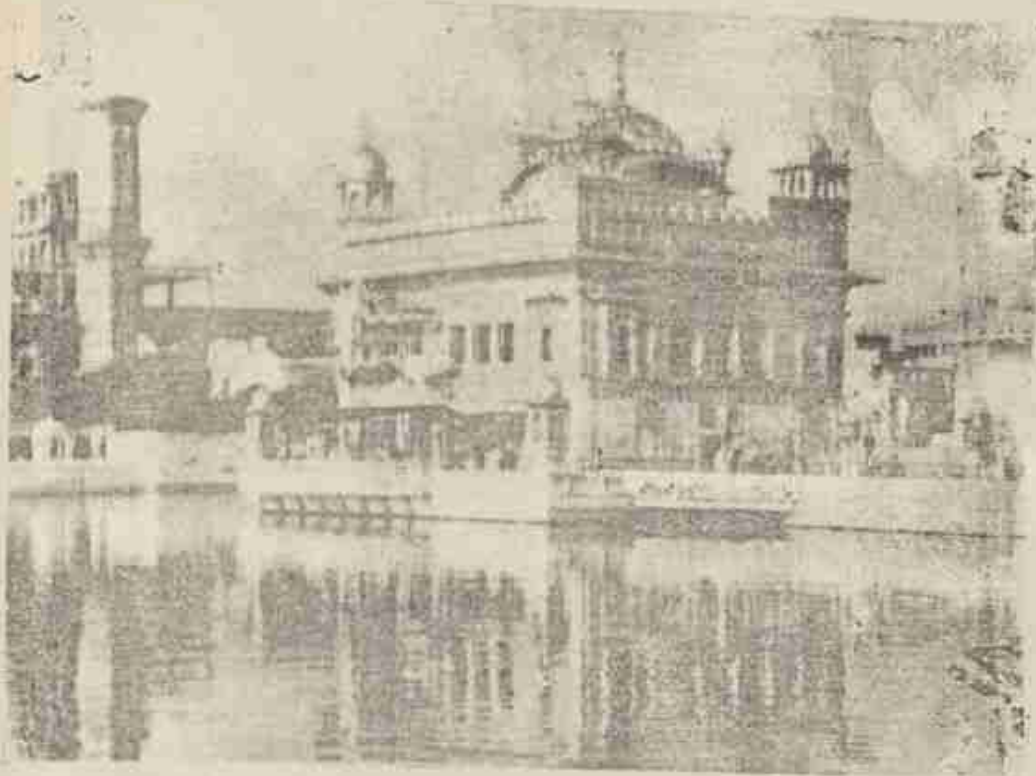
امرتسر کا گولڈن ٹمپل جس میں مسلمانوں کے قتل عام کے منصوبے تیار ہوتے تھے۔
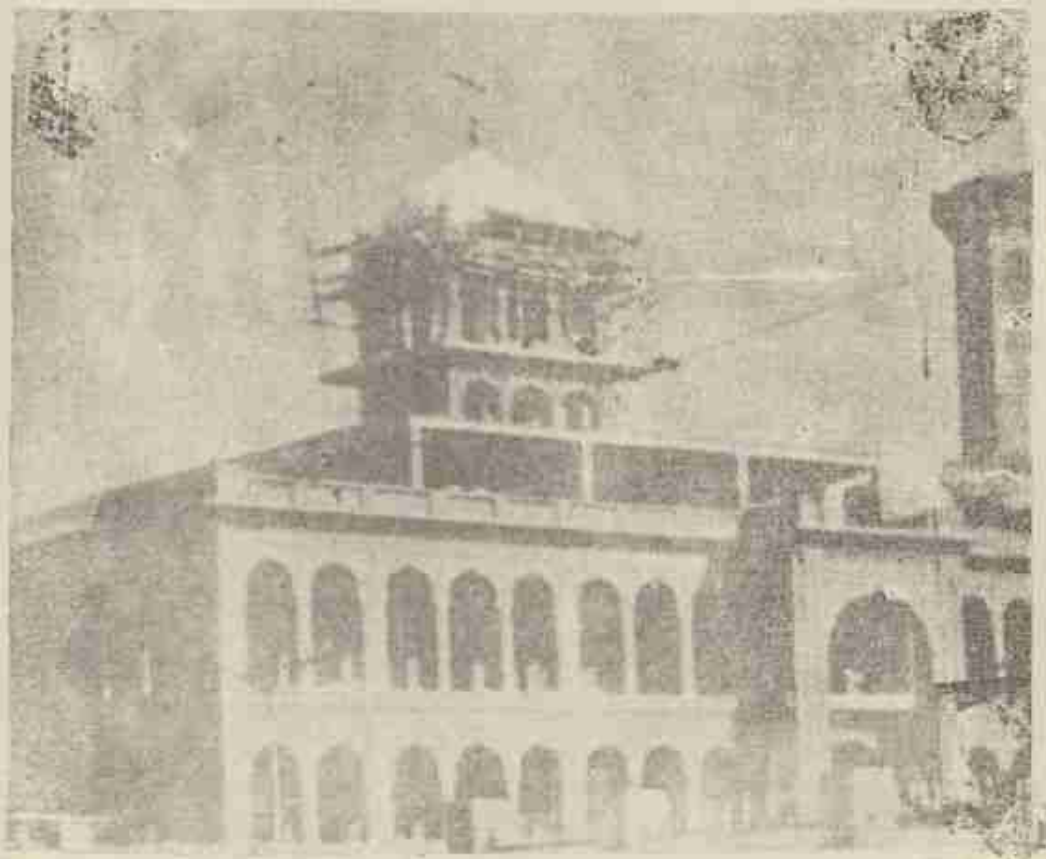
سرائے گرو رام داس جہاں چوک پراگ داس کی مسلمان لڑکیوں کو برہنہ جلوس کی شکل میں لے جایا گیا۔

مسٹر محمد شریف، مولوی غلام دستگیر اور خواجہ قمر الدین جو چوک پراگ داس کے حملے میں شدید زخمی ہوئے

چوک پراگ داس کے بادا گھنشام سنگھ اور میاں عبدالرشید — خواجہ عبدالرشید (جنہوں نے گندے نالے میں تیر کر جان بچائی)

ملک محمد مست، رائے بہادر لالہ پرکاش چند مہرہ اور چوک پراگ داس کے شہید مولوی عبدالمجید

پڑا فلک کو کبھی دل جلوں سے کام نہیں
جلا کے خاک نہ کر دوں تو داغ نام نہیں

تیسرا باب

خُون کا بدلہ خُون

پنڈت جواہر لال نہرو نے چوک پراگ داس کے المیئے کے مقابلہ میں چوک لوہگڑھ کی معمولی آتشزدگی کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا تو ان کے تعصب بھرے تبصرے کو سُن کر اسلامیانِ امرتسر کی آنکھوں میں خُون اتر آیا اور انہوں نے بھی خون کا بدلہ خون کا نعرہ لگا دیا۔ شریف پورہ کا علاقہ مسلمانوں کی آبادی پر مشتمل تھا۔ اس علاقے کے خواجہ محمد اختر، نسیم اور خورشید بٹ ریلوے لائن کے قریب بھائیوں والے باغ میں نوجوانوں کو عسکری تربیت دینے میں مصروف تھے کہ اس اثنا میں انہوں نے بھائیوں والے باغ کے قریب سے ایک ٹرین گزرتے دیکھی۔ اس ٹرین میں سفر کرنے والے حمید نامی نوجوان نے (جو شریف پورہ کے رہنے والے تھے) گاڑی کی زنجیر کھینچ لی اور ریلوے لائن پر پہرہ دینے اور تربیت حاصل کرنے والے شریف پورہ کے نوجوانوں کو بتایا کہ فلاں ڈبے میں بیٹھے ہوتے ہندو سکھوں نے ڈیرہ بابا نانک کے سٹیشن پر مسلمانوں کو تشدد کا نشانہ بنایا ہے۔ چنانچہ ایک نوجوان نے دوڑ کر انجن ڈرائیور کی چھاتی پر برچھا رکھ دیا اور اس کے بعد اس محلہ کے نوجوانوں نے ان متعصب ہندو سکھوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جنہوں نے ڈیرہ بابا نانک کے سٹیشن پر مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی تھی۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اس موقع پر شریف پورہ کے نوجوانوں خورشید بٹ، عزیز خاں، اکرم بٹ آف

ریڈیو پاکستان لاہور، اسلم عرف اچھی، غفور چارلی، شریف خاں، ماجد عرف ماجو، نسیم اختر نسیم، ٹھاپو ہا، خواجہ اختر حسین، شہزاد بٹ، مرتضیٰ بٹ، ناظر جیلانی، رفیق چودھری، حیدر، امین، شیخ حنیف، خواجہ رشید، غلام حسن صمد، طفیل جنرل والیہ، وحید احمد پرویز، لالہ راج پہلوان، حمید پانفروش، چودھری محمد شریف سائیکلوں والے اور میاں خالد محمود مالک لاہور سائنس کالج وغیرہ نے اسلامی رواداری کا ثبوت دیتے ہوتے نہ تو کسی بچے پر ہاتھ اٹھایا، نہ کسی عورت پر دست درازی کی اور نہ ہی کسی بے گناہ مسافر کو کچھ کہا۔ تھوڑی دیر کے بعد اہل محلہ نے ان متعصب ہندو سکھوں کی لاشوں کو ریلوے لائن کے قریب گندگی کے ڈھیر میں چھپا دیا۔ پولیس نے جائے واردات پر پہنچ کر اس علاقے کے اٹھارہ نوجوانوں کے خلاف قتل اور لوٹ مار کے مقدمات رجسٹر کر کے خورشید بٹ، اکرم بٹ، غفور چارلی، اسلم عرف اچھی، عزیز خاں، خواجہ رشید، شیخ عبدالرحمان، سلیم، ظہور اور نسیم اختر وغیرہ کو گرفتار کر لیا۔ بعد ازاں ہائی کورٹ سے چند ایک کی ضمانت ہو گئی اور کچھ نوجوان قیام پاکستان کے بعد قیدیوں کے تبادلہ کے سلسلہ میں پٹھانکوٹ جیل سے رہا ہوتے۔

الغرض امرتسر میں ہندوؤں سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان ایک ایسی دوڑ ایک ایسے مقابلے اور ایک ایسی لڑائی کا آغاز ہو گیا کہ جس کی ہار جیت کا فیصلہ اس بات سے ہوتا تھا کہ آج ہسپتال میں کس فرقے کی زیادہ لاشیں آتی ہیں؟

آج ہسپتال میں کس فرقے کے زیادہ زخمی آتے ہیں؟

آج شہر میں کس فرقے کے زیادہ مکانات جلے ہیں؟

چوک فرید کے جیالے

چوک پراگ داس اور چوک منی سنگھ کے شہیدوں اور ان کی جلی بجھی املاک کا قرض اتارنے کے لئے اسلامیانِ امرتسر کا بچہ بچہ زخم خوردہ شیر کی طرح بے چین تھا چنانچہ چوک فرید، رام باغ

اور لوہگڑھ کے چند جوشیلے نوجوانوں مثلاً پہلوان مرحوم، معراج دین عرف بھولا، انور حسین منٹو، نصیر خان مرحوم، عبدالرحمان، مولوی حسن، بشیر پہاڑیہ، رفیق گوٹے والا، جادا، گوگی، جانی، گامی، خلیفہ مٹو، محمود عرف مودا، سعید میمی، خواجہ محمد اسلم، سیٹھ اسحاق، اسحاق عرف ساقا، یعقوب عرف کربا، غازی، ماجھا کٹا، کوکل، غفور، محمد حسین، گونگا، نذیر کھبا، افضل عرف اجلا، جیرو اور بلندا وغیرہ نے سب سے پہلے اپنے سروں پر کفن باندھے اور میدان میں نکل آتے۔ انہوں نے میدانِ عمل میں اترنے سے قبل عہد کیا کہ اس وقت تک اپنی برچھیوں، خنجروں اور تلواروں کو نیام میں نہیں ڈالیں گے جب تک چوک پراگ داس اور چوک متاں سنگھ کے سینکڑوں شہیدوں کا بدلہ نہیں لے لیں گے۔ چنانچہ اس شیر دل گروپ کے دو سرکردہ نوجوان معراج دین عرف بھولا پہلوان اور انور حسین عرف منٹو پہلوان اپنے رفقاء سمیت جنگلی شیروں کی طرح صبح ہوتے ہی اپنے شکاروں کی تلاش میں نکل جاتے اور اس وقت تک گھروں کو نہ لوٹتے جب تک ان کی تلواریں آٹھ آٹھ دس دس غیر مسلموں کا خون نہ پی لیتیں۔ انہی دنوں کابل ہاؤس ہال بازار کے نیک دل مالکوں غلام محمد وائیں مرحوم اور ان کے صاحبزادے غلام مصطفےٰ وائیں نے ہزاروں تلواریں قیمتِ خرید پر مسلمانوں کے ہاتھوں فروخت کر کے ان کا حوصلہ بڑھایا۔

ایک روز بھولا اور منٹو اپنے شکار کی تلاش میں نکلے تو مہان سنگھ گیٹ کے قریب دو گرانڈیل سکھ ایک تانگے میں بیٹھ کر سلطان ونڈ کے دروازے کی طرف جاتے دکھائی دیتے۔ ان دونوں دوستوں نے فیصلہ کیا کہ ان کا تعاقب کیا جائے۔ وہ ان سکھوں کا تعاقب کرتے ہوئے سلطان ونڈ کے دروازے تک چلے گئے جو کہ ایک خطرناک علاقہ تھا۔ بھولا اور منٹو کے بیان کے مطابق انہوں نے ان سکھوں کو للکارا تو وہ مقابلہ کرنے کے بجائے تانگے سے کود کر اس سڑک کے مشرقی حصّہ پر واقع پانی والے تالاب میں اتر گئے۔ بھولا اور منٹو نے ان کے تعاقب میں چھلانگیں لگا دیں اور اس گندے تالاب میں انہیں ہمیشہ کی نیند سلا دیا۔ اسی طرح ایک روز امپیریل بنک کے قریب اکرام بٹ نے امرتسر خاتر بریگیڈ کے متعصب

سپرنٹنڈنٹ شرما کے پیٹ میں چھرا گھونپ دیا اور بکمالِ جرأت سے اس کا پستول چھین لیا۔

ادھر ہندوؤں اور سکھوں نے بھی راہ چلتے مسلمانوں پر اکّا دکّا حملے شروع کر رکھے تھے۔ چنانچہ شیخ صادق حسن مرحوم کا قالینوں کا کارخانہ فسادیوں نے نذرِ آتش کر دیا۔ شیخ صاحب کے بھائی شیخ احمد صادق جلے ہوئے کارخانے کا معائنہ کرنے گئے تو مہاسبھائی غنڈوں نے اُن پر بم پھینک کر بُری طرح زخمی کر دیا۔ بمبے والے کنوئیں کے پاس محمد حسین زرگر شہید کر دیئے گئے۔ موتی رام کے کٹڑہ میں سیٹھ محمد سرور آف سوہا بازار لاہور اپنے مکان کی چھت پر کھڑے تھے کہ ہندوؤں نے تھری ناٹ تھری کی گولی سے انہیں شدید زخمی کر دیا اور وہ ہسپتال میں کئی دن تک موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا رہے۔ بعدازاں اسی محلہ میں ممتاز شاعر نیّر امرتسری کی اہلیہ کو بھی فسادیوں نے گولی کا نشانہ بنایا۔ پاکستان کے سابق وزیر اعظم چودھری محمد علی کے برادرِ نسبتی ڈاکٹر جان محمد کے صاحبزادے عظیم خاں غوری کا مکان بالمقابل کوچہ داکھ والا متصل نمک منڈی بھی جلا دیا گیا۔ اسی طرح لاہوری دروازہ اور دائم گنج کے مسلمانوں نے حضرت فتح شاہ بخاریؒ کے مزار سے متصل "بھارت کولہو گھر" اور کھڈیوں کے کارخانوں میں آگ لگا دی جس کے نتیجے میں اس کولہو گھر میں تورِیہ، مونگ پھلی اور ہزاروں من تیل کا ذخیرہ ۱۲ یوم تک جلتا رہا۔

علاوہ ازیں چوک فرید کے جیالوں نے لالہ دونی چند ناگ پال ایڈووکیٹ کے مکان کو آگ لگائی تو اس کے شعلوں کی لپیٹ میں آکر حکیم رحمت اللہ کا مکان بھی جل کر راکھ ہو گیا۔

ڈاکٹروں کا کردار

امرتسر کے سول ہسپتال میں روزانہ لاشوں اور زخمیوں کی گنتی ہوتی۔ مسلمان زخمیوں اور شہیدوں کی دیکھ بھال اور پوسٹ مارٹم وغیرہ کا کام کوچہ ڈبگراں کے ممتاز مسلم لیگی کارکن جناب صادق شاہ (جو آجکل عبدالکریم روڈ پر رہائش پذیر ہیں) کی نگرانی میں ہو رہا تھا۔

ان کے علاوہ شہر کے متعدد سماجی کارکن بشیر احمد بختیار، سردار محمد صادق مرحوم، حاجی بشیر احمد، میاں خالد محمود، سرور رسانی، ملک محمد اکرم، راقم الحروف اور ملک محمد افضل وغیرہ ہسپتال میں مسلمان زخمیوں کے لئے وافر تعداد میں خون بہم پہنچانے میں مصروف تھے اور خود بھی کئی مرتبہ اس کار خیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے چکے تھے۔

صادق شاہ نے مسلم لیگ کی سول نافرمانی کے ایام کی اسیری کے عرصہ سے لے کر تقسیم ملک تک جس جوش و جذبہ سے کام کیا امرتسر کے سول ہسپتال میں مسلمان زخمیوں اور شہیدوں کی جس بے جگری سے دن رات خدمت کی اس سے نہ صرف ہسپتال کا عملہ بلکہ امرتسر کا بچہ بچہ بخوبی واقف ہے۔ وہ ڈاکٹر امیرالدین، ڈاکٹر حفیظ طوسی، ڈاکٹر شجاعت علی، ڈاکٹر نور محمد، ڈاکٹر ریاض قدیر، ڈاکٹر محمد یعقوب، ایمبولنس کار کے ڈرائیور انور اور ہسپتال کے اختر نامی اہلکار کے ذریعے بڑی ڈرامائی مراعات حاصل کرتے۔

سول ہسپتال کے متذکرہ ماہر ڈاکٹروں کی سرکردگی میں ہاؤس سرجن ڈاکٹر شریف (جو آجکل اوکاڑہ میں ہوتے ہیں) اور ڈاکٹر بشیر کے علاوہ میڈیکل کالج کے فرض شناس طالب علم ڈاکٹر منیر احمد (قسبت روڈ لاہور کے ڈاکٹر نذیر احمد کے بڑے بھائی آجکل لندن میں ہیں) ڈاکٹر ریاض الحسن (جو آجکل سمن آباد میں مقیم ہیں) وغیرہ نے کئی کئی راتیں جاگ کر زخمیوں کی جس انداز میں مسیحائی کی اور شہیدوں کا بر وقت پوسٹ مارٹم کیا۔ یہ ایک ایسی سرگزشت ہے جو تاریخ میں سنہرے حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ بعض اوقات ہندو ڈاکٹر ڈیوٹی پر ہوتے تو وہ مسلمان زخمیوں کی طرف سے توجہ ہٹانے کی کوشش کرتے یا غفلت برتتے تو صادق شاہ بپھرے ہوتے شیر کی طرح گرجتے اور اس وقت تک دم نہ لیتے جب تک مسلمان زخمیوں کے زخم سل نہ جاتے۔

یہ کیفیت صرف امرتسر شہر کے ہسپتال کی نہ تھی بلکہ جب فسادات کی آگ دوسرے شہروں قصبوں اور دیہات میں پھیلی تو بھارتی پنجاب کے قریباً ہر شہر اور قصبہ کے ہسپتالوں میں زیر علاج

مسلمانوں پر منظم حملے کئے جاتے۔ معدودے چند فرشتہ سیرت ڈاکٹروں کو چھوڑ کر بیشتر ہندو سکھ ڈاکٹر دکھی مسلمانوں کی مدد کرنے کے بجائے طبّی امداد مہیا کرنے میں صرف دانستہ طور پر کوتاہی کرتے تھے بلکہ اکثر اوقات جان لیوا ٹیکے لگا کر بزعم خویش یہ سمجھتے تھے کہ وہ ملّتِ اسلامیہ کے چراغوں کو گُل کر کے اپنے مذہب کی بہت بڑی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ لاہور کے ماہنامہ اردو ڈائجسٹ نے اگست ۷۹ء کے آزادی نمبر میں ضلع حصار کے شہر بھوانی کے سول ہسپتال پر ہندو سکھوں کے منظم حملے کی بابت عبدالمجید قریشی کا مضمون شائع کیا جس میں قریشی صاحب لکھتے ہیں۔ کہ "ہندو حملہ آوروں کی سنگدلی اور شقاوت کا یہ حال تھا کہ وہ بیمار مسلمانوں کو تہ تیغ کرنے کی غرض سے مقامی ہسپتالوں میں پہنچ گئے۔ سول ہسپتال میں جہاں ایک متعصب ہندو اسسٹنٹ سرجن تعینات تھا اس کے تعاون سے تمام مسلمان مریضوں کو شہید کر دیا گیا۔ اس کے بعد حملہ آوروں کے ایک گروہ نے آنکھوں کے ہسپتال کا رُخ کیا تو اس ہسپتال کے فرشتہ سیرت ڈاکٹر پرشوتم دت اور ان کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر نارائن داس نے ہسپتال کے تمام دروازے بند کر دئیے اور دونوں بھائی رائفلیں لے کر ہسپتال کی دوسری منزل پر پہنچ گئے۔۔۔ ڈاکٹر صاحب نے حملہ آوروں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ

"آپ لوگوں کا یہ اقدام انتہائی بزدلانہ ہے۔ قومی عصبیت اور سیاسی عداوت نے آپ کو دیوانہ بنا دیا ہے۔ آپ بھول گئے ہیں کہ دنیا میں انسانیت نام کی بھی کوئی چیز موجود ہے۔ آپ اتنے گِر چکے ہیں کہ دکھی اور بیمار انسانوں کی جان لینا شیوہ مردانگی سمجھتے ہیں۔ نہتے انسانوں کا قتل آپ کی نگاہ میں ایک بہت بڑا قومی کارنامہ ہے۔ اپنی اس ذلیل حرکت پر آپ کو شرم آنی چاہیئے۔ کل اس گھناؤنے فعل پر آپ پچھتائیں گے لیکن انسانیت آپ کو کبھی معاف نہ کرے گی۔ اب بھی وقت ہے کہ اس بیہودہ خیال سے باز

آجاتیے اور یہاں سے چلے جاتیے ورنہ جب تک ہم دونوں بھائیوں کے جسم میں جان اور ہماری رائفلوں میں گولیاں موجود ہیں، ہم آپ کو مسلمان مریضوں تک پہنچنے نہیں دیں گے۔"

ڈاکٹر صاحب کے ان الفاظ نے حملہ آوروں کے ایک حصے پر خوشگوار اثر ڈالا لیکن شرارت پسند عنصر نے مخالفانہ نعرے بلند کیتے۔ ان پر مسلمانوں کے ایجنٹ ہونے کا الزام لگایا اور انہیں مار ڈالنے اور ہسپتال کو نذرِ آتش کرنے کی دھمکیاں دیں مگر ڈاکٹر صاحب نے حوصلہ نہ ہارا۔ وہ ان کی دھمکیوں سے ذرا نہ گھبراتے۔ ان کے عزم راسخ کو دیکھ کر حملہ آوروں کے حوصلے پست ہو گئے اور وہ حملے کا ارادہ ترک کر کے چلے گئے۔

فرقہ پرستی اور نفرت کی اس خوفناک آندھی میں مسلمانوں نے بھی بے گناہ ہندوؤں سکھوں کی جانیں بچانے کے لئے کئی مقامات پر سر دھڑ کی بازی لگانے سے گریز نہ کیا۔ امرتسر کے کڑھ کرم سنگھ کی مسجد محمد شاہ کے سامنے والے مکان میں برصغیر کے مشہور بزرگ صحافی علامہ حسین میر کاشمیری مرحوم کے صاحبزادے ڈاکٹر عبدالرؤف (جو آجکل پنجاب کے محکمہ تعلیم میں ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن کے عہدہ پر فائز ہیں) رہائش رکھتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس علاقے کے مسلمان نوجوانوں کو عسکری تربیت دینے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ان کا مکان اس علاقے کے مجاہدین کی تنظیم کا ذیلی مرکز بنا ہوا تھا۔

ایک روز ڈاکٹر صاحب کے پڑوس میں کوئی دو سو کے قریب غیر مسلم مرد، عورتیں اور بچے اس علاقے سے سکونت ترک کر کے کسی محفوظ علاقہ میں جا رہے تھے کہ اس علاقہ کے مجاہدین کے ایک دستے نے ڈاکٹر صاحب کے مکان کے عین سامنے انہیں نرغے میں لے لیا۔ اس مرحلہ پر محلے داروں میں اس امر پر اختلاف رائے ہو گیا کہ نرغے میں آئے ہوئے غیر مسلموں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ چنانچہ معاملہ ڈاکٹر صاحب کے سامنے پیش ہوا تو انھوں نے فیصلہ دیا کہ انہیں غیر مسلح کر کے چھوڑ دیا جائے، ان کا مال و متاع نہ چھینا جائے اور نہ ہی عورتوں اور بچوں کو

تنگ کیا جاتے۔ مجاہدین نے دلیل پیش کی کہ غیر مسلموں کے نرغے میں آتے ہوئے مسلمانوں کے ساتھ وحشیانہ سلوک کیا جاتا ہے اس لئے غیر مسلموں کی حسین و جمیل دوشیزاؤں سے ہمیں بدلہ لینے کی اجازت دی جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان کو اسلامی رواداری اور اعلیٰ اخلاق کا نمونہ پیش کرنے کی تلقین کی جس کے جواب میں مجاہدین نے اشتعال کے باوجود ان غیر مسلموں کو کچھ نہ کہا۔ انہی دنوں امرتسر کے بعض نیک دل ہندوؤں کو مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی اور دوستی رکھنے کے جرم میں بعض مقامات پر اپنے فرقے کے متعصب افراد کی ناراضگی کا سامنا کرنا پڑا۔

لاہور کتاب گھر (ہال بازار) کے شریف الطبع مالک مسٹر ادم پرکاش اپنی مسلم دوستی کے باعث امرتسر کے متعصب ہندوؤں کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتے تھے۔ فرقہ وارانہ فساد کے ابتدائی ایام میں ان کے ہندو محلے داروں نے ان کا اس حد تک ناطقہ تنگ کیا کہ وہ اپنے اہل و عیال سمیت ہندوؤں کے محلے سے نقل مکانی کرنے پر مجبور کر دیئے گئے۔ چنانچہ یہ ریکارڈ کی بات ہے کہ وہ کئی دنوں تک مسلمانوں کی آبادی شریف پورہ میں عبدالحمید بٹ اور مظفر محسن بٹ کے مکان میں اپنے بیوی بچوں سمیت قیام پذیر رہے اور کسی نے اس محلہ میں ان کی موجودگی پر اعتراض نہ کیا۔

الغرض چوک پراگ داس کے شہیدوں کا بدلہ لینے کی تڑپ اسلامیانِ امرتسر کے اعصاب پر سوار ہو چکی تھی۔ چوک فرید کے بھولا پہلوان، منٹو پہلوان اور ان کے رفقاء۔ امرتسر کے متعصب ہندوؤں سکھوں کے لئے ملک الموت کا روپ دھار چکے تھے۔ ہال بازار کے سکھوں کی گول ہٹی اور بھاٹیوں کی دوکان پہلے ہی نذرِ آتش ہو چکی تھی۔ علاوہ ازیں ہال بازار کے مشہور دواتیوں والے بابو سورداس کی دوکان، لندن ہاؤس، راتل ٹاکیز اور راس کے چوراہے والے ہرے صرافوں کا فلک بوس مکان بھی جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ مجاہدین کے اس گروپ کو شیخ نذیر اف الگل سائیکل الیسا آتش گیر مادہ (سلوشن) دیتے تھے جس کے چھڑکنے سے ایسی آگ لگتی تھی کہ امرتسر کے فائر

بریگیڈ کے عملے کی تمام کوششیں ناکام ہو جاتی تھیں اور ہندوؤں سکھوں کے مضبوط اور بلند مکانات دیکھتے دیکھتے پیوند زمین ہو جاتے تھے۔ بھولا اور رنٹو گروپ کی ہندوؤں اور سکھوں پر اس حد تک دہشت بیٹھ چکی تھی کہ بسا اوقات ان کے تصور سے ہی ان کی دھوتیاں ڈھیلی ہو جاتی تھیں اور ہاتھوں سے بے اختیار کرپانیں چھوٹ جاتی تھیں۔ بھولا اور رنٹو کی بہادری کے کارناموں نے جہاں امرتسر کے مسلمانوں کے حوصلے بلند کر رکھے تھے وہاں نوعمر بچوں میں بھی شجاعت کی روح پھونک دی تھی۔ بعض نوعمر لڑکے ملحقہ گلیوں سے نکل کر ہال بازار سے پیدل گزرنے والے سکھوں پر دن میں کئی مرتبہ بڑی پھرتی سے حملہ کرتے اور ان سے کرپانیں چھین کر ملحقہ گلی میں گھس جاتے۔ انہی دنوں امرتسر کے ایک شاعر مسلم اویسی مرحوم نے سکھوں کی اس کیفیت کو اس طرح بیان کیا تھا جو آج بھی اسلامیان امرتسر کو ازبر ہے ؎

یہی سکھ سورما ہیں جن سے امرتسر کے بچوں نے
طمانچے مار کر چھینیں سرِ بازار شمشیریں

چھ سکھ زندہ جل گئے

یہ سلسلہ جاری تھا کہ لاہور کے بعد متحدہ پنجاب کا سب سے بڑا شہر امرتسر بڑی تیزی کے ساتھ کھنڈروں میں تبدیل ہونے لگا۔ اس صورتِ حال نے امرتسر کے ہندوؤں سکھوں اور پولیس کے حکام کو پریشان کر کے رکھ دیا۔ چنانچہ امرتسر کی انتظامیہ نے اعلان کر دیا کہ جس محلے میں کسی بھی فرقے کے فرد کو چھرا گھونپا جائے گا یا تشدد کی واردات ہوگی اس محلے پر پانچ پانچ دس دس ہزار سے لے کر بیس بیس ہزار روپے تک جرمانہ ہوگا اور جبراً وصول کیا جائے گا۔ انتظامیہ کے اس فیصلے کی ابھی سیاہی بھی خشک نہ ہونے پاتی تھی کہ ایک روز کرفیو کے دوران لاہوری دروازہ کے شنکر داس نبھی نامی ہندو عورت، سلطان ونڈ کے مشہور سکھ بدمعاشوں ہری سنگھ اور کالا سنگھ کے گروپ کے چھ لمبے تڑنگے سکھوں سمیت ایک ہندو بچے کو ونانے کے لئے قلعہ کی

پہ بڈ گراؤنڈ سے ہوتے ہوتے ہندوؤں کے بچوں کے قبرستان (مڑھیاں) کی طرف جا رہے تھے کرنواں کوٹ داتم گنج کے مسلمانوں نے جب انہیں دور سے اپنی آبادی کی طرف آتے دیکھا تو عید گاہ ڈیفنس کمیٹی کے صدر میاں معراج دین کو اطلاع دی چنانچہ میاں صاحب نے مردہ بچہ دفنانے والوں کے قریب جا کر کہا کہ آپ لوگ فکر نہ کریں ہم آپ کو کچھ نہیں کہیں گے۔ آپ میرے ہمراہ مڑھیوں کی طرف چلیں۔ بچے کو دفنائیں اور چھاتیاں تان کر چلنے کے بجائے انکساری کے ساتھ لوٹ جائیں۔ چنانچہ ان لوگوں کو لے کر میاں معراج دین مڑھیوں کی طرف چل پڑے۔ میاں معراج دین (جو تقسیم کے بعد مغل پورہ کے حلقہ رام گڑھ میں آباد ہوئے اور وہاں کے بی ڈی ممبر منتخب ہوتے تھے) کے بیان کے مطابق ٹھنکر داس اور لیکھی عورت نے مردہ بچے کو وہی لگایا۔ غلام محمد عرف گامے گورکن نے گڑھا کھودا۔ ٹھنکر داس نے گڑوی سے پانی چھڑکا اور بچے کو دفنا دیا۔ اس کے بعد وہ میاں معراج دین کی معیت میں عید گاہ داتم گنج کی مسلمان آبادی عبور کرنے لگ پڑے۔

وہ لوگ میاں معراج دین کے ہمراہ باتیں کرتے ہوتے چل رہے تھے کہ میاں صاحب نے انہیں سمجھایا کہ آپ لوگوں کو میں نے اپنی حفاظت میں مڑھیوں تک پہنچایا، بچے کو دفن کرایا ہے اس لئے آپ ہماری آبادی سے گزرتے ہوتے سینے تان کر نہ چلیں کیونکہ عین ممکن ہے آپ لوگوں کو اس طرح چلتے دیکھ کر کوئی مسلمان طیش میں آجاتے۔ چنانچہ میاں معراج دین کو (ہندو بچہ دفنانے کے لئے) گرا بیرا آتے ہوتے سکھ بدمعاشوں نے جواب دیا کہ ہم نے کون سی چوڑیاں پہن رکھی ہیں؟

کیا مسلمانوں کو جرک براگ داس والا واقعہ بھول گیا ہے؟

میاں معراج دین نے جب ان احسان فراموش بدمعاشوں کے نازیبا کلمات سنے تو انہوں نے داتم گنج کے مسلمانوں کی غیرت کو آواز دیتے ہوتے کہا کہ

"مسلمانو — ان احسان فراموش سکھوں کو زندہ بچ کر نہ جانے دو۔ پکڑ لو۔ اگر یہ بچ کر نکل گئے تو جا کر کہیں گے کہ داتم گنج کے مسلمان بے غیرت اور بُزدل ہیں۔"

میاں صاحب کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے عید گاہ داتم گنج اور ملحقہ گلیوں سے صدیق آف عید گاہ (جو تقسیم کے بعد کراچی آباد ہوئے) مخبر پسر غلام حیدر (جو تقسیم کے بعد شاہ عالمی میں آباد ہوئے) سراج دین حلواتی مرحوم اور عبدالحق (جو تقسیم کے بعد ملتان آباد ہو گئے) برچھے لے کر بڑھے۔ اس اثنا میں میاں معراج دین اس سکھ کو خنجر گھونپ چکے تھے جس نے اشتعال انگیز الفاظ کہے تھے۔ چند لمحوں بعد مذکرہ سکھ بدمعاش (جنہوں نے آخر دم تک خوب ڈٹ کر مقابلہ کیا) میدان میں دم توڑ رہے تھے البتہ ہندو عورت لُچھی کو مسلمانوں نے عورت ذات کے ناطے کچھ نہ کہا اور اسلامی رواداری کا بے مثال مظاہرہ کیا۔ وہ چاہتے تو اس عورت کے ساتھ ہر قسم کی زیادتی کر سکتے تھے اور پراگ داس کے چوک کی شہید اور بے آبرو ہونے والی مسلمان دوشیزاؤں کا بدلہ لے سکتے تھے لیکن مسلمانوں کو تو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے دشمن کی عورتوں تک کے احترام کا درس دیا ہے۔

مذکرہ چھ سکھ بدمعاش لالہ شنکر داس سمیت ابھی سسک رہے تھے کہ طفیل تھانیدار کے ٹال سے لکڑیاں اکٹھی کر کے ان پر پٹرول چھڑک دیا گیا اور اس طرح وہ سب کے سب اپنے انجام کو پہنچ گئے۔

لُچھی کو داتم گنج کے ایک مسلمان نے سائیکل پر بٹھا کر چاچے عمر کے تکیے اور حضرت شیخ شاہ بخاری کے مزار کے قریب واقع سیتلا مندر پہنچا دیا۔ اسلامی رواداری کا یہ مظاہرہ بعد میں مسلمانوں کو بہت مہنگا پڑا۔

ہندو سکھوں کی لاشوں سے شعلے بلند ہو رہے تھے کہ لاہوری دروازہ کے تھانیدار مسٹر ثناء اللہ آگئے۔ وہ پولیس کے سپاہیوں کی مدد سے قریبی کھائی سے پانی فراہم کر کے

آگ بجھانے میں مصروف تھے کہ اس علاقے کو فوج نے گھیرے میں لے لیا اور فائرنگ کر کے تمام علاقے میں سراسیمگی پھیلا دی۔ دائم گنج اور اس کی ملحقہ گلیوں کے مسلمانوں نے متوقع تلاشیوں کے اندیشے کے پیش نظر جائے واردات سے خون کے دھبے دھو ڈالے تھے اور تمام اسلحہ محفوظ ٹھکانوں میں چھپا دیا تھا۔ چنانچہ جب تلاشیاں لی گئیں اور بے شمار لوگوں کو حراست میں لے لیا گیا تو کسی کے گھر سے کوئی اسلحہ برآمد نہ ہوا۔ اس موقعہ پر دائم گنج اور اس کے ملحقہ گلی کوچوں کے مسلمانوں پر فی مکان ۲۵ روپے کے حساب سے تاوان لگا دیا گیا جو انتظامیہ نے چند لمحوں میں موقع پر ہی وصول کر لیا۔ ڈیڑھ سو کے لگ بھگ مسلمان گرفتار کر لیے گئے جن میں سے آٹھ پر ہندو سکھوں کو زندہ جلا دینے کے الزام میں مقدمہ درج کیا گیا اور پولیس نے لچھمی نامی عورت کے ساتھ چند مزید موقع کے فرضی گواہ ڈال دیئے تاکہ عینی شاہدوں کی کثرت سے مقدمہ زیادہ مضبوط ہو جائے۔

چوک پراگ داس کے مقدمے کی سماعت یہودی جج مسٹر سے کر رہے تھے اور دائم گنج کے متذکرہ واقعہ کے مقدمہ کی سماعت امرتسر کے ایڈیشنل سیشن جج جسٹس شبیر احمد (جو تقسیم کے بعد لاہور ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے تھے) کی عدالت میں ہو رہی تھی۔ موخر الذکر مقدمہ میں بھی لاہور سے بیرسٹر فرخ حسین اور خواجہ فیروز الدین احمد (مرحومین) کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ ان کے علاوہ مولوی سراج الدین پال، خواجہ غلام مصطفےٰ تایک، شیخ عنایت اللہ، چودھری محمد لطیف، چودھری ظہور الدین پال، شیخ عبدالروف، ملک عبید اللہ، سید ابوالحسن، چودھری حمید اللہ اور شیخ مجید وغیرہ رضاکارانہ طور پر مقدمہ کی پیروی کر رہے تھے۔ —

امرتسر کی جیل شہر کے سینکڑوں مسلمانوں، ہندوؤں سکھوں سمیت ڈیفنس آف انڈیا رولز کی دفعہ ۳ کے تحت گرفتار ہونے والوں سے کھچا کھچ بھر چکی تھی۔ چوک پراگ داس اور دائم گنج کے قتل کے ملزموں کے علاوہ شہر کے مختلف فرقوں کے قاتلوں کی بھی معقول تعداد امرتسر جیل میں محبوس تھی۔ ایک روز جیل کے اندر لنگر خانے میں میاں معراج دین اور امرتسر

کے مشہور ہندو بدمعاش نکے جھٹکی کے درمیان تلخ کلامی ہوگئی چنانچہ اس موقع پر مصطفے اٹھگے اور میاں معراج دین نے اس کی خوب مرمت کی جس سے، جیل میں بہت شور مچا اور ہنگامہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔

میاں معراج دین نے داڑھی مونڈھ لی

داتم گنج کے مقدمہ میں ماخوذ ملزموں کی شناخت پریڈ ہونے لگی تو چند گھنٹے قبل میاں معراج دین نے کہیں سے بلیڈ لے کر اپنی داڑھی مونڈھ لی۔ علی الصبح شناخت پریڈ کے لئے ہندو مجسٹریٹ آیا تو اس نے لُبھّی کو آٹھ آدمیوں میں سے میاں معراج دین کو پہچاننے کے لئے کہا۔ لُبھّی نے ان آٹھ آدمیوں کے چہروں کو بغور دیکھا۔ حافظے پر زور ڈالنے کے بعد اس نے کریم بخش نامی داڑھی والے مسلمان پر انگشت نمائی کرتے ہوتے کہہ دیا۔ کہ

"یہ معراج دین ہے"

اسے قدرت کا کرشمہ سمجھئے کہ چشم دید گواہ لُبھّی کے بعد پولیس کے ڈالے ہوتے موقع کے تین دیگر فرضی ہندو گواہ بھی میاں معراج دین کی شناخت نہ کر سکے۔ غیر مسلموں نے جیل میں شور مچا دیا کہ میاں معراج دین جیل سے بھاگ گیا ہے لیکن شناخت پریڈ کے بعد میاں معراج دین نے جب اپنی موجودگی ثابت کی تو غیر مسلم پریشان ہوگئے۔

میاں معراج دین کی شناخت نہ ہونے کی خوشی میں جیل کے باہر باجے بجے اور خوشیاں منائی گئیں۔ میاں معراج دین کے علاوہ جن دیگر سات مسلمانوں پر مقدمہ چلا ان میں صدیق، فخر، سراج اور عبدالحق وغیرہ شامل تھے۔ میاں صاحب کو جیل کے حکام نے بلیڈ رکھنے کے الزام میں پندرہ دن کے لئے جیل کی اس کوٹھڑی میں بیڑیاں پہنا کر بند کر دیا جو انتہائی خطرناک ملزموں کے لئے مخصوص ہوتی ہے۔

داتم گنج کے مسلمان چوک پراگ داس کے شہیدوں کا خون کا بدلہ اتار چکے تو ہال بازار سے

گزرنے والے سکھوں سے کرپانیں چھیننے کی وارداتوں میں زبردست اضافہ ہوگیا جس نے ہندوؤں سکھوں اور مقامی انتظامیہ کو پریشان کر دیا۔ چنانچہ ہال بازار میں سکھوں کی کرپانیں چھیننے کی وارداتوں کی روک تھام اور نگرانی کے لئے گوربچن سنگھ نامی اے ایس آئی مامور ہوا۔ اس کو اس ڈیوٹی پر مامور ہوتے بمشکل ایک روز گزرا تھا کہ ایک مسلمان نوجوان جانی نے اس کے پیٹ میں چھرا گھونپ دیا۔ گوربچن سنگھ کو ہسپتال پہنچنے تک کافی وقت لگ گیا جس سے اس کا بہت سا خون بہہ گیا۔ چنانچہ صادق شاہ کے بیان کے مطابق ہندوؤں سکھوں نے اس کے لئے خون کی چالیس بوتلیں فراہم کر کے دیں، تب کہیں جاکر وہ موت کے منہ کا نوالہ بننے سے بچا۔ مقامی پولیس نے اس ضمن میں سول لائنز لاہور کے سابق بی ڈی ممبر ڈاکٹر احمد حسن (جو نسبت روڈ پر پریکٹس کرتے ہیں) کے والد ڈاکٹر غلام حسن مرحوم (جن کی دوکان غلام نبی اینڈ سنز کے قریب یہ واقعہ ہوا تھا) کو قاتلانہ حملہ کرنے والے مسلمان کا نام پتہ ظاہر نہ کرنے کے الزام میں گرفتار کر لیا اور پندرہ بیس روز تک ڈاکٹر صاحب جیسے شریف اور معزز شہری کو قلعہ میں محبوس رکھا

مقامی پولیس اس واقعہ سے سخت خوفزدہ ہو گئی۔ جس محلّے کے قریب متذکرہ سکھ پولیس افسر کو چھرا گھونپا گیا تھا اس کی ملحقہ آبادی کو چہ جیل خانہ وغیرہ پر تاوان عائد کر کے وصول کر لیا گیا۔ اس طرح کی متعدد وارداتیں چوک فرید، پیلا ہسپتال، ہاتھی گراؤنڈ، کٹڑہ کرم سنگھ اور شہر کی مختلف آبادیوں میں بھولا، منٹو اور دیگر نوجوانوں کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوئیں جن کے جرمانے مسلمانوں نے خندہ پیشانی سے ادا کئے۔ کٹڑہ کرم سنگھ کے مسلمانوں پر عائد ہونے والا تاوان اس محلّے کے صاحبِ ثروت اور مخیّر گھرانے کے خیردین پہلوان مرحوم، چودھری محمد عمر اور چودھری محمد شریف (جو آجکل نسبت روڈ پر مقیم ہیں) نے دو مرتبہ اپنی ذاتی جیب سے ادا کیا۔ انہی دنوں امرتسر کا متعصب ہندو تھانے دار کندن لال مہتہ کرفیو کے اوقات میں کٹڑہ کرم سنگھ کے واحد مذاری مرحوم کے بیٹے کو گرفتار کرنے گیا تو اس علاقے کے خیردین پہلوان کی

بیوی اور حبیب اللہ بٹ (فیصل آباد) کی صاحبزادیوں نے کمال بہادری سے اپنے مکان کی چھتوں سے اینٹوں کی بارش کر کے مہتہ تھانیدار کو بھگا دیا۔ بعدازاں کرفیو کے وقفہ کے دوران ملحقہ آبادی کے مسلمانوں نے ان گھرانوں کی خواتین کو ان کی مثالی جرأت پر مبارک باد دی۔

ایک طرف کندن لال مہتہ شہر کے مختلف علاقوں میں اِکا دُکا آنے جانے والے مسلمانوں کو گولیوں کا نشانہ بنا رہا تھا تو دوسری طرف متعدد غیر مسلم پولیس افسر بھی راہ چلتے مسلمانوں پر گولیاں چلا کر انہیں شہید کر رہے تھے۔ اس صورتِ حال نے امرتسر کے مسلمانوں میں سخت تشویش پیدا کر دی تھی چنانچہ اسی قسم کی وارداتیں کرنے والے ایک ہندو حوالدار کو عید گاہ دآم گنج کے عبدالحق (جو آجکل ملتان ہوتے ہیں) نے ایک روز موقع پا کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس واقعہ کے عینی شاہد چودھری دین محمد آف سمن آباد فیصل آباد کے بیان کے مطابق وہ متعصب حوالدار کرفیو کے اوقات میں بدنیتی سے سائیکل پر سوار جو الاملو رملز کی طرف سے لاہوری دروازے کی جانب جا رہا تھا کہ عبدالحق نے درخت کی اوٹ سے نکل کر نہایت دلیری سے اس کو برچھا مار کر ہلاک کر دیا۔ وہ حوالدار جب ٹھنڈا ہو گیا تو محلے داروں نے تاوان اور گرفتاری سے بچنے کے لئے اس کی لاش اس کنوئیں میں پھینک دی جس کے پانی کو امرتسر کے ہندو دسہرے کے تہوار کے موقع پر تبرک سمجھ کر پیا کرتے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد نواں کوٹ دآم گنج کے حوالدار ضمیر شاہ ڈیوٹی سے فارغ ہو کر اپنے گھر پہنچے تو محلے داروں کی زبانی انہوں نے جب اس حوالدار کے ہلاک ہونے اور کنوئیں میں پھینکنے کی روداد سُنی تو انہوں نے اہلِ محلہ کو ڈانٹتے ہوئے مشورہ دیا کہ لاش کی بدبو پھیلتے ہی یہ راز فاش ہو جائے گا اور علاقہ پر تاوان لگنے کے ساتھ ساتھ گرفتاریاں بھی عمل میں آئیں گی چنانچہ اس محلے کے چند نوجوانوں نے کنوئیں میں اُتر کر حوالدار کی نعش کو رسے سے باندھ کر باہر نکالا اور اس آبادی کے ملحقہ قبرستان کے پاس مصلیوں کے گاؤں میں گڑھا کھود کر دفن کر دیا۔ اہلِ محلہ نے اس حوالدار کی رائفل اور کارتوس عبدالحق کو انعام کے طور پر دے دیئے۔

مہا سبھائی غنڈے کی بیٹی کا ڈولا

بھولا پہلوان نے شیام نامی مہاسبھائی بدمعاش کو کٹڑہ گھنییاں میں جس دلیری سے تہ تیغ کیا وہ بھولا پہلوان کے بیان کے مطابق ان کی زندگی کا یادگار کارنامہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

ایک روز راقم نے بھولا پہلوان سے اس گرانڈیل بدمعاش کے قتل کی تفصیل پوچھی تو انہوں نے بتایا کہ شیام کٹڑہ گھنییاں کی ملحقہ گلی (جس کا نام ارڑیاں والی گلی تھا) میں رہتا تھا۔ وہ لمبے بھاری تنومند اور کسرتی جسم کا مالک تھا کہ اس کے سامنے میرا قامت بونوں جیسا لگتا تھا اور اس کی بھوتوں جیسی شکل وصورت اور قد کاٹھ کو دیکھ کر اچھا بھلا حوصلہ مند انسان خوفزدہ ہو جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کو اپنی قوت بازو کا بہت گھمنڈ تھا اور اس نے اپنے محلے کے ہندوؤں سکھوں کے ذریعے ہمارے گروپ کے ارکان تک اپنا یہ چیلنج پہنچایا تھا کہ جو کوئی شیام کو زیر کرے گا یا موت کے گھاٹ اتارے گا اس کو شیام انعام کے طور پر اپنی جوان بیٹی کا ڈولا (یعنی رشتہ) دے گا۔ چنانچہ اس کے چیلنج کو قبول کرتے ہوئے میں نے اس کو ٹھکانے لگانے کا تہیہ کیا تو میرے دوستوں اور ساتھیوں نے مجھے سمجھایا کہ بھولا پہلوان یہ درست ہے تم نے متعدد ایسے نڑ ننگے ہندوؤں سکھوں کو اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر موت کے گھاٹ اتارا ہے لیکن شیام ہر وقت مسلح رہتا ہے اور پہلوانی کے داؤ پیچ سے بھی بخوبی واقف ہے اس لئے تم اس کو تن تنہا قتل کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ لیکن میں نے اپنے دوستوں اور ساتھیوں کو جواب دیا کہ اگر شیام کو دو چار آدمیوں نے مل کر قتل کیا تو غیر مسلم ہمارے اس اقدام پر معترض ہوں گے اور طعنہ دیں گے کہ چار آدمیوں نے گھیر کر شیام کو قتل کیا ورنہ وہ کبھی زیر نہ ہوتا۔ چنانچہ میں نے ایک روز اپنے دل میں پختہ فیصلہ کر لیا کہ شیام بدمعاش کو اپنے ساتھیوں کی مدد کے بغیر قتل کروں گا اور قدرت ضرور میری مدد کرے گی کیونکہ شیام سے میری کوئی ذاتی دشمنی تو ہے نہیں — اور یہ کام تو اسلامیان امرتسر کے نام کو سربلند کرنے کے لئے کرنا ہے۔ مجھے اس سے کون سا ذاتی مفاد حاصل کرنا ہے۔ خدا

کی قدرت دیکھتے ایک روز کرفیو لگا ہوا تھا۔ مجھے ایک محلے دار نے بتایا کہ کرفیو کے باوجود شیام لروڑیاں والی گلی کے اس موڑ پر کھڑا ہے جو کٹڑہ گھنیاں کی جانب واقع ہے۔ چنانچہ اس وقت میرے پاس میرے دوست خواجہ محمد اسلم (جو آجکل ریلوے کے سپرنٹنڈنٹ آفیسر ہیں) بیٹھے تھے۔ انہوں نے پہلے تو مجھے سمجھایا کہ بھولا جی اس وقت یہ کام کرنا مناسب نہیں کیونکہ کرفیو لگا ہوا ہے اور مقامی پولیس کرفیو کی خلاف ورزی کرنے والے غیر مسلموں کو تو کچھ نہیں کہتی اور اگر ہم کو کسی نے دیکھ لیا تو خواہ مخواہ دھر لئے جائیں گے۔ میں نے خواجہ اسلم سے کہا کہ خواجہ تم نے ہر مشکل وقت اور واردات میں میرا ساتھ دیا ہے یقین جانو۔ میرا دل اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ آج قدرت میرے ہاتھوں سے شیام کے غرور کو خاک میں ملانا چاہتی ہے اس لئے مجھے یہ کام کرنے سے نہ روکو۔ چنانچہ ہم دونوں چھپتے چھپاتے اس مقام کے قریب پہنچ گئے جہاں شیام ٹہل رہا تھا۔ ابھی ہم موقع کی تاک میں تھے کہ ایک فوجی جیپ ہال بازار کی طرف سے کٹڑہ گھنیاں میں داخل ہوتی نظر آئی۔ ہم دونوں دوڑ کر شیخ مظفر (جو آجکل بخشی مارکیٹ انارکلی میں ہوتے ہیں) کی حویلی میں چھپ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب وہ جیپ نظروں سے اوجھل ہو گئی تو میں نے شیخ مظفر کی حویلی کی دیوار کے ساتھ لگ کر شیام پر ایک نظر ڈالی۔ وہ بدمست ہاتھی کی طرح جھوم جھوم کر اور اکڑ اکڑ کر ٹہل رہا تھا۔ اس کی کمر میں خنجر لٹک رہا تھا۔ اس کے بلند قد و قامت کو دیکھ کر پہلے تو مجھ پر خوف سا طاری ہوا لیکن کسی انجانی طاقت اور جذبے نے چشم زدن میں میرا خوف دور کر دیا اور میں یا علیؓ کا نعرہ مار کر عقابی انداز میں اس پر جھپٹ پڑا۔ میرے ہاتھ میں جو خنجر تھا میں نے اُچھل کر اس کی شہ رگ کے قریب پورے زور سے گھونپ دیا۔ شیام نے مجھے اپنی آہنی گرفت میں اس طرح جکڑ لیا جس طرح کوئی دس گیارہ سال کے بچے کو گود میں جکڑ لیتا ہے۔ میں نے اس کی شہ رگ میں پھنسے ہوئے خنجر کو نکالنے کی جب پہلی مرتبہ کوشش کی تو ناکام رہا۔ دوسری مرتبہ کوشش کرنے لگا تو میں نے دیکھا کہ شیام اپنے داہنے ہاتھ سے اپنی کمر پر لٹکے ہوئے خنجر کو نیام سے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا چنانچہ میں نے اپنے آپ کو موت کے

منہ سے نکالنے کے لئے "یا پیر۔ دستگیر مدد کر" کا وِرد کرتے ہوتے پوری قوت سے اپنے خنجر کو اس کی بھینس جیسی موٹی گردن سے نکال لیا۔ خنجر کے گردن سے آزاد ہوتے ہی خون کا اتنا بڑا فوارہ اس کی گردن سے پھُوٹا کہ لفظوں میں وہ کیفیت بیان نہیں ہو سکتی۔ میں نے شیام کی گرفت تھوڑی ڈھیلی ہوتے دیکھی تو خنجر کا دوسرا وار اس کے بائیں بازو پر کر کے خود کو اس کی گرفت سے چھڑا لیا۔ شیام زمین پر دھڑام سے گر گیا اور میں شیخ مظفر کی حویلی کے بڑے دروازے کی طرف لپکا۔ خواجہ محمد اسلم پریشانی اور خوشی کے مِلے جُلے جذبات سے مغلوب تھے۔ ہم دونوں نے وہاں کھڑے ہو کر شیام کے تڑپنے اور دمِ واپسیں کا منظر دیکھا۔ یوں لگتا تھا جیسے شیام کے بدن سے خُون کا دریا بہہ رہا ہے۔ میں نے اسے آواز دی "او تے شیام یاد رکھنا میں نے یہ کام تمہاری بیٹی کا ڈولا لینے کے لئے نہیں کیا بلکہ تم نے امرتسر کے مسلمانوں کو جو چیلنج دیا تھا اس کو قبول کرتے ہوتے تمہارے غرور کو خاک میں ملانا اور اسلامیانِ امرتسر کے نام کو سربلند کرنا مقصود تھا۔" اور یہ کہہ کر ہم دونوں (بھولا پہلوان اور خواجہ محمد اسلم) شیخ مظفر کے مکان کو پھلانگ کر بجلی والے چوک کی نیم والی گلی میں داخل ہو گئے۔ وہاں خُون آلود کپڑے تبدیل کرنے کے بعد چوک فرید پہنچ گئے۔ بعد ازاں مقامی پولیس نے شیام کے قتل کا تاوان ملحقہ گلی کوچوں کے مسلمانوں سے وصول کیا۔ شیام کا قتل کافی عرصہ تک عام لوگوں کے لئے نہ صرف معمّہ بنا رہا بلکہ بھولا پہلوان کے بیان کے مطابق بعض منچلے اپنے دوستوں کی محفلیں گرمانے اور اپنا قد بڑھانے کے لئے اُن کے اس کارنامے کو اپنی ذات سے منسوب کرتے رہے۔

چاہ کن را چاہ در پیش

الغرض شہر میں اس قسم کی وارداتوں کا سلسلہ جاری تھا کہ ان وارداتوں کو رد کرنے کے سلسلہ میں انتظامیہ کا تاوان ڈالنے کا حربہ کافی حد تک کامیاب ثابت ہوا جس کے نتیجے میں کچھ عرصہ کے لئے خنجر زنی اور آتشزنی کی وارداتیں تھم گئیں۔

ماسلامیانِ امرتسر چوک پراگ داس کا قرض اتارنے میں مصروف تھے کہ ایک روز امرتسر کے مذہبی پیشوا مولوی عبدالسلام ہمدانی نے چوک پراگ داس میں جمعہ کی نماز پڑھنے کا اعلان کر دیا۔

اس اعلان میں چونکہ زبردست جذباتی کشش تھی اس لئے امرتسر کے مسلمان مولوی ہمدانی کے اعلان کردہ جمعہ کی آمد کا بے صبری سے انتظار کرنے لگے۔ انہوں نے جس روز چوک پراگ داس میں اس محلہ کی شہید ہونے والی مسجد کے قریب نماز پڑھنی تھی اسی روز کا ذکر ہے کہ دن کے دس بجے چوک پراگ داس کے قریب کوچہ پنجاب سنگھ کے باہر ایک مکان میں چند سکھ خالصہ کالج کے ایک ممتاز پروفیسر کی سرکردگی میں ایک ایسا خوفناک بم بنانے کی تیاریوں میں مصروف تھے جس کے پھٹتے ہی چوک پراگ داس میں جمعہ کی نماز ادا کرنے والے ہزاروں مسلمان ہلاک ہو جائیں۔ خدا کی قدرت دیکھئے کہ ایک طرف متذکرہ سکھ بم بنانے میں مصروف تھے اور دوسری طرف مسلمانانِ امرتسر سروں پر کفن باندھ کر چوک پراگ داس میں نمازِ جمعہ ادا کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ نمازِ جمعہ سے دو اڑھائی گھنٹے قبل سکھوں کا تیار شدہ بم خود بخود پھٹ گیا اور اس بم کے پھٹتے ہی اس مکان کی تینیں چھتیں فضا میں روئی کے گالوں کی طرح اڑ گئیں۔ خالصہ کالج کے پروفیسر اور اس کے رفقاء مسلمانوں کے لئے جو کنواں کھود رہے تھے قدرت نے ان سب کو اس میں دھکیل کر فنا کر دیا تھا۔ اس خوفناک بم کو پھٹے ہوتے ڈیڑھ دو گھنٹے گزر چکے تھے اور اسلامیانِ امرتسر جوق در جوق چوک پراگ داس کی طرف نماز پڑھنے جا رہے تھے۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ نمازِ جمعہ کے اعلان کے ساتھ یہ تاکید بھی کر دی گئی تھی کہ چونکہ اس محلے میں وضو کے لئے پانی کا معقول انتظام نہیں ہو سکتا اس لئے نمازی حضرات وضو کے لئے مٹی کے لوٹے ساتھ لیتے آئیں۔ امرتسر کے نوجوان منچلوں کی مختلف ٹولیاں (جن میں بوڑھے بھی اور جوان بھی شریک تھے) اسلامی جذبات سے سرشار شہر کے مختلف حصّوں سے چوک پراگ داس کی طرف بڑھ رہی تھیں

راقم الحروف بھی شریف پورہ کے چند نوجوانوں خلیفہ مصطفےٰ آف گول مسجد، اسلم عرف

اچھا آف جامع مسجد اور صدیق وغیرہ کے ہمراہ نمازِ جمعہ ادا کرنے چوک پراگ داس کی طرف روانہ ہوا۔ بودی سائیں کے تکیہ سے ذرا آگے مہاں سنگھ گیٹ کو عبور کر کے ہم سلطان ونڈ کے دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے کہ ایک ضعیف العمر گوالن سڑک سے گوبر اٹھاتی دکھائی دی۔ اس بوڑھی گوالن نے جب ہمیں اپنے قریب سے گزرتے دیکھا تو پوچھا کہ "آپ لوگ بھی نماز پڑھنے جا رہے ہیں۔ ہم نے اثبات میں جواب دیا تو مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس عورت نے اپنی پھٹی ہوئی اوڑھنی پھیلائی اور قبلہ رُخ ہو کر ہماری سلامتی کی دُعا مانگی اور کہا "جاؤ بیٹو۔ خدا تمہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے"۔

امرتسر کا لوٹا ماتم

اس بوڑھی گوالن کی دُعا نے ہمیں ایک نیا عزم عطا کیا۔ ہم تیزی کے ساتھ منزلِ مقصود کی طرف بڑھنے لگے۔ ابھی ہم سلطان ونڈ کے دروازے پر پہنچ کر اس بازار میں داخل ہونے ہی لگے تھے جو چوک متاں سنگھ اور چوک پراگ داس کی طرف نکلتا ہے کہ کیا دیکھتے ہیں سڑک کے دو رویہ ہندو سکھ تلواروں کے دستوں پر ہاتھ رکھے کھڑے ہیں اور درمیان والی سڑک پر سے نہتے مسلمان نمازِ جمعہ پڑھنے کے لئے گزرتے جا رہے ہیں۔ اب ہم چوک پراگ داس پہنچ چکے تھے وہاں سب سے پہلے ہماری نظر پولیس کی بھاری جمعیت پر پڑی۔ کوتوالِ شہر ملک لطف خاں کے نزدیک ہی امرتسر میونسپلٹی کی فراہم کردہ لوہے کی ٹینکیاں پانی سے بھری موجود تھیں جن کے قریب کچھ مسلمان بیٹھ کر اور کچھ کھڑے ہو کر وضو کر رہے تھے۔ ہم نے بھی جلدی سے وضو کیا۔ وضو سے فارغ ہوتے ہی تھے کہ اونچی مسجد (جو شہید ہو چکی تھی) کے ملبے پر اگلی صفوں کے نمازی یہ اعلان اور تاکید کرتے سُنے گئے کہ وضو کے بعد مٹی کے لوٹے ضائع نہ کریں بلکہ واپسی پر اپنے ساتھ لیتے جائیں۔ نماز شروع ہوئی، نماز کے بعد مولوی ہمدانی نے اس محلے کے شہداء کے لئے بڑے درد بھرے انداز
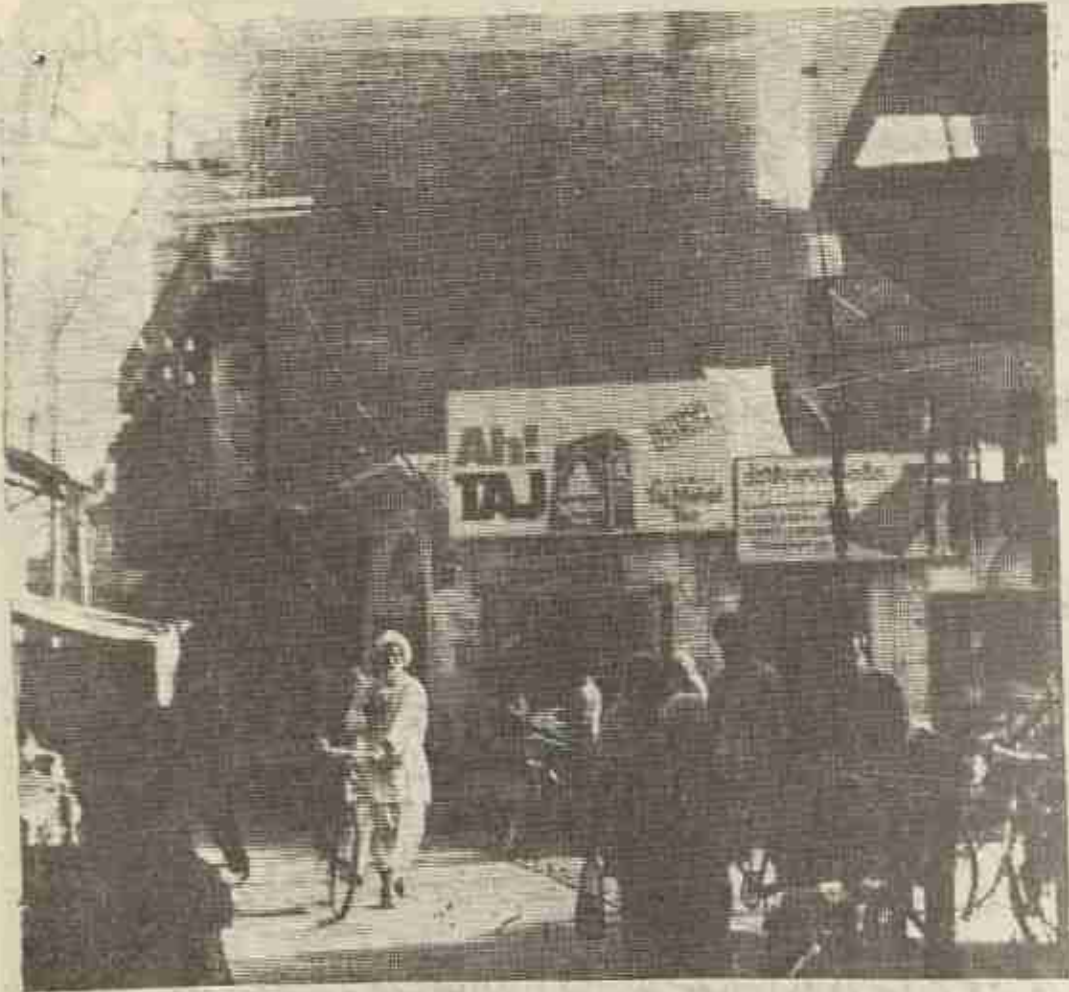
چوک پراگ داس کا وہ حصہ جہاں نمازِ جمعہ کے موقع پر نمازیوں نے وضو کیا۔

چوک پراگ داس کا کٹڑہ رام گڑھ جہاں مسلمانوں نے نماز ادا کی

میں دعا کی۔ اس کے بعد نمازی اپنے اپنے گھروں کی طرف روانہ ہونے لگے۔ راقم الحروف اپنے رفقاء کے ہمراہ ابھی چند قدم چلا ہو گا کہ سڑک کے دونوں کناروں پر قطار اندر قطار کھڑے مسلح دشمنوں میں سے کسی شرپسند نے آوازہ لگایا کہ آج تو خیریت سے واپس جا رہے ہو۔ ہمت ہے تو اگلے جمعہ کو بھی آنا۔ ہمارے ساتھیوں میں سے ایک نوجوان نے اس شرپسند کے آوازے کا جواب ٹھیٹھ پنجابی زبان میں دیا جس کا مفہوم یہ تھا کہ آج آپ لوگوں نے ہمارا کیا بگاڑ لیا ہے جو آئندہ جمعہ کو آنے کی دھمکیاں دے رہے ہو۔

ہمارے ساتھی کے ترکی بہ ترکی جواب سے جھگڑا ہوتے ہوتے رہ گیا اور ہم چلتے چلتے جلیانوالہ باغ کے صدر دروازے تک پہنچ گئے کہ اس اثناء میں پیچھے کی طرف سے چند مسلمانوں کے بھاگنے اور چیخنے چلّانے کی آوازیں بلند ہوئیں۔ ہم نے مڑ کر دیکھا تو بعض مسلمان افراتفری کے عالم میں جلیانوالہ باغ کے صدر دروازے کی طرف بھاگ کر آ رہے تھے (کیونکہ جلیانوالہ باغ کے آگے ملکہ کے بُت کا چوک تھا اور اس کے بعد مسلمان آبادی شروع ہوتی تھی) اور بعض اپنے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے "لوٹوں" سے دستی بموں کا کام لے رہے تھے۔ الغرض چوک پراگ داس کی جانب سے مسلمانوں کے محلّوں کی طرف نکلنے والی تینوں شاہراہیں میدانِ کارزار بنی ہوئی تھیں۔ اس موقع پر مسلمانوں نے جس ہمّت اور دلیری سے لوٹے چلاتے اور ہندوؤں سکھوں کی تلواریں چھین کر انہی کے محلوں میں انہی کی تلواروں سے انہیں موت کے گھاٹ اتارا، شجاعت اور مردانگی کی تاریخ کا قابلِ ستائش اور ناقابلِ فراموش واقعہ ہے۔ راقم الحروف کے ہمراہ رام باغ کے جو نوجوان نماز کے بعد گھروں کو لوٹ رہے تھے، وہ اپنے ساتھ مٹی کے لوٹوں کے علاوہ مٹی کے غلیلے اور غلیلیں بھی ساتھ لے کر آتے ہوتے تھے۔ چنانچہ ایک طرف "لوٹا بم" کرامات دکھا رہا تھا تو دوسری طرف مٹی کے غلیلے ہندو سکھوں کی آنکھیں پھوڑ رہے تھے۔ اس اثناء میں ہم ملکہ کے بُت سے ہوتے ہوتے بجلی والے چوک پہنچ گئے۔ وہاں پہنچنے کی دیر تھی کہ ہال بازار کی ملحقہ گلیوں، چوک فرید اور رام باغ کے مسلمانوں نے سٹیشن کی طرف

جاوید اقبال
کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

لوٹا بم

سے آنے والے ہندوؤں سکھوں کو تہ تیغ کرنا شروع کر دیا۔ ہال بازار کی جامع مسجد خیرالدین مرحوم کے باہر دو سکھ مرے پڑے تھے۔ کوچہ ککے زئیاں کے گلّی پہلوان، افضل عرف اجلا، بلندا، ملک اطہار وغیرہ نے بگھیاں والے کٹڑہ میں بھی دو سکھوں کو موت کے گھاٹ اتار کر ملحقہ کنوئیں میں پھینک دیا تھا۔ راقم الحروف کٹڑہ بگھیاں سے ہوتا ہوا کوچہ رماں داہین کے راستے اپنی رہائش گاہ شریف پورہ پہنچا۔ والدین اور بہن بھائی شدّت سے میرے منتظر تھے۔ دراصل میں انہیں بتائے اور پوچھے بغیر چوک پراگ داس میں نماز جمعہ ادا کرنے چلا گیا تھا جس کے باعث ان کی تشویش قدرتی تھی۔ بہر حال تھوڑی دیر کے بعد راقم الحروف اپنے جگری دوست مرزا محمد صادق (جو شریف پورہ کی گول مسجد کے قریب رہائش رکھتے تھے اور ان دنوں صادق سارجنٹ کے نام سے مشہور تھے) کے پاس گیا اور انہیں ساتھ لے کر سکور بورڈ دیکھنے کے لئے سول ہسپتال پہنچ گیا۔ وہاں صادق شاہ حکیم مہر دین کے صاحبزادے چودھری رشید خالد اور ڈاکٹر عبدالرزاق کو شہیدوں اور زخمیوں کی خدمت میں مصروف پایا۔ ہم نے ان سے آج کا "سکور" پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ خدا کے فضل و کرم سے آج بھی مسلمانوں کا پلّہ بھاری رہا ہے اور ابھی تک چالیس لاشیں آئی ہیں جن میں ہندوؤں سکھوں کی کثرت ہے۔ چنانچہ اس روز سے امرتسری مسلمانوں کا "لوٹا بم" ایسا مشہور ہوا کہ ہندو سکھ لوٹا بم کو کسی پہنچے ہوئے پیر فقیر کی پُراثر دُعا اور کرامات کا کرشمہ قرار دینے لگے۔ مگر ان کم عقلوں اور اسلام کے ازلی دشمنوں کو کیا خبر کہ قدرت جب مسلمانوں کو کسی نیک مقصد کی خاطر نبرد آزما ہوتے دیکھتی ہے تو کہیں مٹی کے لوٹوں کے ذریعے ان کو فتح و نصرت عطا کرتی ہے تو کہیں ابابیلوں کی چونچوں سے چھوٹی چھوٹی کنکریاں برسا کر کافروں کو ناکوں چنے چبواتی ہے۔ اسی طرح کا ایک واقعہ جامع مسجد خیرالدین مرحوم کے نمازیوں کو بم سے اڑانے کی سازش کے بارے میں ہے جس کے راوی محمد علی رونق صدیقی آف القریش حال مقیم بہاولپور ڈویژن ہیں۔ ان کے بیان کے مطابق ایک روز کسی مہر دین نامی شخص نے ڈیفنس کمیٹی کو اطلاع دی کہ آئندہ جمعہ کو مسجد خیرالدین میں عین نماز کے وقت دشمنوں نے بم گرانے کا پروگرام بنایا ہے۔ چنانچہ

حاجی نورالدین مرحوم نے اس منصوبے کو ناکام بنانے کا ذمہ لیا۔ تیسرے روز جمعہ تھا۔ حاجی نورالدین، محمد علی رونق اور دیگر ساتھیوں کی معیت میں پاتھی گراؤنڈ تھانہ اے ڈویژن سے ہوتے ہوتے سبزی منڈی کے راستے مسجد کو جا رہے تھے کہ بوٹا سنگھ منیجر وزیر ہند پریس نے اپنے پریس کے سامنے انہیں روک کر طنزیہ انداز میں کہا کہ رونق جی! مسجد کی رونق بڑھانے جا رہے ہو؟

ہم نے اس کے طنزیہ فقرے کا جواب اثبات میں دیا اور مسجد کی طرف چل پڑے۔

بوٹا سنگھ جب یہ طنزیہ گفتگو کر رہا تھا تو اس کے پاس تین چار ایسے مشکوک سکھ بیٹھے تھے جو وضع قطع سے خطرناک غنڈے دکھائی دیتے تھے۔ الغرض جب نماز جمعہ شروع ہوئی تو بوٹا سنگھ کے پاس بیٹھے ہوتے وہی چار سکھ مسجد کے بڑے دروازے کے قریب آگئے اور مسجد کی طرف پُراسرار انداز میں دیکھنے لگے۔ قبل اس کے کہ وہ شرپسند مسجد کے صحن میں ہم گرا نے حاجی نورالدین نے ڈیوٹی پر مامور رضاکاروں کو ان لعینوں پر حملہ کرنے کا اشارہ کیا جس کے نتیجے میں وہ چاروں سکھ واصل جہنم ہو گئے اور اس طرح ہزاروں مسلمان نمازی دشمنوں کی سازش کا شکار ہونے سے بچ گئے۔

بھولا پہلوان اور منٹو پہلوان بھی اپنے رفقاء سمیت چوک پراگ داس میں نماز جمعہ ادا کرنے گئے ہوتے تھے۔ انہوں نے بھی واپسی پر اس تصادم میں اپنے ہاتھوں کی خوب صفائی دکھائی اور اس کے بعد پہلوانوں کے محلہ کی طرف بخیریت نکل گئے۔ مقامی پولیس کئی ہفتوں سے ان کی تلاش میں تھی اور کئی جگہ ناکام چھاپے مار چکی تھی۔ امرتسر کے ہندو سیٹھوں نے ان کی گرفتاری کا انعام مقرر کر رکھا تھا لیکن بھولا اور منٹو تھے کہ "عنقا" تھے۔ انہی دنوں امرتسر کوتوالی میں ایک جن سنگھی ہندو تھانیدار کندن لال مہتہ متعین تھا۔ وہ بھولا اور منٹو کو گرفتار کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا چکا تھا۔ ان دونوں کی گرفتاری کے اعزاز کی محرومی کا احساس اسے چین سے بیٹھنے دیتا تھا اور نہ سونے دیتا تھا۔ ایک روز کا ذکر ہے مہتہ تھانیدار کو کسی مخبر کے ذریعے پتہ چل گیا کہ بھولا اور منٹو چوک فرید میں فلاں جگہ موجود ہیں چنانچہ مہتہ تھانیدار ہندو سیٹھوں

کے مقرر کردہ انعام کے لالچ میں پولیس کی بھاری نفری لے کر ان کے تعاقب میں جا نکلا۔ بھولا اور منٹو بھی کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلے تھے وہ ؎

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

کے مصداق ایک جگہ بیٹھے ہوتے اور وہاں سے ایسی ڈبکی لگا کر اوجھل ہو جاتے جیسے ان کے ہاتھ الہ دین کا چراغ یا طلسمی انگوٹھی آگئی ہو۔ مہتہ تھانیدار نے مخبر کی بتائی ہوئی جگہ پر چھاپہ مارا تو بھولا اور منٹو راقم الحروف کے حقیقی ماموں خواجہ محمد صادق مرحوم کے کٹڑہ شیر سنگھ والے دو طرفہ مکان کے عقبی راستہ کی طرف سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ مہتہ اور اس کے ساتھی اس محلے سے تقریباً دو صد مسلمان گرفتار کر کے لے گئے

مہتہ تھانیدار کو ایک طرف اپنے ناکام چھاپوں کی خلش تھی تو دوسری طرف وہ ہندو سیٹھوں کے مقرر کردہ انعام کی ہوس کے علاوہ تعصب کی بھڑکتی ہوئی آگ میں جل رہا تھا۔ چنانچہ ایک روز وہ افسر کے ایک مسلمان کے پھینکے ہوئے بم سے لقمۂ اجل بننے سے بال بال بچا۔ بھولا اور منٹو بھی مہتہ کے خون کے پیاسے تھے اور ہمیشہ تاک میں رہتے تھے کہ اس متعصب ہندو تھانیدار کو کس طرح ٹھکانے لگایا جائے۔ مہتہ کو حالات کی سنگینی کا احساس ہو چکا تھا اور وہ حتی المقدور مسلمانوں کے محلوں کی طرف آنے جانے اور گزرنے سے احتراز کرتا تھا۔

منٹو پہلوان کی گرفتاری

ایک روز منٹو پہلوان سول ہسپتال کے زخمیوں کو خون بہم پہنچانے کے لئے چوک فرید کے چند نوجوانوں کو لے کر کٹڑہ شیر سنگھ سے گزر رہا تھا کہ مسجد خیر الدین مرحوم کے مشرقی بغلی دروازے والی گلی کے باہر ہال بازار کی طرف سے اسے پولیس کی ایک جیپ اور چند لاریاں آتی دکھائی

دیں۔ منٹو پہلوان جلدی سے اسلامیہ گرلز ہائی سکول والی گلی میں گھس گیا اور ابھی وہ اس گلی کے جانے پہچانے چور راستے کی مدد سے پہلے ہسپتال کے چوک کی طرف بھاگ نکلنے کی فکر میں تھا کہ پولیس نے اس محلے کا محاصرہ کر لیا۔ منٹو پہلوان نے ایک دو مرتبہ اِدھر اُدھر بھاگنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارے مگر وہ جس طرف نظر اٹھاتا یا قدم بڑھاتا سامنے سٹین گنوں اور برین گنوں کے دہانے تنے دکھائی دیتے۔ پولیس نے آہستہ آہستہ گھیرا تنگ کیا اور امرتسر کے لاکھوں مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کے دلوں پر حکومت کرنے والا منٹو پہلوان گرفتار ہو گیا۔ منٹو کی گرفتاری کی خبر نے شہر کے تمام مسلمانوں کو اشکبار کر دیا۔ منٹو پہلوان کے اپنے بیان کے مطابق پولیس اسے سب سے پہلے کوتوالی شہر کی کوٹھی لے گئی وہاں سے چند لمحوں کے بعد اسے سول لائن ڈنڈا پولیس کے ہیڈ کوارٹر لے جایا گیا (جو شریف پورہ اور حسین پورہ کی مسلم آبادیوں کے قریب واقع تھا)

سید طفیل حسین شاہ نے (جو ڈنڈا پولیس کے انچارج تھے اور تقسیم کے بعد قلعہ گوجر سنگھ لاہور کی منٹگمری پارک میں آباد ہوتے تھے) ابھی منٹو کی آمد کی خبر سنی تھی لیکن اس کو بچشم خود نہیں دیکھا تھا کہ ڈاکٹر حفیظ طوسی (جو مغربی پاکستان کے ہیلتھ سیکرٹری رہ چکے ہیں) میاں صلاح الدین امرتسری اور خان محمد خاناں (جو تقسیم کے بعد ماڈل ٹاؤن لاہور میں آباد ہوتے تھے) سید طفیل حسین شاہ انچارج ڈنڈا پولیس کے پاس پہنچ گئے اور ان سے منٹو کو پولیس تشدد سے محفوظ رکھنے کی استدعا کی۔ سید طفیل حسین شاہ مرحوم کے بیان کے مطابق انہوں نے ایک لمحہ کے لئے اپنے مستقبل پر نگاہ ڈالی اور دوسرے لمحے قوم کے اس بہادر فرزند کی خدمات اور ڈاکٹر طوسی کی شخصیت سے متاثر ہوتے بغیر نہ رہ سکے۔ انہوں نے اپنے وعدہ کے مطابق منٹو پہلوان پر اس وقت تک تشدد نہ ہونے دیا جب تک وہ ان کی تحویل میں رہا۔ ڈاکٹر حفیظ طوسی میاں صلاح الدین امرتسری اور خان محمد خاناں مرحوم نے منٹو کو دوپہر کا کھانا وہیں کھلایا اور کچھ دیر بعد اس کو "خدا حافظ" کہہ کر وہاں سے رخصت ہو گئے۔

اِدھر منٹو پہلوان سول لائنز کی بیرک میں دفعہ ۳۰ کے تحت گرفتار ہونے والے دوسرے
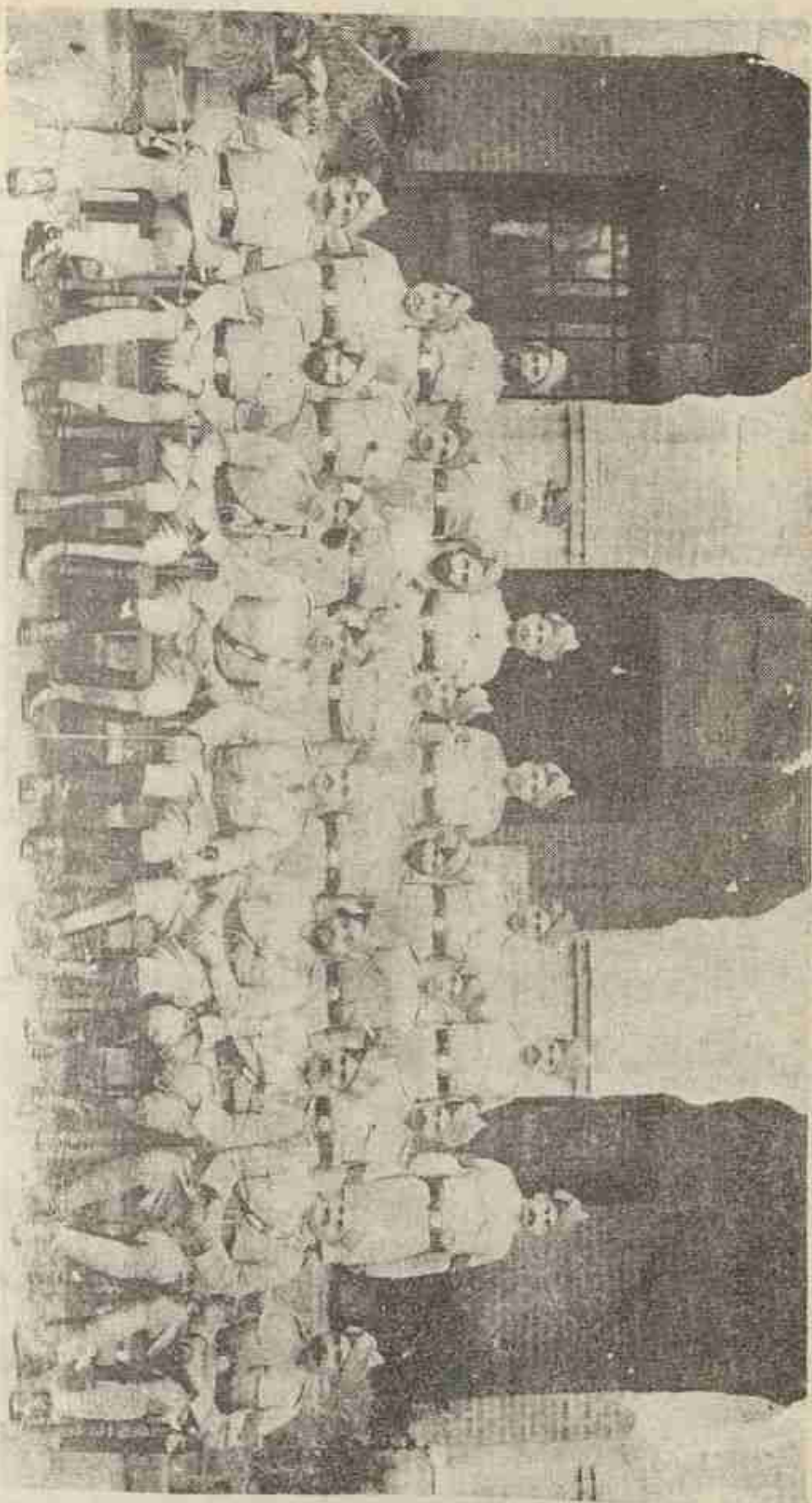
امرتسر ڈنڈا پولیس کا گروپ فوٹو۔ درمیان میں سید طفیل حسین شاہ (انچارج) بیٹھے ہیں

مسلمان حوالاتیوں سمیت بیٹھا ہوا تھا اور اُدھر شہر کی تمام مساجد میں لوگ اس کی رہائی کی دُعائیں مانگ رہے تھے اور عورتیں گھروں میں کلامِ پاک کی تلاوت میں مصروف تھیں۔

ڈنڈا پولیس کے اکثر مسلمان سپاہی جمعہ کی نماز پڑھنے جا چکے تھے کہ اس اثنا میں بشیر نامی ایک نوجوان (جسے پولیس منٹو کے ساتھ ہی گرفتار کر کے لائی تھی) نے رفعِ حاجت کی اجازت مانگی۔ چنانچہ پولیس کے دو سپاہی اسے سامنے والی ٹٹیوں کی طرف لے گئے جو بیرک مذکورہ کی کھڑکیوں میں سے صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ منٹو نے جب بشیر کو رفعِ حاجت سے واپس آتے دیکھا تو وہ بھی یہی بہانہ کر کے پولیس کے دو سپاہیوں کی نگرانی میں بیت الخلاء کی طرف چل پڑا۔

بیت الخلاء میں داخل ہونے سے قبل بشیر کی ہتھکڑی کی زنجیر کا وہ حصہ پولیس کے سپاہی نے کھول دیا تھا جو اس کی کمر پر بندھی ہوئی پیٹی کے ساتھ منسلک تھا۔ یہی وہ منظر تھا جو منٹو پہلوان کو بیرک کی کھڑکی میں سے نظر آیا اور جس نے اس کے دماغ میں فرار کے منصوبے کی تحریک پیدا کی۔ قصہ مختصر پولیس کے سپاہی نے بیت الخلاء کے قریب پہنچ کر منٹو پہلوان کی ہتھکڑی کی زنجیر کا وہ حصہ کھول دیا جو اس کی کمر کے ساتھ بندھی ہوئی پیٹی کے ساتھ منسلک تھا۔ منٹو پہلوان کے بیان کے مطابق اس نے بیت الخلاء میں داخل ہوتے ہی پاؤں سے جوتی اتاری اور ہتھکڑی کی نصف زنجیر کو ہاتھوں پر لپیٹ لیا اور زنجیر کا نصف حصہ بیت الخلاء سے نکلتے ہی پورے زور سے ان دونوں سپاہیوں کی طرف گھما کر مارا جو اسے بیت الخلاء تک لاتے تھے اور باہر اس کا انتظار کر رہے تھے

منٹو پہلوان کی رہائی کے لئے اسلامیانِ امرتسر کی مانگی ہوئی دعائیں بابِ قبول تک جا پہنچی تھیں۔ ایک طرف منٹو پولیس کی حراست سے بھاگ رہا تھا دوسری طرف اس کی رہائی اور سلامتی کے لئے ہر گھر میں دُعائیں مانگی جا رہی تھیں۔

منٹو پہلوان ہتھکڑی کی زنجیر سپاہیوں کی طرف گھما کر مارنے کے فوراً بعد ان خاردار تاروں کو پھلانگ چکا تھا جو ڈنڈا پولیس کے ہیڈ کوارٹر کے چاروں طرف قدِ آدم سے بھی اُونچی

لگی ہوتی تھیں۔

* منٹو پہلوان (جو ایم اے او کالج کا دو سال تک بہترین اتھلیٹ اور امرتسر کی طرف سے متحدہ پنجاب کے کئی کبڈی میچوں میں کپتان رہ چکا تھا نیز ریلوے کے محکمہ میں ٹکٹ کلکٹر تھا) ہتھکڑی سمیت ریلوے لائن کی اس پٹڑی پر دوڑ رہا تھا جو ڈنڈا پولیس، حسین پورہ اور شریف پورہ کے درمیان بچھی ہوتی تھی۔ پولیس کے سپاہی وسلیں بجاتے ہانپتے کانپتے اس کا تعاقب کرتے ہوتے کافی پیچھے رہ گئے تھے۔ چنانچہ منٹو نے حسین پورہ کے ریلوے پھاٹک کو عبور کر کے سب سے پہلے شیخ عبدالرحمان (جو ماڈل پارک والے اعجاز عرف جاجی کے والد تھے اور تقسیم کے بعد نسبت روڈ پر آباد ہوئے تھے) کے مکان واقع کوٹ شمس الدین میں پناہ لی۔ جب وہاں خطرہ محسوس کیا جانے لگا تو منٹو پہلوان کو پرانی وضع کا سفید برقع پہنا کر شریف پورہ کی گول مسجد کے قریب پارسیوں کی کوٹھی میں محلے داروں کے بھرپور تعاون اور کوششوں سے چھپا دیا گیا۔ یاد رہے شریف پورہ کی اس گول مسجد کو (جس کے پیش امام مولانا صدرالدین تھے) اب مندر میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔

پولیس نے حسین پورہ اور شریف پورہ کا چاروں اطراف سے محاصرہ کر کے تمام گلی کوچوں اور مشتبہ مکانوں کی خاک چھانی مگر منٹو پہلوان پارسیوں کی کوٹھی میں بیٹھا پولیس کو مخاطب کر کے کہہ رہا تھا ؎

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

مقامی انتظامیہ اور پولیس جب مایوس ہو کر نامرادی کے عالم میں لوٹ گئی تو رانی بازار کے شاہ محمد مرحوم (جو تقسیم کے بعد نسبت روڈ پر راقم کے ہمسائے میں آباد ہوتے تھے) کے مکان پر آدھی رات کے قریب منٹو پہلوان کو پارسیوں کی کوٹھی سے نکال کر لے جایا گیا اور وہیں محلے کے ایک لوہار سے اس کی ہتھکڑی کٹوائی گئی۔ علی الصبح منٹو پہلوان کو شاہ محمد مرحوم نے اپنی کار

انور دین عرف منٹو پہلوان (دائیں) نے پولیس کی حراست سے بھاگنے کے بعد شیخ عبدالرحمان (بائیں) کے ہاں پناہ لی
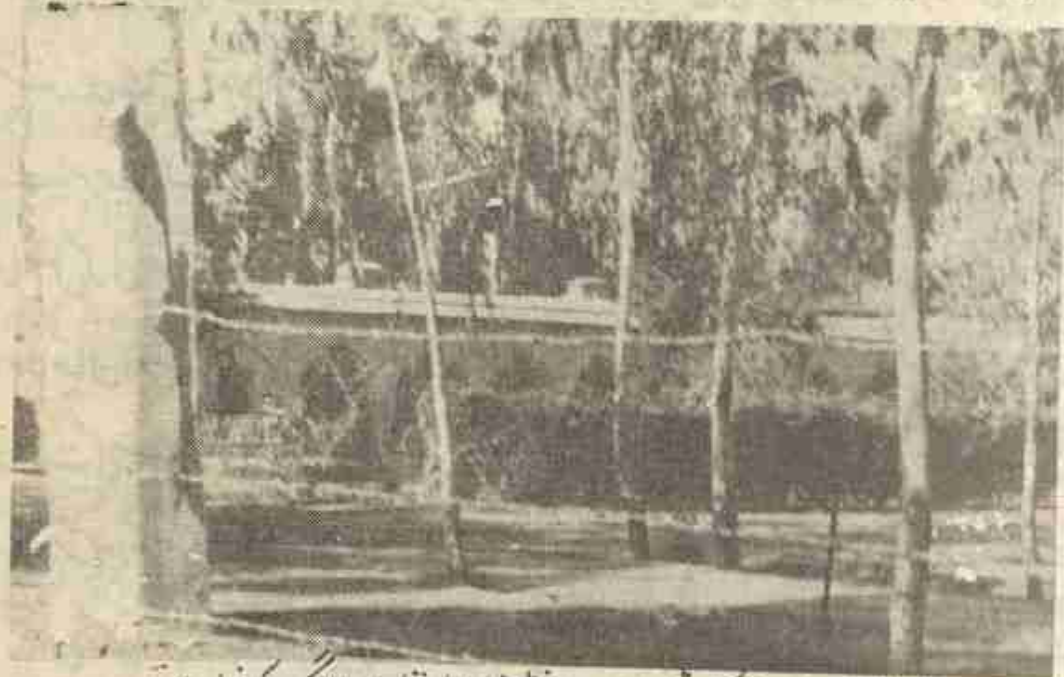
ڈنڈا پولیس کا ہیڈ کوارٹر جہاں سے منٹو خاردار تار پھلانگ کر فرار ہوا

بین پورہ شریف پورہ اور ڈنڈا پولیس کے درمیان ریلوے لائن کا وہ حصہ جس کو عبور کر کے منٹو روپوش ہوا

میں بٹھایا اور بڑے ڈراماتی انداز سے گلوالی دروازہ کے مسٹر رشید نور (جو تقسیم کے بعد لاہور کارپوریشن میں ملازم ہوتے) اور خان محمد عرف خاناں مرحوم کے سپرد کر آتے۔ منٹو پہلوان کے گلوالی دروازہ میں پہنچنے سے اس محلے کے لوگوں کے حوصلے بلند ہو گئے۔ منٹو نے اس علاقہ میں ہندو سکھوں کی طرف سے مسلمانوں پر اکا دکا وارداتوں کا بدلہ لینے کے لئے اس محلہ کے چند نوجوانوں کو ساتھ ملا لیا اور غیر مسلموں کا چڑھایا ہوا "قرض" اتارنے میں مصروف ہو گیا۔ مقامی انتظامیہ نے منٹو کی گرفتاری کو اپنے وقار کا سوال بنا لیا تھا چنانچہ پولیس کی ضرورت سے بڑھتی ہوئی مستعدی کے پیش نظر منٹو کے بہترین دوستوں اور خیر خواہوں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ امرتسر سے باہر چلا جائے کیونکہ مقامی پولیس نے اس کی گرفتاری کے لئے خفیہ پولیس کی بھی خدمات حاصل کر لی تھیں۔ منٹو نے اپنے احباب کے مشورہ پر عمل کرنے کے برعکس اپنا حلیہ بدل کر اسلامیان امرتسر کی خدمت کرنے پر اصرار کیا اور داڑھی رکھ لی۔ کچھ دنوں بعد جب منٹو کو حالات کی سنگینی کا خود احساس ہوا تو وہ بھیس بدل کر بھولا پہلوان کے ہمراہ بھگتانوالہ اسٹیشن سے ٹرین پکڑ کر راتے ونڈ پہنچا۔ وہاں سے لاہور اور لاہور سے پشاور جا کر بزرگ شاہ نامی شخص کے پاس رہنے لگا۔ قیام پاکستان کے بعد منٹو لاہور کے شاہ عالم گیٹ میں مقیم ہو گیا اور اس علاقے سے بنیادی جمہوریت کا رکن منتخب ہوا۔

مسلمان کا وعدہ

ایک روز میں نے منٹو سے اس کی زندگی کا کوئی اہم واقعہ سنانے کے لئے کہا تو اس نے بتایا کہ جن دنوں امرتسر جل رہا تھا" انہی دنوں میں اپنے "شکار" کی تلاش میں ایک روز صبح سویرے نکلا تو امرتسر کے اونچے پل کے قریب ایک ہندو ہاتھ میں گڑوی تھامے جا رہا تھا۔ میں نے اس کو ٹھکانے لگانے کے لئے پکڑا تو پہلے اُس نے جاں بخشی کی درخواست کی جب میں نہ مانا تو وہ کہنے لگا کہ پہلوان جی۔ مجھے بے شک جان سے مار دو لیکن میری ایک آخری خواہش

ضرور پوری کرنا۔ منٹو نے اس سے آخری خواہش کی تفصیل پوچھی تو اس ہندو نے کہا کہ ایشور کے
تے میری لاش کو لاوارث سڑک پر نہ چھوڑنا بلکہ ہندوؤں کے رواج کے مطابق میری چتا پر
گھی ڈال کر مجھے جلا دینا۔ منٹو کے بیان کے مطابق جب وہ اس ہندو کو موت کے گھاٹ
اتارنے کے بعد جائے واردات سے راہِ فرار اختیار کرنے لگا تو اُس کے پاؤں میں اس ہندو کی
آخری خواہش نے زنجیر ڈال دی۔ چنانچہ منٹو خود کو سخت خطرے میں ڈال کر اس ہندو کی لاش کو
ریڑھی میں چھپا کر ایم اے او کالج کے قریب لے گیا۔ رائل ٹاکیز کے سامنے ہندوؤں کی خالص
دیسی گھی کی دکان کا تالا توڑ کر گھی کے کنستر نکالے۔ لکڑیاں اکٹھی کر کے چتا تیار کی اور اس پر گھی
کے درجنوں کنستر انڈیل کر آگ لگا دی۔ منٹو نے جلتی ہوئی چتا کے قریب کھڑے ہو کر کہا کہ لالہ جی۔
میں نے اپنی جان کی بازی لگا کر اپنا وعدہ پورا کیا ہے۔ تمہارے عزیزوں نے بھی اس اہتمام
سے تمہاری چتا نہیں جلانی تھی جس اہتمام سے منوں گھی ڈال کر میں نے جلاتی ہے۔ دیکھ لو
مسلمان قول کے کتنے پکے ہوتے ہیں۔

چوک پراگ داس کی نماز جمعہ کے ہنگامے کے بعد سے امرتسر میں دوبارہ کرفیو کی
پابندیاں عائد ہو چکی تھیں اور اسلامیان امرتسر نے چند ہفتوں کے اندر دشمنوں کا قرض اتار
دیا تھا جس کے نتیجے میں امرتسر کے مسلمانوں نے نہ صرف خوشدلی سے تاوان ادا کئے بلکہ
اس ضمن میں پولیس نے سینکڑوں بے گناہ مسلمانوں کو قتل کے الزامات میں گرفتار کر لیا تھا
اور بعض کی عدالتوں سے ضمانتیں بھی ہو چکی تھیں۔ امرتسر، پٹھانکوٹ ٹرانسپورٹ کمپنی کے
جنرل منیجر حمید بٹ (جو آجکل لاہور چھاؤنی میں ہوتے ہیں) لوٹ مار اور آتشزنی کے الزام
میں گرفتار ہو چکے تھے۔ انہوں نے گرفتاری سے قبل اور رہائی کے بعد امرتسر کے مسلمانوں کی
بے پناہ خدمت کی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ مجلسِ احرار کے سرگرم کارکن ہونے کے باوجود ہندوؤں
سکھوں کی آنکھ کا کانٹا بنے ہوتے تھے۔ اسی طرح امرتسر ڈیفنس کمیٹی کے ممتاز رکن اور مشہور
مسلم لیگی لیڈر خان عبداللہ خان مرحوم (جو تقسیم کے بعد گوالمنڈی لاہور میں آباد ہوئے اور

اسی علاقہ سے کارپوریشن کے کونسلر منتخب ہوتے تھے) کو اسیر کارکنوں کی پیروی سے باز رکھنے کے لیے پولیس ان کے گھر پر چھاپے مار کر انہیں خوفزدہ کرنے کی ناکام کوشش کرتی رہی جب عبداللہ خاں کو ہراساں کرنے میں پولیس کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تو ان کو بھی قتل و غارتگری اور لوٹ مار کے الزام کے تحت گرفتار کر لیا گیا۔ عبداللہ خاں مرحوم کی بعد میں ہائیکورٹ سے ضمانت ہو گئی اور وہ مثالی عزم و ولولہ اور جوش و خروش کے ساتھ امرتسر کے مسلمان اسیروں کے مقدمات کی پیروی میں مصروف ہو گئے۔ ان کے ایک محلّے دار خیر دین مٹھائی والے (جو آجکل سکھر میں ہوتے ہیں) کو مقامی پولیس نے پرجے والے کٹڑہ کے ہندوؤں کی شہ پر قتل کے ایک جھوٹے مقدمے میں گرفتار کر لیا۔ خیر دین مٹھائی فروش کے بیان کے مطابق جب اس نے پولیس سے اپنا قصور دریافت کیا تو تھانیدار نے انکشاف کیا کہ تمہارے گھر کی بالائی منزل سے فائرنگ ہوئی تھی جس کے نتیجے میں چار آدمی ہلاک ہو گئے ہیں۔ خیر دین بیچارہ اپنی بے گناہی کی دہائی دیتا رہا لیکن پولیس نے اس کی ایک نہ سُنی اور اسے قتل کے جھوٹے مقدمے میں ملوّث کر کے جیل بھیج دیا۔

الغرض امرتسر کے جس علاقے میں کوئی غیر مسلم قتل ہوتا امرتسر کی مسلم دشمن انتظامیہ ایک ایک غیر مسلم کے قتل کے الزام میں متعدد مسلمانوں کو گرفتار کر لیتی جس کے نتیجے میں بالعموم گرفتار شدگان کی عدالت سے ضمانت ہو جاتی اور جھوٹے مقدمے عدالت کے سپرد ہونے تو عدم ثبوت اور من گھڑت واقعات کی وجہ سے بے گناہ ملزمان بری ہو جاتے۔ چنانچہ ایک روز بھگتانوالہ دروازہ کے ایک سکھ کے قتل کے الزام میں حبیب قصائی، فادو پہلوان، رکھا گوجر، ماجھا شوربے والا اور گاماں مہیم کو پولیس نے گرفتار کر لیا۔ انہیں گرفتار ہوتے کافی روز گزر چکے تھے۔ جب ان کے مقدمے کا فیصلہ سنایا گیا تو امرتسر کے مسلمانوں نے بے حد خوشی منائی۔ عدالت نے تمام ملزموں کو بری کر دیا کیونکہ گواہوں کے بیان کردہ واقعات اور ڈاکٹری رپورٹ میں زمین و آسمان کا تضاد تھا جس کے باعث قتل کے اس جھوٹے مقدمے کے تمام ملزموں کو عدالت نے بے گناہ قرار

دے دیا۔ اسی طرح امرتسر پٹھانکوٹ ٹرانسپورٹ کے جنرل منیجر حمید بٹ لوٹ مار اور آتشزنی کے
چھوٹے مقدمے سے بری ہو کر آ چکے تھے البتہ بجلی والے چوک کے لال ماشکی کے صاحبزادے
محمد حسین عرف حسیناں گگڑ کو قتل اور آتشزنی کے جرم میں چودہ سال کی سزا ہو چکی تھی۔

ہسپتال کا سکور بورڈ

اسلامیانِ امرتسر دشمنانِ پاکستان کی سازشوں کا مقابلہ کرنے کے ساتھ ساتھ ہسپتال کے
سکور بورڈ پر اپنی برتری کے پرچم لہرا رہے تھے کہ فسادات کی آگ بڑھتے بڑھتے امرتسر کے
مضافات کی دیہی آبادیوں میں بھی پھیل گئی۔ چنانچہ متعدد مسلمانوں کی لاشیں قریبی دیہات سے
ہسپتال آنے لگیں جس سے امرتسری مسلمانوں کے ہندوؤں سکھوں پر چڑھاتے ہوتے قرض
کے ہندسے سول ہسپتال کے سکور بورڈ سے آہستہ آہستہ گرنے لگے۔ انہی دنوں کا ذکر ہے کہ
ایک روز یہ خاکسار شریف پورہ کے چند نوجوانوں چودھری رشید خالد، حامد اللہ خان، سردار محمد صادق،
مظفر محسن بٹ، ملک حامد سرفراز، ملک محمد ابراہیم، خواجہ عبدالرشید مرحوم اور ان کے چھوٹے بھائی خواجہ عبدالوحید (جو آج کل پاک
فوج میں کرنل ہیں) کے ساتھ سول ہسپتال کا سکور بورڈ دیکھنے اور مسلمان زخمیوں کی عیادت کے لئے ہسپتال
گیا تو ہسپتال کے مردہ خانے کے قریب خون سے لتھڑا ہوا ایک ٹرک آ کر رکا۔ ہم نے قریب
جا کر دیکھا تو اس میں سے پندرہ سولہ چوڑے چکلے سینوں والے مسلمان نوجوانوں کی لاشیں برآمد
ہوئیں۔ ان تمام شہیدوں کے چہرے گلاب کے پھولوں کی طرح تر و تازہ اور شگفتہ تھے۔ ہر
جوان مردانہ وجاہت کی تمام خوبیوں کی منہ بولتی تصویر تھا۔ ان شہیدوں کو غور سے دیکھا تو
ان میں کسی کی پشت پر گولی، تلوار اور برچھے کا زخم نہ تھا۔ تمام کے تمام شہداء کی چھاتیوں، چہروں،
بازوؤں اور ٹانگوں پر گولیوں، برچھیوں اور تلواروں کی کاٹ کے نشانات نمایاں تھے۔
ایک نوجوان کی خوبصورت گردن میں رنگ برنگے نگینوں سے جڑا ہوا سونے کا تعویذ اس طرح
جگمگا رہا تھا جس طرح اندھیری رات میں ستارے چمکتے ہیں۔

ہم یہ اندوہناک منظر دیکھ کر بے حد آزردہ ہوتے اور اس سوچ میں ڈوب گئے کہ جن
والدین، بیویوں، بہنوں، بھائیوں کی آنکھوں کے تارے اور گھرانوں کے پرچشم و چراغ ہوں گے
آج ان پر کیا گزر رہی ہوگی۔ ہم اپنی پلکوں پہ عقیدت بھرے آنسو لیے اس سوچ میں گم تھے
کہ ہمیں دو مزید ٹرکوں کی آمد اور گڑگڑاہٹ نے چونکا دیا۔ ہم نے بیتابی کے ساتھ اس
ٹرک کی طرف متجسسانہ نگاہیں اٹھائیں تو چالیس کے لگ بھگ سکھوں کی لاشیں لدی دکھائی
دیں۔ مُردہ خانے کے عملے نے انہیں اُتارنا شروع کیا تو ہم نے دیکھا کہ یہ لاشیں بھی قدکاٹھ
اور وجاہت کے اعتبار سے مردانہ حُسن کی بھرپور دلفریبیاں لیے ہوتے تھیں۔ علاوہ ازیں
ہمارے مشاہدے میں یہ بات بھی آئی کہ ان مُردہ سکھوں کی اکثریت کی پُشت پر زخموں کے
نشان تھے جو اس امر کی غمازی کر رہے تھے کہ ان بہادر سپوتوں نے مسلمانوں کی طرح چھاتیوں
پر گولیاں کھانے کے برعکس میدان سے بھاگتے وقت یہ زخم کھاتے ہوں گے۔ شاعر نے
غلط نہیں کہا ؎

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے اس جاں کی تو کوئی بات نہیں

تھوڑی دیر کے بعد مسلمان شہیدوں کے لواحقین ہسپتال پہنچے تو ان کی زبانی اس
خونناک تصادم کی تفصیل معلوم ہوئی جس سے پتہ چلا کر دریائے بیاس کے کنارے واقع
مسلمانوں کے ایک گاؤں پر سکھوں نے آدھی رات کے وقت حملہ کر دیا۔ اس گاؤں کے
مسلمان متوقع حملے کے خدشہ کے پیشِ نظر تمام رات جاگ کر اپنے گاؤں کی حفاظت کیا
کرتے تھے۔ چنانچہ ان فسادیوں نے جب شبخون مارا تو گاؤں کے مسلمانوں نے منادی کے
ذریعے لوگوں کو خبردار کر دیا۔ گاؤں کی حفاظت پر مامور مسلمان نوجوانوں نے اس بے جگری
سے حملہ آوروں کا مقابلہ کیا کہ مسلمانوں کو مردانہ وار مقابلہ کرتے دیکھ کر کچھ دیر تک
دشمن طاقت آزماتا رہا۔ جب اسلام کے سپاہیوں کو انہوں نے کفن بردوش لڑتے دیکھا

تو اپنے گھوڑوں کی لگامیں موڑ کر میدان کارزار سے پیٹھ دکھا کر بھاگ اٹھے۔ اس افراتفری میں ان کے جو ساتھی گھوڑوں سے گر گئے تھے یا زخمی ہو گئے تھے وہ ان بھگوڑوں کو چیخ چیخ کر آوازیں دیتے رہے اور کہتے رہے کہ ہماری مدد کرو اور ہمیں بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ لیکن ان بزدلوں نے اپنے زخمی ساتھیوں کی چیخ پکار پر کوئی توجہ نہ دی اور بھاگ گئے۔ گاؤں کے بہادر مسلمانوں نے کافی دُور تک ان کا پیچھا کیا اور انہیں شبخون مارنے کا مزہ چکھایا۔ دریائے بیاس کے آس پاس کے دیہات میں فسادیوں نے مسلمانوں کے خون سے جس طرح بے دریغ ہولی کھیلی اس کا اندازہ ساہو کی ملیاں شیخوپورہ کے ساتھی نور محمد ڈوگر کے بیان سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ نور محمد ڈوگر کے بیان کے مطابق وہ دریائے بیاس سے پانچ میل دُور بھلائی پور کے قصبہ میں رہا کرتے تھے۔ قیام پاکستان سے چند روز قبل قرب جوار کے دیہات پھرو، مان، رتیہ، بھوٹ ونڈ، ناگوکی، کھوتے کی پور، حسن پور، گگے، بہادر پور، لدھڑ، بابا بکالا، ستھیالا اور کلیر کے سکھوں نے مسلمانوں کے اس قصبے کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ان کی قیادت ریاستی فوج کر رہی تھی۔ بھلائی پور کے مسلمان روزہ افطار کرنے کے لئے کھیتوں سے گھروں کو لوٹ رہے تھے کہ ان بے چاروں کا قتل عام شروع ہو گیا۔ مسلمانوں نے بھوک اور پیاس کی شدت سے نڈھال اور نہتے ہونے کے باوجود حملہ آوروں کا نہایت بے جگری سے مقابلہ کیا لیکن حملہ آور چونکہ بندوقوں، پستولوں، برچھوں اور تلواروں سے مسلح تھے اس لئے مسلمان بے بس ہو گئے۔ انہوں نے انتہائی بے سرو سامانی کے باوجود چالیس پچاس حملہ آوروں کو لاٹھیوں کے ذریعے واصل جہنم کیا۔ چنانچہ دشمنوں کے اس خوفناک حملے کے نتیجے میں بھلائی پور کے ساڑھے تین سو کے قریب مرد و زن بھی شہید ہوئے۔ جن میں نور محمد ڈوگر کے والد غلام حسین بخش، بھائی معراج اور دو بھتیجوں سراج اور محمد دین کے علاوہ شریف، کریم، شفیع، اللہ دتا، گوہر شاہ، حسن محمد، سردار، مرسلین، نور محمد، غلام حسن، جلال دین، چراغ دین، نواب دین، فتح دین، فیروز، جان محمد، یعقوب، محمد حسین،

محمد دین، علی محمد، نتھو، بالو، نواب، جیما ڈوگر، غلام نبی، میرو، حسا، چراغا، جالا، رحیم بخش، غلام قادر، ملّو موچی، لودی، رکھا، کاکا، محمدی، مولا بخش، جلال دین سپاہی، میراں بخش، میر حسا، سراج، میر حسن اور نور حسن وغیرہ کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں

امرتسر کے سول ہسپتال کے تمام وارڈ، برآمدے اور کمرے مختلف فرقوں کے زخمیوں سے اس حد تک بھر چکے تھے کہ ہسپتال کی انتظامیہ نے ہسپتال کے وسیع و عریض احاطہ میں متعدد خیمے نصب کر دئے تھے۔ چودھری عبدالقادر (جن کی نصف گردن مہان سنگھ گیٹ کے مقابلہ میں کٹ گئی تھی) ابھی تک ایک خیمہ میں زیرِ علاج تھے۔ مسلمان زخمیوں کی عیادت کے لئے امرتسر کے مسلمانوں کا تانتا بندھا ہوا تھا اور وہ مریضوں کے لئے دوائیاں، اشیائے خوردنی پھل وغیرہ لا رہے تھے نیز اسیر مسلمانوں کے خاندانوں کی امداد میں گہری دلچسپی لے رہے تھے۔ اس کے برعکس ہندو سکھ مسلمانوں سے اس حد تک خوفزدہ ہو چکے تھے کہ وہ اپنے فرقہ کے ہلاک شدگان اور زخمیوں کے مسائل کی طرف بہت کم توجہ دیتے تھے چنانچہ مسلمان شہداء کی لاشوں کو امرتسر مسلم لیگ کی ڈیفنس کمیٹی کے ارکان جن میں خواجہ امیر الدین، خواجہ غلام نبی، عبداللہ خاں مرحوم، شیخ عنایت اللہ اور مسٹر ذکی الدین پال (جو لاہور ہائیکورٹ کے ایڈیشنل جج رہ چکے ہیں) وغیرہ ہسپتال کی انتظامیہ سے حاصل کر کے ان کی تجہیز و تدفین کا بندوبست کرتے تھے۔ اس کے برعکس ہندوؤں سکھوں کی لاشوں کو اکثر اوقات ہسپتال کی انتظامیہ ٹھکانے لگاتی تھی

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

امرتسر کی سیشن کورٹ میں مختلف فرقوں کے مقدمات کی سماعت ہو رہی تھی۔ چونکہ پراگ داس اور رام گنج کے مقدموں کی کارروائی سننے اور دیکھنے کے لئے بھاری تعداد میں لوگ سیشن کورٹ جاتے بلکہ بعض مسلمان پنجاب کے مختلف اضلاع سے چل کر آتے اور

ان مقدمات کی کارروائی میں غیر معمولی دلچسپی لیتے۔

داتم گنج کا مشہور مقدمہ جب فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہوا تو امرتسر کے ایڈیشنل سیشن جج جسٹس شبیر احمد نے فیصلے کی تاریخ ۲ اگست مقرر کر دی۔ اتفاق سے اسی روز چوک پراگ داس کے ملزمان بھی سیشن جج مسٹر مے کی عدالت میں اپنے مقدمے کے سلسلے میں پیش تھے۔ امرتسر کے ہندوؤں سکھوں کو بھی اور موقعہ کے دیگر گواہوں کی تضاد بیانی اور وکلاء کے دلائل سننے کے بعد اس امر کا یقین ہو چکا تھا کہ داتم گنج کے مقدمے کے ملزم بری ہو جائیں گے۔ وہ فیصلے کی تاریخ ۲ اگست ۴۷ء کو اپنے ساتھ بہت سے دستی بم لے کر آئے ہوئے تھے تاکہ جس وقت عدالت حکم سناتے اسی وقت جسٹس شبیر احمد اور مسلمان ملزموں کو بم مار کر اڑا دیا جائے۔ امرتسر کی سیشن کورٹ میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ تمام فرقوں کے لوگ حکم سننے آئے ہوئے تھے۔ اس روز سیشن کورٹ میں شیخ صادق حسن، میر انور، سعید محمود، ملک غلام نبی، عبداللہ خان، مولوی سراج الدین پال، خواجہ امیر الدین، شیخ عنایت اللہ، خواجہ محمد رفیق، مولانا محمد بخش مسلم، آفتاب فرخ، لسا پہلوان آف نعمت کدہ لاہور اور دیگر سینکڑوں مسلمان موجود تھے جن کے چہرے آج بھی حافظے میں تر و تازہ ہیں۔

جسٹس شبیر احمد نے عدالت کی اندرونی فضا اور بیرونی ماحول کو دیکھ کر انتہائی دور اندیشی اور معاملہ فہمی کا ثبوت دیتے ہوئے تمام لوگوں کو عدالت کے کمرے سے باہر چلے جانے کا حکم دے دیا نیز یہ بتا دیا کہ جب حکم سنانے کے لئے آواز پڑے اس وقت بے شک آپ لوگ اندر آ جائیں۔ ہم سب عدالت کے کمرے سے نکل کر سیشن کورٹ کے باغ کے ایک گوشے میں سبزے پر بیٹھ گئے۔ داتم گنج کے مقدمہ کے ملزمان میاں معراج دین وغیرہ عدالت کے باہر شہتوت کے درخت کی چھاؤں میں بیٹھے ہی تھے کہ ہندوؤں سکھوں نے باغ کے اس حصے کی طرف بم پھینکا۔ اتفاق سے وہ بم درخت سے ٹکرا کر ان سے تھوڑے فاصلے پر جا گرا جس سے دو مسلمان تھوا (والد بھولا مٹھائی فروش چوک گوالمنڈی لاہور)

اور حکیموں والے دروازے کے ایک نوجوان موقع پر شہید ہو گئے۔ ان کے علاوہ تالہ کھولنے والے کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ بم کے فولادی ٹکڑوں نے ۴۸ مسلمانوں کو بُری طرح زخمی کیا۔ عدالت کے احاطہ میں موجود مسلمانوں نے طیش میں آکر ملحقہ باغ کے گملے اٹھا اٹھا کر ہندوؤں سکھوں کو مارے۔ چوک پراگ داس کے سکھ ملزمان سیشن جج کی عدالت کے باہر واقع میدان کی گھاس پر بیٹھے اپنے مقدمے کی باری کا انتظار کر رہے تھے کہ مسلمانوں نے ان پر بھی گملے برسائے۔ چنانچہ سیشن جج مسٹر نے حالات کی نزاکت کے پیش نظر عدالت سے بھاگ گئے۔ پراگ داس کے ملزمان بھی نگران سپاہیوں سمیت وہاں سے بھاگ کر سیشن کورٹ کی سیڑھیوں میں چھپ گئے۔ مسلمانوں نے جب ان کا تعاقب کرنا چاہا تو عین اس وقت افسر کے ڈپٹی کمشنر پولیس کی بھاری جمعیت کے ہمراہ ہوائی فائرنگ کرتے ہوئے جائے واردات پر پہنچ گئے۔

جسٹس شبیر احمد نے حالات کی نزاکت کو ملحوظ رکھتے ہوئے فیصلے کی تاریخ ۵ اگست ۴۷ء پر ملتوی کر دی۔ جب ۵ اگست ۴۷ء کا خون میں ڈوبا اور آنسوؤں میں نہایا سورج طلوع ہوا تو عدالت کے آس پاس دُور دُور تک کرفیو نافذ ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ احاطہ عدالت کے باہر چاروں طرف خاردار تاریں بھی ہوتی تھیں۔ جسٹس شبیر احمد نے دائم گنج کے مقدمہ کے ملزموں کو باعزت بَری کر دیا کیونکہ چشم دید گواہوں کے بیانات میں تضاد تھا اور شناخت پریڈ کی رپورٹ بھی ملزموں کے حق میں جاتی تھی۔ جسٹس شبیر احمد نے دائم گنج کے مقدمے سے بَری ہونے والے مسلمانوں کو پولیس کی حفاظت میں دائم گنج تک پہنچوا دیا اور وہ کچھ دنوں بعد لاکھوں مسلمانوں کی طرح نقل مکانی کر کے لاہور تشریف لے آئے اور اپنی خداداد صلاحیتوں اور بے پناہ خوبیوں کے باعث ترقی کرتے کرتے عدالت عالیہ کے جج کے منصب جلیلہ پر فائز ہو گئے۔ اُن کی درویشی، سادگی اور انصاف پسندی عدلیہ کی تاریخ میں درخشاں باب کی حیثیت رکھتی ہے۔ ؎

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

داتم گنج کے مقدمے کے مسلمان ملزموں کی بریّت کے فیصلے نے جہاں اسلامیانِ امرتسر میں مسرّت کی لہر دوڑا دی وہاں ہندؤں سکھوں کے حلقوں میں صفِ ماتم بچھ گئی۔

اس خطا پر مجھے مارا کہ خطاوار نہ تھا

پاکستان کا یوم ولادت جوں جوں قریب آتا جا رہا تھا امرتسر کی مسلم دشمن انتظامیہ کی نام نہاد غیر جانبداری کی قلعی تیزی سے اترتی جا رہی تھی۔ انتظامیہ اور پولیس کے ہندو سکھ ملازمین مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنے کی دن رات سازشیں کر رہے تھے۔ علاوہ ازیں شہر کی مخلوط آبادیوں میں قائم ہونے والی نام نہاد امن کمیٹیوں کے غیر مسلم اراکین خونخوار بھیڑیوں کا روپ دھار رہے تھے۔ شیخ اکبر علی آف بیرادٹائز کلاتھ ہاؤس (کراچی صدر) کے حقیقی ماموں اور استاد کرم الٰہی کے بڑے بھائی شیخ فضل کریم امرتسر کے علاقہ ٹوبہ بھائی سالو (لوہگڑھ) میں نصف صدی سے ایک تعلیمی ادارہ چلا رہے تھے جس میں ہندو سکھ اور مسلمان بچے ایک ساتھ تعلیم حاصل کرتے تھے۔ شیخ فضل کریم امرتسر مسلم لیگ کے سرگرم کارکن ہونے کے علاوہ اس علاقے میں قائم ہونے والی امن کمیٹی کے ممتاز رکن تھے۔ وہ کرفیو کے دوران ایک روز اپنے گھر میں غسل کر رہے تھے کہ اس علاقے کی امن کمیٹی کے غیر مسلم اراکین نے ان کے گھر آکر دروازے پر دستک دی اور انہیں آریہ سماج بلڈنگ میں ہونے والے امن کمیٹی کے ہنگامی اجلاس میں شرکت کی دعوت دی۔ شیخ فضل کریم غسل کے بعد مجوزہ اجلاس میں شرکت کرنے چلے گئے۔ اجلاس کے بعد وہ گھر کی طرف آرہے تھے کہ امن کمیٹی کے غیر مسلم اراکین نے پیچھے سے گولی مار کر شہید کر دیا۔ شیخ فضل کریم کی والدہ اور چھوٹے بھائی استاد کرم الٰہی نے گولی چلنے کی آواز سن کر جب گلی میں جھانکا تو شیخ فضل کریم گلی کے فرش پر دم توڑ چکے تھے۔ استاد کرم الٰہی اپنے بڑے بھائی کی لاش اٹھانے جب گلی میں اترے تو قاتلوں نے انہیں جان سے مارنے کی دھمکی دی اور فائرنگ کرتے ہوئے شیخ فضل کریم شہید کی لاش گھسیٹ

کر لے گئے۔ استاد کرم الٰہی اور دیگر افرادِ خانہ بے بسی کے عالم میں اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی دُنیا لٹنے کا دلخراش منظر دیکھتے رہے۔ اسی طرح بازار بکروانان کے بابو سید احمد (جو تقسیم سے قبل امرتسر کے ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ تھے) نے اپنے افرادِ خانہ اور محلے داروں کو خطرے سے نکالنے کے لئے اعلیٰ حکام کے دروازوں پر جا کر دستک دی اور ان سے مدد کی درخواست کے بعد جب گھر واپس پہنچے تو فسادیوں نے ان کے مکان پر حملہ کر دیا۔ بابو سید احمد نے حملہ آوروں کی تلواروں کے وار روکنے کے لئے اپنے خالی ہاتھوں سے مدافعت کی تو ان کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں کٹ گئیں۔ اس کے بعد حملہ آوروں نے ان کے چہرے اور جسم کے دیگر حصّوں پر متعدد وار کر کے انہیں موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا کر دیا۔ بابو سید احمد کو نیم مردہ حالت میں چھوڑ کر فسادی گھر کے دیگر افراد پر جھپٹ پڑے جس کے نتیجے میں ان کی والدہ ماجدہ اور محکمہ ڈاک کے ملازم محمد یوسف کو شہید کر دیا گیا۔ بابو سید احمد قیامِ پاکستان کے بعد محکمہ اطلاعات میں ملازم ہو گئے۔ ان کے چہرے پر زخموں کے اَن گنت نشانات دیکھ کر لوگ لرز جاتے تھے۔ مشہور اہلِ حدیث عالم مولوی ثناءاللہ مرحوم کے فرزند اور ڈاکٹر محمد داؤد (اچھرہ) کے سُسر مولوی عطاءاللہ مالک ثنائی برقی پریس ہال بازار اور کٹڑہ کرم سنگھ کے غلام نبی پٹھان آف کوچہ سلطان پہلوان کو بھی فسادیوں نے بیدردی سے شہید کیا۔

الغرض اسلامیانِ امرتسر پاکستان کا مطالبہ کرنے کے جُرم کی پاداش میں جان و مال کے نذرانے پیش کر رہے تھے کہ مقامی پولیس کے غیر مسلم ملازمین بھی کھلم کھلا اس فساد کے میدان میں کُود پڑے۔ ایک طرف مہتہ تھانیدار شہر کے متعدد علاقوں میں اکّا دکّا آنے جانے والے مسلمانوں کو گولیوں کا نشانہ بنا رہا تھا تو دوسری طرف ایک جیپ میں بیٹھ کر چند سکھ فوجی اور گورکھے شہر کی بیرونی شاہراہوں پر راہ چلتے مسلمانوں پر گولیاں چلا رہے تھے۔ ایک روز راقم الحروف کا خوبرو کلاس فیلو مرتضیٰ (جو کٹڑہ بگھیاں میں رہتا تھا) کرفیو کے وقفے میں

ناشتے کا سامان لینے نکلا تو جیپ میں سوار گورکھوں نے اسے سنگینیں دکھا کر جبراً اپنے ساتھ بٹھا لیا اور گھی منڈی کے قریب لے جا کر گولیوں سے چھلنی کر کے پھینک گئے۔

اہلِ محلہ نے اس صورتِ حال سے پریشان ہو کر امرتسر کے مشہور و معروف ایڈووکیٹ خواجہ غلام حسن مرحوم (جو قیامِ پاکستان کے بعد ملتان آباد ہوتے) کی سربراہی میں حکامِ بالا سے احتجاج کرنے کے لئے ایک وفد ترتیب دیا۔ خواجہ صاحب مرحوم کے بیان کے مطابق ابھی اس وفد کے اراکین نے محلّے سے باہر قدم نکالا ہی تھا کہ ملٹری کے ایک سپاہی نے فائر کر دیا جس سے محمد عالم پسر جان محمد موقعہ پر شہید ہو گئے۔ لوگوں نے ان کی لاش اٹھا کر کوچہ گگے زئیاں کی مسجد میں دفن کر دی ہے

ہم نے چاہا تھا کہ حاکم سے کریں گے فریاد
وہ بھی کمبخت ترا چاہنے والا نکلا

انہی دنوں پرجے والے کٹڑہ میں ایک سکھ حوالدار نے امرتسر کے مشہور شاعر عیسیٰ نعت خواں کو سرِ راہ گولی مار کر شہید کر دیا۔ راقم الحروف کے ایک بزرگ مولوی محمد ابراہیم (جو جید عالم تھے اور واہگہ کی سرحد پر پریم نگر کے نام سے ایک بستی بسانے کا عزم رکھتے تھے) کرفیو کے وقفہ کے دوران ہمارے ہاں (شریف پورہ) سے اندرون شہر کٹڑہ شیر سنگھ میرے حقیقی ماموں خواجہ محمد صادق مرحوم و دیگر عزیزوں کی خیریت دریافت کرنے نکلے تو میرے والدین نے انہیں خطرناک حالات کا احساس دلایا لیکن وہ خاطر میں نہ لاتے۔ پھر وہی کچھ ہوا جو ہونا تھا۔ لاہور اور امرتسر کی سرحد پر پریم کی نگری آباد کرنے کی تڑپ رکھنے والے اس کھدر پوش بزرگ کو بھی ظالموں نے شہید کر دیا۔ تلاشِ بسیار کے باوجود اس عابد و پرہیزگار بندۂ خدا کی لاش نہ مل سکی۔ چند دنوں کے بعد رام باغ کے مشہور قومی کارکن اور شعلہ نوا مظفر صادق پاکستانی مرحوم نے میرے استفسار پر بتایا کہ انہوں نے اس شکل و صورت کے ایک بزرگ

کو دیکھا تھا جسے گورکھا فوج کے سپاہی زبردستی جیپ میں بٹھا کرلے گئے تھے۔ ؏

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

اسی طرح امرتسر کے ایک نابینا حافظ نامی قصّہ فروش اور کوچہ رنگریزاں کے غلام نبی بیّی کو بھی دن دہاڑے اغوا کر کے شہید کر دیا گیا اور ان کی لاشیں بھی نہ مل سکیں۔ بقول شاعر ؎

کیا تھا روزِ محشر سب ستمگاروں نے یہ ایکا
بتاتا ہی نہ تھا کوئی کہ کس کا کون قاتل ہے

○

اسلامیانِ امرتسر کے ناقابلِ فراموش محسن

ڈاکٹر ریاض قدیر

ڈاکٹر امیر الدین

ڈاکٹر شجاعت علی

ڈاکٹر حفیظ طوسی

صادق شاہ

ڈاکٹر منیر احمد

جسٹس شبیر احمد اور بیرسٹر فرخ حسین نے علی الترتیب دآم گنج کے مقدمے کی سماعت اور وکالت کی۔

امرتسر پٹھانکوٹ ٹرانسپورٹ کے جنرل منیجر حمید بٹ

ملک عبید اللہ دآم گنج کے مقدمے کے معاون وکیل

امرتسر سیشن کورٹ کا بیرونی منظر جس کے احاطہ میں فسادیوں نے بم پھینک کر مسلمانوں کو شدید زخمی کیا۔

چلو اے بُلبلو اس گلستاں سے
یہاں صیّاد مالی ہو گئے ہیں

چوتھا باب

محافظ غنڈے بن گئے

کوچہ رنگریزاں کے معروف سماجی کارکن پیر طاہر شاہ (جو اکبری منڈی لاہور کے ممتاز تاجر پیر زکریا شاہ کے بھائی تھے) کو مہتہ تھانیدار نے جس مکاری سے شہید کیا اس کی تفصیل سے امرتسر کے ہندو سکھ پولیس افسروں کی گھناؤنی سرگرمیوں کی اصل تصویر سامنے آجاتی ہے۔

ایک روز گئوشالہ کی جانب سے مسلمانوں کے محلہ بکروانا پر زبردست فائرنگ ہو رہی تھی اور اس محلے کے نہتے مسلمان اپنے مکانوں کے دروازے اور کھڑکیاں بند کر کے اپنے بیوی بچوں کو گولیوں کی بوچھاڑ سے محفوظ رکھنے میں کوشاں تھے کہ اچانک پولیس کی ایک پارٹی اس طرف سے گزرتی دکھائی دی۔ پیر طاہر شاہ مرحوم جرأت کر کے بازار میں آئے اور گشتی پولیس کو ہندوؤں کے مکانوں کی طرف سے آنے والی گولیوں کی بوچھاڑ رکوانے کی درخواست کی۔ مہتہ تھانیدار (جو گشتی پارٹی کا سربراہ تھا) نے پیر طاہر شاہ سے پوچھا کہ ہمیں بتاؤ گولیوں کی بوچھاڑ کس سمت سے آتی ہے؟

پیر طاہر شاہ نے گھوم کر جب ان مکانوں کی طرف شہادت کی انگلی اٹھائی تو مہتہ تھانیدار نے ایک سپاہی کو پیچھے سے پیر طاہر شاہ پر گولی چلانے کا اشارہ کر دیا جس کے نتیجے میں ۳۰۳

کی گولی لگتے ہی وہ لڑکھڑا کر گر پڑے۔ ان کی پتھرائی ہوئی آنکھیں شہادت کی آخری ہچکی سے کچھ دیر قبل کچھ اس طرح پھٹی پھٹی اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھیں جیسے کہہ رہی ہوں۔ ؎

وہی قاتل، وہی شاہد، وہی منصف ٹھہرے
اقربا میرے کریں خُون کا دعویٰ کِس پر

متذکرہ بالا واقعہ پیر طاہر شاہ کے عزیز و اقارب اور محلے داروں نے اپنے مکانوں کی کھڑکیوں، جھروکوں اور چلمنوں کی اوٹ سے دیکھا تو خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ اس طرح کا ایک واقعہ قریبی محلہ رنگریزاں کے غلام قادر مرحوم کے جواں سال بیٹے حامد حسن بٹ کے ساتھ پیش آیا۔ وہ اپنے مکان کی چھت پر کھڑے تھے کہ کوتوالی اور گورنمنٹ ہائی سکول کی طرف سے گورکھا فوج کے ایک سپاہی نے انہیں گولی کا نشانہ بنا کر شہید کر دیا۔ حامد بٹ کی شہادت کے واقعہ سے خوفزدہ ہو کر اسی محلے کے اکرام بٹ، ان کے والد خواجہ غلام نبی بٹ، حکیم جان محمد اور ڈاکٹر محمد شریف جیسے معزز شہری اپنی مستورات کے ہمراہ اپنی جانیں بچانے کے خیال سے کوتوالی پہنچے تو پولیس نے ان تمام شرفاء کو حوالات میں بند کر دیا۔ اکرام بٹ (جو آجکل لاہور کے ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن کے محکمہ میں ملازم ہیں) کے بیان کے مطابق وہ کوتوالی کی حوالات میں محبوس تھے کہ انہوں نے چند پولیس افسروں کی سرگوشی سُنی۔ وہ کہہ رہے تھے کہ صبح ہوتے ہی ان مُسلوں کو پاکستان پہنچا دیا جائے گا یعنی قتل کر دیا جائے گا۔ لیکن خُدا کی قدرت دیکھیئے کہ صبح سویرے امرتسر مسلم لیگ کے صدر شیخ صادق حسن بلوچ رجمنٹ کے افسروں سمیت کوتوالی پہنچ گئے۔ اکرام بٹ اور ان کے ساتھیوں نے شیخ صاحب کو دیکھتے ہی شور مچا دیا۔ شیخ صادق حسن امرتسر کے مسلمان معززین کو حوالات میں دیکھ کر آگ بگولا ہو گئے۔ انہوں نے بلوچ رجمنٹ کے افسروں کے تعاون سے ان مسلمانوں کو رہائی دلائی اور اس طرح کوتوالی کے غیر مسلم پولیس افسروں کا وہ منصوبہ خاک میں مل گیا جس کے تحت ان مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتارنا مقصود تھا۔

امرتسر کی غیر مسلم پولیس اور فوج کی مذموم سرگرمیوں نے امرتسر کے ان مسلمان پولیس افسروں، سپاہیوں اور دیگر سرکاری ملازموں کو بھی اس میدان میں اترنے پر مجبور کر دیا۔ جو فرقہ پرستی کے مقابلے میں اپنے فرائض کو ترجیح دے رہے تھے۔ اس ضمن میں لاہوری دروازہ کی چوکی کے ملک اکرام، ملک فیض اور شہر کے دیگر مسلمان پولیس ملازمین نے وقت کی آواز پر لبیک کہی۔ متعدد بستیوں سے مسلمانوں کو محفوظ مقامات پر پہنچانے کے لئے اپنی جان اور نوکری کی بھی پرواہ نہ کی۔ ان کی جرآت اور بہادری کا چرچا ہر زبان پر تھا۔ کوٹلی نصیر الدین پر جب سکھوں نے حملہ کرنا چاہا تو ملک اکرام نے اپنی پولیس چوکی سے متعدد رائفلیں نکال کر عیدگاہ داتم گنج کے جانبازوں کے حوالے کر دیں اور خود بھی کوٹلی نصیر الدین کے مسلمانوں کو ہندوؤں سکھوں کے چنگل سے نجات دلانے نکل پڑے۔ میاں معراج دین آف داتم گنج کے بیان کے مطابق ملک اکرام کے اس قومی جذبے کی وجہ سے کوٹلی نصیر الدین کے تین چار سو مسلمان تہ تیغ ہونے سے بچ گئے اور ان کو وہاں سے بحفاظت نکال لیا گیا۔

مسلمان پولیس افسروں کا کردار

حصول پاکستان کی جدوجہد کے دوران مسلمانوں کے جوش و جذبہ کا یہ عالم تھا کہ جہاں عام مسلمان اس تحریک کی تاریخ کو اپنے خون سے لکھ رہے تھے وہاں مسلمان پولیس افسروں اور سپاہیوں نے بھی اس تحریک میں قومی غیرت کے عدیم النظیر مظاہرے کئے اور مسلم دشمن انتظامیہ کی ناروا سختیوں کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتے ہوئے اپنی ملازمتوں اور دنیاوی آسائشوں کو بھی داؤ پر لگانے سے گریز نہ کیا۔

ایک روز امرتسر کے کروڑپتی ہندو سیٹھ لالہ گوکل چند کا پوتا کمپنی باغ کے قریب سول ہسپتال کے چوک میں ایک مسلمان راہگیر پر قاتلانہ حملہ کرتے ہوئے موقع پر گرفتار ہو گیا۔ اس مقدمے کی تفتیش کے لئے چودھری عبدالرحمان بلّا (تھانیدار) مامور ہوئے۔ چنانچہ گوکل مارکیٹ کے

کروڑپتی مالکوں نے اس مقدمے کی تفتیش کا رُخ موڑنے کے لئے چودھری عبدالرحمان کو نوٹوں سے بھرا اٹیچی کیس پیش کیا تو چودھری صاحب نے حقارت سے وہ اٹیچی کیس قاتلانہ حملہ کرنے والے ہندو نوجوان کے لواحقین کے منہ پر دے مارا اور کہا کہ لالہ جی اگر آپ اپنے برخوردار کو قتل کے اس مقدمے سے نکلوانا چاہتے ہیں تو مجھے رشوت پیش کرنے کے بجائے اپنے لیڈروں (گاندھی اور نہرو) سے کہیں کہ وہ قیام پاکستان کی مخالفت ترک کر دیں۔

گوکل مارکیٹ کے ہندو سیٹھوں نے چودھری صاحب کی اس گستاخی اور تجویز کے جواب میں اعلیٰ حکام سے ساز باز کر کے ان کا گوردا اسپور تبادلہ کرا دیا۔

اسی طرح ایک دفعہ ایک مسلمان زخمی حالت میں سلطان ونڈ کی پولیس چوکی پہنچا تو ہیڈ کانسٹیبل چوغطے خاں کی قومی غیرت جوش میں آ گئی۔ انہوں نے قاتلانہ حملہ کرنے والے غیر مسلم کو گرفتار کرنے کا قصد کیا تو سلطان ونڈ کی پولیس چوکی کے ہندو سکھ عملے نے اس راہ میں روڑے اٹکانے شروع کر دیئے جس پر چوغطے خاں نے احتجاج کیا تو ماسٹر تارا سنگھ کی مداخلت پر انہیں لائن حاضر کر دیا گیا۔

چوغطے خاں کے عزیز مسٹر انعام اللہ خاں (جو تقسیم کے بعد لاہور چھاؤنی میں آباد ہوتے) کے بیان کے مطابق چوغطے خاں جب پولیس لائن پہنچے تو وہاں کے ایک انگریز پولیس افسر نے ان سے مخاطب ہو کر کہا۔

چوغطے خاں۔ تم جس مسلم لیگ کے بل بوتے پر اکڑتے ہو اس کو ملیا میٹ کر دیا جائے گا۔

چوغطے خاں نے اس انگریز افسر کی ہرزہ سرائی کے جواب میں اپنا چپل اتار کر اس کے منہ پر مار دیا اور کہا

صاحب بہادر! میں اپنی ذاتی بے عزتی برداشت کر سکتا ہوں مگر اپنی قومی جماعت کے بارے میں نازیبا کلمات نہیں سن سکتا۔

انگریز افسر نے چوغطے خاں کی جرأت رندانہ پر انہیں فوری طور پر غیر مسلح کر کے کوٹھڑی میں بند

کر دیا اور بعد ازاں ان کا سیالکوٹ تبادلہ کر دیا۔ اسی طرح کے بے شمار واقعات مسلمان پولیس افسروں ملک محمد مست، حمید باجوہ، شاہ شجاع، ملک فیض، شریف چیمہ، جمیل قریشی، کیبانہ ریسٹورنٹ لاہور کے جعفری برادران کے والد صفدر جعفری وغیرہ سے بھی منسوب ہیں جنہوں نے آزمائش اور مصیبت کی گھڑی میں اسلامیانِ امرتسر کی بے حد خدمت کی۔ ان کے علاوہ امرتسر کے سٹی مجسٹریٹ سردار تیمور شاہ مرحوم ومغفور نے امرتسر کے مسلمانوں کی ڈھارس بندھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ سردار تیمور شاہ اور خواجہ غلام حسن ایڈووکیٹ نے تقسیم کے بعد امرتسر کے مسلمانوں کو نسبت روڈ اور گوالمنڈی کے علاقوں میں آباد کرنے کا کام بھی نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا۔

امرتسر کی مسلم دشمن انتظامیہ اور پولیس نے جب مسلمان پولیس افسروں اور سپاہیوں کو علی الاعلان اپنی قوم کی حفاظت کے لئے سینہ سپر دیکھا تو ۱۱ اگست ۴۷ء کے روز طے شدہ منصوبے کے تحت مسلمان پولیس ملازمین کو سرکاری اسلحہ جمع کرانے کے احکام صادر کر دئے۔ انتظامیہ کے اس حکم کی تعمیل میں جس مسلمان ملازم نے تھانے جا کر اسلحہ جمع کرانا چاہا اسے وہیں دھر لیا گیا۔ چنانچہ ڈسٹرکٹ پولیس لائن کے مسلمان عملے سے جب اسلحہ واپس لیا جانے لگا تو کندن لال مہتہ تھانیدار نے انہیں قطاروں میں کھڑے ہونے کا حکم دیا۔ اتفاق سے اس وقت لاہور کے مشہور بزرگ صحافی ملک ممتاز (جو ان دنوں ہندوستان کے ملٹری انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ میں ملازم تھے) اور روزنامہ مشرق کے سٹاف رپورٹر سید سعادت خیالی کے سسر شیخ عبدالغنی بھی پولیس لائن میں موجود تھے۔ ملک ممتاز کے بیان کے مطابق جب مسلمان سپاہیوں کو قطار میں کھڑا کیا جانے لگا تو عبدالکریم عرف آبا نامی سپاہی نے نہایت دلیری سے ایک درخت کی اوٹ لے کر کندن لال مہتہ پر گولی چلا دی۔ عبدالکریم کا نشانہ خطا گیا اور وہ گولی مہتہ کے بجائے ایک سکھ فوجی افسر کو لگ گئی اور وہ موقع پر ہلاک ہو گیا۔ ڈسٹرکٹ پولیس لائن میں کھلبلی مچ گئی۔ لوگوں نے افراتفری کے عالم میں اپنی جانیں بچانے کے لئے بھاگنا شروع کر دیا۔ ملک ممتاز، شیخ

عبدالغنی اور عبدالکریم آبا عیدگاہ کی طرف بھاگ رہے تھے اور مہنتہ تھانیدار غیر مسلم سپاہیوں سمیت ان کا تعاقب کرتے ہوئے کافی پیچھے رہ گیا تھا۔ الغرض عبدالکریم آبا کی جرأتِ رندانہ سے ہندوستانی پولیس کا وہ منصوبہ خاک میں مل گیا جس کے ذریعے وہ ڈسٹرکٹ پولیس لائن کے مسلمان ملازمین کو ہلاک کرنا چاہتے تھے۔

ان حالات کے پیشِ نظر امرتسر کے بعض مسلمان پولیس ملازمین نے از خود اپنی ڈیوٹی پر جانا چھوڑ دیا اور شریف پورہ (جو مسلمانانِ امرتسر کی بہت بڑی پناہ گاہ بنا ہوا تھا) میں روپوش ہو گئے۔

اسلامیانِ شریف پورہ کا جذبۂ اخوّت

اسلامیانِ شریف پورہ نے شہر کے اندرونی اور بیرونی علاقوں سے بے گھر ہو کر آنے والے مسلمانوں کے لئے نہ صرف دلوں کے دروازے کھول دیئے بلکہ ایک ایک گھر میں کئی کئی کنبوں کو جگہ دی۔ ان کے راشن وغیرہ کا مفت انتظام کیا۔ علاوہ ازیں مسلم ہائی سکول واقع جی ٹی روڈ کی عمارت میں امدادی کیمپ کھول دیا گیا۔ جس کا خرچ میاں محمد امین پراچہ، میاں اللہ دتہ، میاں محمد دین آف نیشنل فیبن، غلام محمد حصاریہ ایم اے مجید، میاں محمد شفیع صوفی نذیر حسین کے علاوہ متعدد مخیّر صاحبِ ثروت مسلمانوں کے ذمے تھا۔ شہر کے اندرونی حصّے اور مضافات سے لاتعداد لوگ بسے بسائے گھروں کو چھوڑ کر ننگے پاؤں بھاگے چلے آ رہے تھے کیونکہ مسلمان پولیس ملازمین سے اسلحہ واپس طلب کرنے کے احکام اور امرتسر کے ہندوستان میں چلے جانے کی خبروں نے ان کے جمے ہوئے قدم اکھاڑ دیئے تھے۔ مشہور مزدور لیڈر بشیر احمد بختیار، صوفی غلام محمد ترک، مولانا عبیداللہ آف جامعہ اشرفیہ، ملک محمد انور، حکیم مہردین، غلام حسن صمد، میاں محمد عمر چھبرا، ڈاکٹر عبدالمجید، چودھری امام دین مجاہد، بشیر سمندری، طفیل جنتروالیہ، لالہ راج پہلوان، شیخ عبدالرحمان، خواجہ اختر حسین، بشیر احمد شبلی، عبداللہ منہاس، غلام احمد، مظفر ساقی، شیخ غلام رسول، محمد علی رونق، فرخ

امرتسری، میاں سعید، حاجی سید نورالدین، ڈاکٹر ناصر جنگ، ملک عزیز بخش پراپرٹی ڈیلر، مستری محمد دین اور متعدد معززین علاقہ شریف پورہ میں پناہ لینے والے مسلمانوں کے لئے راشن کی سپلائی برقرار رکھنے میں مصروف تھے۔ اس موقع پر خواجہ محمد شفیع کشمیرو الا دہلی کے مسلمانوں کی طرف سے دس ہزار روپے کی امدادی رقم لے کر امرتسر آئے۔ ان کے علاوہ آس پاس کے شہروں اور دیہات کے مسلمانوں نے بھی اس آڑے وقت میں ریلیف کیمپوں کے لئے سبزیاں، اناج، اسلحہ اور عطیات ارسال کر کے اسلامیانِ امرتسر کی دل کھول کر سرپرستی کی۔

امرتسر پٹھانکوٹ ٹرانسپورٹ کمپنی کے حصہ دار شاہ محمد اور شاہ دین (مرحومین) آف شریف پورہ اپنی جانیں خطرے میں ڈال کر نہ صرف بہت سے گھرے ہوتے مسلمانوں کو موت کے منہ سے نکال کر محفوظ مقامات پر پہنچا رہے تھے بلکہ راشن اور سبزی وغیرہ کی سپلائی برقرار رکھنے کے لئے مضافات سے مطلوبہ اشیاء فراہم کر کے اپنی لاریوں کے ذریعے لا رہے تھے۔ اُن کے علاوہ مہان سنگھ گیٹ کے میاں غلام نبی نذیر احمد (تاجران گھی) حال مقیم ساہی وال نے بھی امرتسر کے مسلمانوں کی خدمت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔

ایک روز مہان سنگھ گیٹ کے باہر پھولا سنگھ کے بُرج میں جمع شدہ فوجی سکھوں نے شریف پورہ کی ملحقہ آبادی تحصیل پورہ کی طرف بُرج کے سوراخوں میں سے رائفلوں کی نالیاں نکال کر گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ حسین پورہ، شریف پورہ، گوکل پورہ اور تحصیل پورہ کے ہزاروں جوان اپنے سروں پر کفن باندھ کر نکل آئے۔ کچھ زمین پر لیٹ کر اور کچھ درختوں کی اوٹ میں چھُپ کر فائرنگ کا جواب فائرنگ سے دے رہے تھے کہ پھولا سنگھ کے بُرج سے بہت سے اکالی سکھ میدان میں نکلتے دکھائی دیئے جو شریف پورہ، گوکل پورہ اور تحصیل پورہ کی طرف پیش قدمی کرنے لگے۔ وہ ابھی چند قدم بھی نہ بڑھے تھے کہ بشیر احمد بختیار اور صوفی غلام محمد ترک نے خطرے کی نوبت بجانے کا حکم دے دیا۔ خطرے کی نوبت بجنے کی دیر تھی کہ شریف پورہ اور تحصیل پورہ کی آبادی کے درمیان نصب شدہ دستی توپ سے حملہ آور اکالیوں پر گولے پھینکے

گئے۔ اس دیسی توپ کے گولوں کا شور سن کر حملہ آور خوفزدہ ہو گئے اور چوہوں کی طرح بھاگ کر پھولا سنگھ کے برج میں چھپ گئے۔ حملہ آوروں کو پسپا ہوتے دیکھ کر شریف خاں، خواجہ اختر حسین، رفیق چودھری، ظہور، پونگی، غفور جارلی، عزیز خاں وغیرہ دیوانہ وار آگے بڑھنے لگے تو سردار محمد صادق اور خواجہ عبدالرشید (مرحومین) وغیرہ نے انہیں دوڑ کر پیش قدمی کرنے کے بجائے زمین پر لیٹ کر آگے بڑھنے کا مشورہ دیا ہی تھا کہ مہان سنگھ گیٹ کے ظہور نامی نوجوان کو (جو شہر کے دیگر مسلمانوں کی طرح شریف پورہ میں پناہ حاصل کر چکے تھے) پھولا سنگھ کے برج کی جانب سے برسنے والی گولیوں میں سے ایک گولی آ کر لگی اور وہ شہید ہو گئے۔

خواجہ محمد رفیق شہید کی فرض شناسی

ظہور کی شہادت کے بعد تحصیل پورہ کا پونگی نامی نوجوان بھی قربان ہو گیا۔ اس موقع پر تحصیل پورہ کے شریف اور لطیف (دونوں بھائیوں) کی بنائی ہوئی توپ کی گھن گرج نے دشمنوں کو خوفزدہ کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اور یہ تصادم خوفناک صورت اختیار کرتے کرتے رہ گیا۔ اس واقعہ کے اگلے روز اندرون شہر کے مسلمان شریف پورہ میں پناہ لینے کے لئے آرہے تھے کہ مہاں سنگھ گیٹ سے شریف پورہ کی طرف جانے والی سڑک سے گزرنے والے ایک خاندان کی پانچ حافظِ قرآن لڑکیاں دن دہاڑے برج پھولا سنگھ کے اکالیوں نے زبردستی اغوا کر لیں۔ ان لڑکیوں کے ضعیف العمر والدین نے شریف پورہ پہنچ کر جب دہائی دی تو خواجہ محمد رفیق شہید نے جی ٹی روڈ سے گزرنے والے باؤنڈری فورس کے ایک ٹرک کو کمال جرأت سے روک لیا اور اس میں سوار فوجیوں سے مخاطب ہو کر انہیں ان کی بیٹیوں کا واسطہ دیتے ہوئے مغویہ لڑکیوں کی بازیابی کی دردمندانہ اپیل کی جس کے جواب میں اس ٹرک میں بیٹھے ہوئے فوجی افسروں کی رگِ شرافت پھڑک اٹھی اور انہوں نے انسانی ہمدردی کے جذبے سے سرشار ہو کر پھولا سنگھ کے برج سے اسی وقت ان مظلوم لڑکیوں کو برآمد کر کے خواجہ محمد رفیق شہید کے

حوالے کردیا۔ خواجہ صاحب ان لڑکیوں کو شریف پورہ لے کر آتے تو سڑک کے کنارے کھڑے
بڑے بوڑھوں اور اغوا شدہ لڑکیوں کے والدین نے ان کے اس کارنامے پر دل کھول کر
شاباش دی۔ خواجہ محمد رفیق شہید کی زندگی کے ابتدائی دور سے لے کر ان کی زندگی کے آخری
ایام کی طرف جب بھی دھیان جاتا ہے تو امرتسر کے اس شیر دل نوجوان کی بے مثال جرأت مندی پر
مجھے خواجہ مختار احمد نازاں امرتسری کا یہ شعر یاد آجاتا ہے جو اُن کی چند روزہ حیات
کے آغاز اور انجام پر ہوبہو صادق آتا ہے ؎

صبح پہ تیری بھی دھوکہ ہی مجھے شام کا تھا
تیرا آغاز نمونہ ترے انجام کا تھا

پھولا سنگھ بُرج کے اکالی درندوں کو شریف پورہ کے مسلمانوں نے پسپا کردیا تو انہوں نے سلطان
ونڈ کے ہری سنگھ اور کالا سنگھ بدمعاشوں اور سکھ ریاستوں کے سابق فوجیوں کے تعاون سے
دتے دیر کے کی طرف سے رات کے اڑھائی بجے کے قریب محکم پورہ کے مسلمانوں پر شبخون مارا۔
چنانچہ محکم پورہ کے مسلمانوں نے جب فائرنگ کا جواب فائرنگ سے دیا تو سکھ سورماؤں
نے ایک قریبی مسلمان بستی مقبول پورہ کے نہتے مسلمانوں کی طرف قدم بڑھاتے اور اس چھوٹی سی
بستی کے مسلمانوں کو تشدد کا نشانہ بنایا۔ احمد دین نامی نوجوان (جس کی ایک آنکھ اس تصادم میں
ضائع ہو گئی تھی اور جو آج کل نسبت روڈ پر دیال سنگھ لائبریری کے بالمقابل مزدوروں کی تنظیم لیبر
فیڈریشن کے دفتر میں ملازم ہیں) کے بیان کے مطابق حملہ آور مقبول پورہ کی بستی میں پو پھٹنے
سے کچھ دیر قبل پہنچے۔ سب سے پہلے انہوں نے لائٹ بم (روشنی والا بم) پھینکا جس سے تمام
بستی میں اُجالا ہو گیا اور زمین پر چلنے والی چیونٹیاں تک اس چکا چوند میں صاف دکھائی دینے
لگیں۔ اس کے بعد گولیوں اور بموں کے خوفناک دھماکوں سے بستی میں کہرام مچ گیا۔ لیکن وہاں کے
مسلمانوں نے نہتے ہونے کے باوجود اوسان خطا نہ ہونے دیئے اور بڑی جرأت سے نعرۂ تکبیر
اور نعرۂ حیدری بلند کر کے حملہ آوروں کو آگے بڑھنے سے روکتے رہے۔ حملہ آور چونکہ اندھا دھند

فائرنگ کر رہے تھے اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد روشنی کے بم پھینک رہے تھے۔ اس لئے اس بستی کے محمد طفیل، محمد شفیع، غلام رسول اور ایک مسلمان حاملہ عورت کو موقع ہی پر شہید کر دیا۔ ان کے علاوہ گیارہ مسلمان بہت بُری طرح زخمی ہوئے۔ کسی کی ٹانگ بم سے اُڑ گئی، کسی کا بازو غائب ہو گیا اور کسی کی آنکھ ضائع ہو گئی۔ گیارہ زخمیوں میں سے تین ہسپتال جا کر شہید ہو گئے۔ احمد دین کے بیان کے مطابق وہ اپنے دیگر زخمی بھائیوں سمیت بے ہوش پڑا تھا۔ اسے جب ہوش آیا تو چند مسلمان پولیس افسر جائے واردات پر پہنچ چکے تھے اور حملہ آور جو گھوڑوں پر سوار ہو کر آئے تھے راہِ فرار اختیار کر چکے تھے۔"

شریف پورہ کی نالیوں میں شراب

مقبول پورہ کے کچھ زخمی اور عینی شاہد وہاں سے بھاگ کر شریف پورہ میں پناہ لینے گئے تو ان کی زبانی اس حملے کی تفصیل سن کر سردار خاں کے شاہجہان ہوٹل کے قریب جی ٹی روڈ پر واقع غیر مسلموں کا شراب خانہ اس علاقے کے نوجوانوں مرتضیٰ بٹ، شفیع بٹ، رفیق چودھری، وحید احمد پرویز، شہزاد بٹ، اسمٰعیل سالار، ناظر جیلانی، حیدر، صادق، خالد محمود، خلیفہ مصطفےٰ، حمید پانفروش اور شیخ حنیف، رشید بختیار وغیرہ نے لوٹ لیا اور بوتلیں توڑ کر تمام شراب گلی کوچوں میں نالیوں کی نذر کر دی۔ اس روز اس علاقے کے آس پاس کی گلیوں اور بازاروں کی تمام نالیوں میں شراب اس طرح بہہ رہی تھی جس طرح برسات کے موسم میں موسلا دھار بارش کے بعد پانی۔

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اس شراب خانے کے ملحقہ گودام سے اناج کی آٹھ سو بوریاں برآمد ہوئیں جو شریف پورہ ڈیفنس کمیٹی کے صدر ملک محمد انور نے اندرونِ شہر سے بے گھر ہو کر آنے والے مسلمانوں کے لئے وقف کر دیں۔ قدرت کی طرف سے ملنے والی اس اتفاقیہ مدد نے شریف پورہ کے ریلیف کیمپوں میں پناہ لینے والے مسلمانوں کی غذائی ضرورت پوری کر دی کیونکہ

کرفیو کے طویل اوقات اور خطرناک حالات نے اشیائے خوردنی کی فراہمی کے انتظامات درہم برہم کر دیئے تھے۔ جن لاریوں پر ڈیفنس کمیٹی کے کارکن شاہ دین، ڈاکٹر ناصر جنگ، بشیر سمندری، شاہ محمد وغیرہ سبزیاں اور غلہ لاتے تھے۔ پٹرول کی نایابی کی وجہ سے بیکار کھڑی تھیں چنانچہ شریف پورہ کے چند جیالوں نے گھی منڈی کے قریب واقع ہندو کے پٹرول پمپ کو لوٹ کر اس ضرورت کو پورا کیا۔ علاوہ ازیں مخدوش حالات کی وجہ سے شریف پورہ کے قریباً تمام خاکروب بھاگ گئے تھے جس کے باعث علاقہ میں گندگی اور بدبو سے بیماری پھیلنے کا خطرہ لاحق تھا۔ اس سلسلہ میں ملک محمد اکرم، ملک محمد اشرف مرحوم اور ان کے ساتھیوں نے آس پاس کے گلی کوچوں کی گندگی کو جس طرح اپنے ہاتھوں سے صاف کیا اس کی ہر کوئی تعریف کر رہا تھا

مہندی اور چوڑیوں کا تحفہ

فرقہ وارانہ فسادات کی آگ پھیلتے پھیلتے اگرچہ متحدہ پنجاب کے متعدد شہروں اور دیہات تک پہنچ چکی تھی مگر یہ عجیب اتفاق تھا کہ لاہور جیسا پرجوش شہر جو نہ صرف ہمیشہ سے سیاسی تحریکوں کا گہوارہ رہا ہے بلکہ پنجاب کی ہر تحریک اس شہر سے اٹھ کر پروان چڑھتی رہی ہے، بالکل خاموش تھا۔ امرتسر کے چند منچلوں نے لاہور کے مسلمانوں کے لئے امرتسر سے روزانہ لاہور جانے والی بابو ٹرین کے ایک ڈبے میں چوڑیاں اور مہندی رکھ کر بھیج دی جس سے ان کی مراد یہ تھی کہ زندہ دلانِ لاہور بھی مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کا بدلہ لینے کے لئے کمربستہ ہوں۔ اسلامیانِ امرتسر کی طرف سے بھیجی گئی چوڑیوں اور مہندی کی خبر کو لاہور کے اخبارات نے نمایاں طور پر شائع کیا جس پر لاہور کے مسلمانوں کی ملی غیرت نے جوش مارا اور امرتسر کے آزمودہ آتش زنوں کے تعاون سے انہوں نے لاہور کی شاہ عالم مارکیٹ کو نذرِ آتش کر دیا۔

امرتسر کے ہندو سکھ مقامی انتظامیہ، پولیس اور گورکھا فوج اسلامیانِ امرتسر کو صفحہ ہستی سے

مٹانے کی سرتوڑ کوشش کر رہے تھے کہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی وہ صبح قریب آگئی جس کے طلوع کی خاطر لاکھوں مسلمان جانی اور مالی قربانیاں دے رہے تھے۔ امرتسر پولیس کے اکثر مسلمان ملازمین سے سرکاری اسلحہ واپس لیا جا چکا تھا۔ جن ملازمین نے اسلحہ واپس نہیں کیا تھا وہ غلام محمد حصاریہ مرحوم کی جی ٹی روڈ (شریف پورہ) والی کوٹھی میں مقیم تھے اور پریشان حال مسلمانوں کی ڈھارس بندھا رہے تھے۔

امرتسر کے جیالے فرزند بھولا پہلوان اور منشو پہلوان کی امرتسر سے روانگی اور روپوشی کے بعد ان کی عدم موجودگی کے خلا کو بابو لٹین بمبے والے (جو آجکل بیڈن روڈ لاہور پر قیام پذیر ہیں) نے کافی حد تک پُر کر دیا تھا۔ مقامی انتظامیہ اور پولیس نے ان کی سنسنی خیز وارداتوں سے تنگ آکر ان کی گرفتاری اور "سر" کا انعام مقرر کر رکھا تھا

بابو لٹین کے بمبئی سے امرتسر آنے کا پس منظر بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ وہ امرتسر کے فرقہ وارانہ فسادات کی خبروں سے دل گرفتہ تھے اور امرتسر جانے کے لئے پَر تول رہے تھے کہ انہی دنوں بمبئی میں بھی فرقہ وارانہ فساد شروع ہو گیا۔ بابو لٹین نے بمبئی کی مخلوط آبادیوں میں گھرے ہوئے مسلمانوں کو محفوظ علاقوں میں پہنچانے کا کام اتنی سرگرمی سے کیا کہ وہ بمبئی کے ہندوؤں سکھوں کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح چبھنے لگے۔

ایک روز بمبئی کی کالبہ دیوی روڈ کے مندر سے کالبہ دیوی کی ارتھی کا سالانہ جلوس نکلا جلوس کے شرکاء اس ارتھی کو ہندو رسم و رواج کے مطابق سمندر کی نذر کرنے جا رہے تھے۔ جب یہ جلوس محمد علی روڈ پر پہنچا تو بمبئی کے چند مسلمان نوجوانوں نے ٹیکسی میں سوار ہو کر اس جلوس کے شرکاء پر گولیاں برسائیں جس کے نتیجے میں متعدد ہندو ہلاک اور زخمی ہو گئے۔ پولیس نے مقامی ہندو سیٹھوں کے ایما پر قتل کی اس واردات کی تمام تر ذمہ داری بابو لٹین کے کندھوں پر ڈال دی اور ان کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دیئے۔ مقامی پولیس نے بابو لٹین کو گرفتار کرنے کے لئے بمبئی کا کونہ کونہ چھان مارا لیکن وہ گرفتار نہ ہو سکے۔ پولیس کو جب پتہ چلا کہ بابو لٹین بمبئی سے

لاہور چلے گئے ہیں تو بمبئی پولیس نے ان کی گرفتاری کا کام پنجاب پولیس کے سپرد کر دیا۔ بابو لٹین کے بیان کے مطابق وہ بمبئی سے دہلی اور دہلی سے سیدھے امرتسر پہنچے تو انہیں پتہ چلا کہ ان کی آمد سے قبل پولیس ان کے امرتسر والے گھر پر چھاپہ مار چکی ہے چنانچہ وہ امرتسر سے لاہور چلے گئے۔ لاہور میں انہوں نے ہال روڈ پر واقع اپنے چچا کے ہاں قیام کیا۔ چند دنوں کے بعد امرتسر کے بھگتانوالہ دروازہ کے سیف میر اور بدر شاہ نے لاہور آکر انہیں امرتسر کے مسلمانوں کی خدمت کرنے کے لئے کہا۔ چنانچہ وہ سیف میر اور بدر شاہ کے ساتھ امرتسر پہنچ گئے۔

بابو لٹین نے امرتسر پہنچ کر مسلمانوں کی حالتِ زار دیکھی تو کٹڑہ کرم سنگھ، کٹڑہ سفید اور بھگتانوالے دروازے کے نوجوانوں کو یکجا کر کے وارداتیں شروع کر دیں۔ انہوں نے سب سے پہلے چڑے والے چوک کے سامنے والی ہندوؤں کی گلی کو نذرِ آتش کیا تو اس گلی میں آگ لگاتے ہوتے ان کے چھوٹے بھائی محمد امین بُری طرح جھلس گئے۔ علاقہ میں اناج کی زبردست قلت پیدا ہو چکی تھی چنانچہ بابو لٹین نے اپنے ساتھیوں کے تعاون سے بھگتانوالے سٹیشن کے گودام میں پڑی ہوئی چاول اور گندم کی سینکڑوں بوریاں لُوٹ کر لوگوں میں تقسیم کر دیں۔

ماؤنٹ بیٹن کی ناانصافی

یہ سلسلہ جاری تھا کہ ریڈیو پر قیامِ پاکستان کا اعلان ہو گیا۔ اس اعلان کو سنتے ہی امرتسر کے بعض علاقوں میں مسلمانوں نے آپس میں مٹھائیاں بانٹ کر مسرت کا اظہار کیا۔ ان کا خیال تھا کہ اب ان کے امتحان کی گھڑیاں ختم ہو گئی ہیں اور امرتسر پاکستان کے حصے میں آ گیا ہے۔ ان کی یہ خوش فہمی قدرتی تھی کیونکہ ۳ جون ۴۷ء کے اعلان کے مطابق مسلمانوں کو یہی توقع تھی کہ امرتسر اور ضلع گورداسپور مسلم اکثریتی علاقے ہونے کی بنا پر پاکستان میں شامل ہوں گے۔ علاوہ ازیں مسلم لیگ ہائی کمان نے بھی اسلامیانِ امرتسر کو یقین دلایا تھا کہ امرتسر پاکستان کے حصے میں آ رہا ہے۔ چنانچہ اس اعلان (۱۴ اگست ۴۷ء) سے دو روز قبل سردار شوکت حیات خان، کرنل علی انتظار شاہ اور

اور کرنل محمد ایوب خاں مرحوم (جو اُن دنوں باؤنڈری فورس کے اہم رکن تھے اور امرتسر ہوٹل میں مقیم تھے) ایک جیپ میں سوار ہو کر شریف پورہ کے مسلم ہائی سکول کے امدادی کیمپ پہنچے اور شریف پورہ مسلم لیگ کے صدر ملک محمد انور کی موجودگی میں انہوں نے لوگوں کو یقین دلاتے ہوئے کہا کہ آپ لوگ فکر نہ کریں کیونکہ بٹالہ پاکستان میں آگیا ہے اور آزمائش کی گھڑیاں ختم ہونے والی ہیں۔ لیکن متحدہ ہندوستان کے آخری انگریز وائسرائے شری ماؤنٹ بیٹن، دشمنانِ پاکستان اور باؤنڈری کمیشن کے چیئرمین مسٹر ریڈ کلف کی ملی بھگت نے گورداسپور جیسے مسلّمہ مسلم اکثریتی علاقے بھارت کے حصے میں دھکیل کر اسلامیانِ امرتسر کی امیدوں کے چراغ بجھا کر رکھ دیئے۔

کٹڑہ کرم سنگھ کے مسلمانوں کا غیض و غضب

نہرو خاندان کے چہیتے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی مذموم سازش اور ریڈ کلف کے غیر منصفانہ فیصلے نے امرتسر کے مسلمانوں کے جذبات میں چنگاریاں بھر دیں اور وہ بدلے ہوئے حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے لگے۔ کٹڑہ کرم سنگھ کے شیر دل مسلمانوں نے ہندوستان کی غیر منصفانہ تقسیم کے غم و غصّہ میں نمک منڈی کے قریب ہندوؤں کی لکڑی کی بہت بڑی مارکیٹ جلا ڈالی۔ اس خوفناک آتشزدگی کے شعلوں نے چڑے والے چوک، گلی لاہوریاں، گلی مولوی شاہ محمد تا اسلامیہ ہائی سکول خزانہ گیٹ اور حکیموں والے بازار کے علاقوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اس دوران میں مسجد رحمانیہ (اہلِ حدیثاں) بھی اس آتشزدگی کی زد میں آ گئی۔ چنانچہ اس مسجد کو آگ سے بچانے کے لئے مسلمانوں نے اردگرد کی دو دکانیں مسمار کر دیں۔ ان دو دکانوں کو مسمار کرتے ہوئے چراغ دودھ والے کا بیٹا عبدالکریم شہید ہو گیا۔ اسی طرح اس علاقہ کے سرکردہ نوجوان موسیٰ جراح بازار ستو والا میں ہندوؤں کی گولی کا نشانہ بن کر شہید ہو گئے۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ لکڑی کی اس مارکیٹ کو نذرِ آتش کرنے کے لئے خواجہ صلاح الدین مرحوم (سابق ڈائرکٹر کیمیکل ٹیکنالوجی انسٹی ٹیوٹ پنجاب یونیورسٹی) نے آتش گیر مادہ فراہم کیا تھا۔

یہ آگ اس قدر بھیانک تھی کہ تمام شب امرتسر کے مسلمانوں نے اذانیں دے کر گزاری۔ کیونکہ ایک تو رات کی تاریکی اور دوسرے کرفیو کے نفاذ کی وجہ سے کسی کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ یہ کس کی جائیداد جل رہی ہے۔ صبح کے وقت جب پتہ چلا کہ یہ کارنامہ کٹڑہ کرم سنگھ کے بہادر مسلمانوں نے انجام دیا ہے تو اسلامیانِ امرتسر نے چین کا سانس لیا۔

یوں تو امرتسر میں آئے دن آتشزنی کی وارداتیں ہوتی رہتی تھیں جن میں عام طور پر ہندوؤں سکھوں کے فلک بوس مکانات نذرِ آتش ہوتے تھے لیکن چوک پراگ داس اور کٹڑہ جیمل سنگھ کی خوفناک آتشزدگی کے جواب میں مسلمانوں کی طرف سے اتنی بڑی آتشزدگی کا ارتکاب نہیں ہوا تھا۔ جن لوگوں نے یہ آگ دیکھی وہ میری حرف بحرف تائید کریں گے کہ اس آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے اور کئی میلوں تک دکھائی دے رہے تھے۔ امرتسر فائر بریگیڈ کی سر توڑ کوششوں کے باوجود چھ سات روز تک یہ آگ فرو نہ ہو سکی کیونکہ ہوا کے تیز جھونکے شعلوں کو بھڑکانے میں اہم کردار ادا کر رہے تھے۔ امرتسر کے ہندوؤں کی لکڑی کی اس عظیم مارکیٹ کو شعلوں کے سپرد کرنے اور اس علاقہ کی مدافعت میں پیش پیش رہنے والوں میں بابو لیسین بجتے والا، موسیٰ جراح شہید، عبدالکریم شہید، ڈاکٹر ضیاء، حکیم علی محمد کے صاحبزادے خواجہ رؤف (راولپنڈی)، حبیب پہلوان، محمد شریف شربت والا (ملتان)، اسحاق پہلوان رسلی والا (بیڈن روڈ لاہور) سلطان محمود بٹ آف فیصل آباد کے والد حبیب اللہ بٹ، ماسٹر رشید، لطیف، چوہدری قمر دین، یونس، عبدالرحمان بٹ (ملتان)، مصطفےٰ پہلوان (سیلز مین باٹا) نادر بٹ پہلوان (پانی والا تالاب لاہور) محمد دین پشاوری، مولوی سعید، مولوی صادق (راولپنڈی) مولوی ریاض، ولو انصاری شہید، گاماں بھٹھیار، جبرو دھوبی، عبداللہ دیدار والا (راولپنڈی) حسا، ماجھا کھچی والا (ملتان) عبداللہ غلادی، صادق کمیو ٹنڈر، ظہور بٹ (ملتان) بیلہ دودھ والا (گوجرانوالہ) افضل دائیں، عزیز آف فیصل آباد اور ان کے شہید بیٹے مرتضیٰ پہلوان، عبداللہ میر، شیخ غلام محمد، عبدالوحید، عبدالغفور، استاد رشید ممتاز، حبیب قصائی، نورا سائیں، خواجہ لیسین، محمد سعفان میاں مظفر،

خواجہ زبیر، خواجہ متین اور معراج دین وغیرہ کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ اسی محلہ کے ڈاکٹر عبدالرؤف (جو اُن دنوں ایم اے او کالج کی یونیورسٹی آفیسرز کور جسے آجکل نیشنل کیڈٹ کور کہتے ہیں کے کمانڈنٹ اور شعبہ فلسفہ کے استاد تھے) نے اس علاقے کے نوجوانوں کو منظم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کی ہمشیرہ آسیہ میر (جو اُن دنوں میڈیکل کالج کی طالبہ تھیں اور آجکل لاہور کارپوریشن کے محکمہ صحت کے زنانہ شعبہ کی نگران ہیں) نے زخمی مسلمانوں کو ابتدائی طبی امداد بہم پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ ہاکی کے نامور کھلاڑی منیر ڈار اور تنویر ڈار کے بزرگوں نے بھی نمایاں خدمات انجام دیں۔ چنانچہ ان کے چچا نذیر ڈار نے اپنے خون سے امرتسر کی تاریخ لکھی۔ اسی طرح اس محلے اور شہر کے ممتاز گھرانے مولوی سراج الدین پال، مولوی ظہور الدین پال (مرحومین) مسٹر ذکی الدین پال، مسٹر عز الدین پال (جو آجکل کینیڈا کی وکٹوریہ یونیورسٹی میں اقتصادیات کے پروفیسر ہیں) مسٹر تقی الدین پال (جو آجکل حکومت پنجاب کے ڈپٹی ہوم سیکرٹری ہیں)، کے علاوہ خلیفہ احمد دین، گاماں پہلوان اور مولانا غلام محمد ترنم (مرحومین) نے تحریکِ پاکستان کے ابتدائی ایام سے لے کر قیامِ پاکستان تک اسلامیان امرتسر کی جس خلوص نیتی سے خدمت کی اس کی تعریف کے لئے موزوں الفاظ نہیں ملتے۔ اسی طرح مسٹر غفور پرویز، حکیم رؤف، خیر دین پہلوان، عبداللہ میر، حاجی محمد دین، چودھری عبداللہ، چودھری محمد عمر، چودھری محمد شریف، حاجی محمد ایوب وغیرہ نے اس علاقے کے نادار اور بیکار مسلمانوں کی دل کھول کر اعانت کی۔ چودھری محمد عمر اور چودھری محمد شریف کی بندوقوں اور ان کے شکاری کتوں نے اہلِ محلہ کی ڈھارس بندھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ علاوہ ازیں مظفر میاں (جو تقسیم کے بعد قیدیوں کے تبادلہ میں پاکستان آئے اور آجکل موہنی روڈ پر مقیم ہیں) کی فراہم کردہ دستی توپ کی گھن گرج نے ہندوؤں سکھوں کی طرف سے اس علاقے پر چڑھائی کرنے کے ارادوں کی تکمیل نہ ہونے دی۔ اسی علاقہ کے مشہور گتکے باز استاد معراج دین نے نوجوانوں کو شمشیر زنی کے داؤ پیچ سکھانے کے علاوہ انہیں عسکری تربیت دی جس کی وجہ

سے ان کے دلوں میں ایک نیا جوش وجذبہ پیدا ہوا۔

الغرض اسلامیانِ امرتسر نہایت حوصلہ مندی سے ہندوؤں سکھوں کا مقابلہ کر رہے تھے اور انہیں ناکوں چنے چبوا رہے تھے کہ چودھری خلیق الزماں نے ہندوستان کے ترنگے جھنڈے کو سلامی دے کر ہندوستانی مسلمانوں کو اپنی تقلید کا بھاشن دیا۔

چودھری صاحب کے الفاظ ابھی بھارتی مسلمانوں کے کانوں میں گونج ہی رہے تھے کہ ہندوستانی پرچم کو سلامی دینے کی نصیحت کرنے والے چودھری خلیق الزماں بھارتی مسلمانوں کو انتہائی کسمپرسی کی حالت میں بے یار و مددگار چھوڑ کر پاکستان آ گئے۔

امرتسر کی سنگدل مسلم دشمن انتظامیہ نے مسلمانوں کو حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے دیکھا تو ان کا صفایا کرنے کے لئے ہندوستانی فوج کی خدمات حاصل کر لیں۔ ایک طرف مسلمانوں کے علاقوں میں اشیائے خوردنی نایاب ہو چکی تھیں تو دوسری طرف بھارتی فوج، مقامی پولیس اور ہندو سکھ غنڈے ان کے خون سے ہولی کھیل رہے تھے۔ اسلامیانِ امرتسر کی حالت دیدنی تھی۔ ان پر مصیبت کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے اور وہ بے بسی کے عالم میں آسمان کی طرف نگاہیں اٹھا کر زبانِ حال سے کہہ رہے تھے ؎

جو بلا ہے وہ ہمارے ہی لئے ہے مخصوص
اے فلک کیا ترے سائے میں ہمیں رہتے ہیں

ہندوستانی پرچم لہرانے کا مطالبہ

امرتسری مسلمانوں نے ہندوستانی فوج کے میدان میں اترنے تک بے سرو سامانی کے باوجود ہندوؤں سکھوں کو کسی بھی محاذ پر برتری حاصل نہیں کرنے دی تھی لیکن بھارتی فوج کے شہر میں داخل ہوتے ہی ہندوؤں سکھوں کے حوصلے بڑھ گئے اور انہوں نے مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ اسلامیان امرتسر نے اپنے اپنے علاقوں میں مشاورتی اجلاس منعقد کئے جس میں پاکستان کی

طرف ہجرت کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا۔ شہر کے اندرونی حصوں رام باغ، چوک بجلی والا، کٹڑہ گھیاں، کوچہ ڈبگراں، چیل منڈی اور مہاں سنگھ گیٹ وغیرہ کے مسلمان فوجی درندوں اور بھارتی غنڈوں کی گولیوں کی بوچھاڑ سے گھبرا کر شریف پورہ کیمپ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ دوسرے علاقوں کے مسلمان امرتسر ریلوے سٹیشن کا رُخ کر رہے تھے اور ریلوے سٹیشن کو جانے والی تمام شاہراہیں مسلمانوں کے خون سے رنگین ہو رہی تھیں۔ اسی طرح شریف پورہ کی طرف جانے والے تمام راستوں پر امرتسر کے مسلمانوں کا خون بہہ رہا تھا۔ مسلمان دوشیزائیں (جنہوں نے کبھی اپنے سروں سے آنچل بھی سرکنے نہ دیا تھا) پاؤں اور سروں سے ننگی بھاگی چلی آ رہی تھیں اور شریف پورہ کی آبادی ان کے لئے عافیت کا گوشہ بنی ہوئی تھی۔ مقامی انتظامیہ نے شریف پورہ کے "قلعہ" میں مسلمانوں کو کثیر تعداد میں پناہ حاصل کرتے دیکھا تو شریف پورہ کے مسلمانوں کو ذہنی اذیت پہنچانے اور پریشان کرنے کے لئے اشیائے خوردنی کی ترسیل (راشن وغیرہ) کے تمام دروازے بند کر دیئے۔ مسلمانوں کے بچے کھچے لیڈروں صوفی غلام محمد ترک، بشیر احمد خاں بختیار اور ملک محمد انور وغیرہ نے احتجاج کیا تو اس کے جواب میں انتظامیہ کے افسروں نے شریف پورہ کی ڈیوڑھی پر ہندوستان کا ترنگا جھنڈا لہرانے کا مطالبہ کر دیا۔ چنانچہ مسلمانوں کی غالب اکثریت نے شریف پورہ پر بھارتی پرچم لہرانے کی تجویز مسترد کر دی۔ مقامی انتظامیہ (جس میں سنت رام سیٹھ (ایم ایل اے) بہال سنگھ (ڈی ایس پی) اور کندن لال مہتہ انسپکٹر پولیس وغیرہ بھی شامل تھے) کے اصرار اور صورتِ حال کی نزاکت کو ملحوظ رکھتے ہوئے چند معاملہ فہم بزرگوں نے شریف پورہ کی ڈیوڑھی کے قریب کھڑے ایک ریہڑے پر چند لمحوں کے لئے وہ جھنڈا لہرا دیا جس سے انتظامیہ کے کارندے طوعاً کرہاً "مطمئن" ہو کر چلے گئے۔

چوک فرید کی مُرغیاں

شریف پورہ کے بابو غلام سرور حسین پورہ کے اس پھاٹک کے قریب سے گزر کر سٹیشن

کی طرف جانے لگے (جو ڈنڈا پولیس اور بیبی باغ کی طرف کھلتا تھا) تو پولیس کے ایک دستے نے ان کی جامہ تلاشی لی۔ اس کے بعد نقدی اور زیورات چھین لئے۔ بابو غلام سرور اپنی تمام پونجی قانون کے رکھوالوں کے سپرد کر کے جب وہاں سے سول کورٹ المعروف ججی کچہری کی طرف بڑھے تو پیچھے سے زیورات چھیننے والے سورماؤں نے ان پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی اور وہ وہیں شہید ہو گئے۔

چوک فرید کے ضیاء الدین بٹ (لندن) نصیر الدین بٹ (سول سیکرٹریٹ لاہور) کے والد اور گوالمنڈی لاہور کی یونین کمیٹی کے سابق چیئرمین خواجہ ریاض محمود کے چچا خواجہ شمس الدین اپنے اہل و عیال سمیت حسنِ اتفاق سے بچتے بچاتے بحفاظت ریلوے سٹیشن پر پہنچ گئے لیکن سٹیشن پر پہنچنے کے بعد انہیں معاً خیال آیا کہ وہ اپنے گھر کی مرغیوں کو دانہ پانی ڈالے بغیر ڈربے میں محبوس بھوکا پیاسا چھوڑ آتے ہیں تو عزیز و اقارب کے سمجھانے بجھانے کے باوجود چوک فرید میں واقع اپنے مکان کی طرف روانہ ہو گئے۔ خواجہ ریاض محمود کے بیان کے مطابق ان کے نیک دل چچا اپنی خواہش کے مطابق اپنے گھر کی بے زبان بھوکی پیاسی مرغیوں کو دانہ ڈالنے اور آزاد کرنے میں تو کامیاب ہو گئے لیکن ریلوے سٹیشن سے واپس آتے ہوتے راستہ میں شہید کر دیئے گئے۔

تھانہ رام باغ کے سامنے والی گلی کوچہ پانڈیاں (جس میں مشہور شاعر ظہیر کاشمیری رہا کرتے تھے) کے آغا علی خاں کے چھوٹے بھائی اپنے افرادِ خانہ کے لئے خورد و نوش کا سامان تلاش کرنے نکلے تو گورکھا فوج کے سپاہی نے انہیں گولی مار کر شہید کر دیا۔ آغا علی خاں مرحوم کے بیان کے مطابق وہ شریف پورہ کیمپ میں پناہ حاصل کرنے کے لئے روانہ ہونے لگے تو ان کی ضعیف والدہ کہنے لگیں۔ جب تک میرا بیٹا سودا سلف لے کر نہیں آتے گا میں یہاں سے کسی صورت نہیں جاؤں گی۔ آغا صاحب نے اپنی والدہ صاحبہ کو بہتیرا سمجھایا کہ وہ شریف پورہ کیمپ میں چلا گیا ہو گا' ہم لوگ وہاں جا کر اس کو ڈھونڈھنے کی کوشش کریں گے'

زندہ ہوگا تو مل جاتے گا۔ لیکن ان کی والدہ اپنے جگر گوشے کے انتظار کی ضد پر اڑی رہیں۔ چنانچہ ہندوؤں سکھوں کے متعدد جتھے بھیانک نعرے لگاتے ان کے محلّے سے گزرے۔ آغا صاحب اپنے مکان کی منڈیر کے جھروکے سے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے کہ انہیں برابر والے مکان سے کسی عورت کے چیخنے چلّانے کی آواز سنائی دی۔ انہوں نے اس مکان کی طرف جھانک کر دیکھا تو وہ عورت رو رو کر کہہ رہی تھی کہ میرا خاوند اپنی بیوہ بہن اور اس کے بچّوں کو شریف پورہ کیمپ تک چھوڑنے گیا تھا، واپس نہیں آیا۔ آپ مجھے بھی اپنے ساتھ شریف پورہ لے چلیں۔ تھوڑی دیر کے بعد جب فسادیوں کی ٹولیاں نظروں سے اوجھل ہو گئیں تو آغا صاحب اپنی والدہ اور ہمسایہ عورت کو اس کے بچوں سمیت شریف پورہ چھوڑنے نکل پڑے۔ وہ ابھی تھوڑی دُور ہی گئے تھے کہ سامنے سے ہندو سکھ فسادیوں کا ایک گروہ آگیا۔ انہوں نے آغا صاحب جیسے گرانڈیل مسلمان کو دیکھا تو کھٹ سے گولی چلادی۔ آغا صاحب اپنی جان بچانے کے لئے وہاں سے بھاگ اٹھے۔ ان کی والدہ کے ساتھ جو ہمسایہ عورت تھی اس کو فسادیوں نے اس کے معصوم بچوں سمیت وہیں ڈھیر کر دیا۔ آغا صاحب کی والدہ کو اپنے بیٹے کی شہادت نے پہلے ہی نڈھال کر رکھا تھا۔ وہ یہ دلخراش منظر دیکھ کر بے ہوش ہوگئیں۔ ممکن تھا کہ فسادی انہیں بھی شہید کر دیتے کہ اس اثنا میں اتفاق سے ایک فوجی جیپ جائے واردات کے قریب سے گزری جس کو آتے دیکھ کر فسادی بھاگ گئے اور جیپ میں سوار انگریز افسر نے آغا صاحب کی والدہ کو جیپ میں ڈال کر شریف پورہ ریلیف کیمپ پہنچا دیا۔ آغا صاحب مشتعل ہجوم کی نظروں سے بچتے بچاتے اپنی گلی کے موڑ پر پہنچے تو ان کی گلی سے ایک سکھ فوجی بندوق اٹھائے نمودار ہوا۔ اس نے آغا صاحب کی طرف رائفل کا دہانہ موڑ کر انہیں موت کے گھاٹ اتارنا چاہا تو آغا صاحب نے اپنے ہوش و حواس قائم رکھتے ہوئے اس سکھ فوجی کی طرف اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا اٹیچی کیس بڑھاتے ہوئے کہا کہ سردار جی۔ اس میں ڈھیر سارے زیورات اور نقدی موجود ہے۔ آپ مجھ کو

مارنے کے بجائے یہ اٹیچی لے لیں اور مجھے جان سے نہ ماریں۔ آغا صاحب کا تیر نشانے پر بیٹھا اور سکھ فوجی نے اس سودے کو منظور کرتے ہوتے تنی ہوئی رائفل کا دہانہ سرنگوں کر کے آغا صاحب کی تمام عمر کی کمائی سے بھرا ہوا اٹیچی دبوچ لیا۔ آغا صاحب اپنی جان بچانے کے خیال سے دوڑ کر اپنے محلّے کے ایک پرانے مکان میں چھپ گئے جو سردار شنکر سنگھ کا تھا اور عرصہ دراز سے ویران ہونے کے سبب جا بجا مکڑیوں نے جالے بُن رکھے تھے۔ اس مکان میں دن کے وقت بھی رات جیسا اندھیرا ہوتا تھا اور زمانہ امن میں بھی لوگ اس مکان کے قریب سے گزرتے وقت خوف کھایا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ اس مکان میں بھوتوں نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔

آغا صاحب اس تاریک اور بوسیدہ مکان میں چھپے ہوتے تھے کہ فسادیوں کی ایک ٹولی اس محلّے کے مسلمانوں کے مکانوں کو نذرِ آتش کرنے آگئی۔ انہوں نے گلی میں داخل ہوتے ہی اندھا دھند فائرنگ شروع کی تو اس محلّے کے ایک متعصب ہندو نے حملہ آوروں سے مخاطب ہو کر کہا کہ بھائیو۔ بلاوجہ اپنی گولیاں ضائع نہ کرو کیونکہ اس محلّے کے تمام "سوّر" بھاگ گئے ہیں۔ ابھی فسادیوں کی چہ میگوئیاں جاری تھیں کہ رام باغ تھانے کے ایک غیر مسلم پولیس افسر نے فسادیوں سے کہا کہ جلدی سے مسلمانوں کے مکانوں کو آگ لگاؤ اور بھاگ جاؤ کیونکہ ابھی تھوڑی دیر میں باونڈری فورس کے افسر ہمارے تھانے کا معائنہ کرنے آ رہے ہیں۔ فسادیوں میں سے ایک فسادی نے اس پولیس افسر سے کہا کہ مہاراج۔ ہم اوپر والوں کی ہدایت کے مطابق مسلمانوں کے مکانات کو نشان لگا چکے ہیں اور ان مکانوں کا قیمتی سامان لوٹنے کے بعد آگ لگائیں گے۔

آغا صاحب سردار شنکر سنگھ کے بوسیدہ مکان کی تاریک سیڑھیوں میں بیٹھے فسادیوں کی سرگوشیاں سُن رہے تھے کہ اس اثناء میں حملہ آوروں کی ایک ٹولی مسلمانوں کے گھروں سے سامان نکال نکال کر گلی میں پھینکنے لگی اور دوسری ٹولی مسلمانوں کے لٹے ہوتے مکانوں پر پٹرول چھڑک کر آگ لگانے میں مصروف ہو گئی۔

انسانی لاشیں اور کُتے

آغا صاحب تین روز تک بھوکے پیاسے اس تاریک اور ویران مکان میں چھپے رہے۔ بالآخر ایک روز علی الصبح انہوں نے اپنے تمام کپڑے اتار کر بدن پر راکھ ملی۔ گلی میں پڑے ہوئے بھنگیوں کا ٹوکرا سر پر رکھا اور جھاڑو ہاتھ میں لے کر بھنگیوں کی طرح سڑکوں کی صفائی کرتے ہوتے شریف پورہ پہنچ گئے۔ راستے میں انہوں نے جابجا مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کی لاشیں بکھری پائیں جن کو آوارہ کُتے اور گِدھ نوچ نوچ کر کھا رہے تھے۔

آغا صاحب نے شریف پورہ پہنچتے ہی اپنی والدہ کی تلاش شروع کر دی۔ ان کی والدہ شریف پورہ کے ریلیف کیمپ میں نیم مُردہ پڑی تھیں۔ اپنے لختِ جگر اور نورِ نظر کو زندہ سلامت دیکھ کر ان کی جان میں جان آگئی اور قدرت نے بچھڑے ہوتے ماں بیٹے کو ملا دیا۔

بجلی والے چوک کے معراج دین بٹ اپنے محلّے کوچہ نیم والا کے مسلمانوں کو لے کر شریف پورہ کی طرف آنے لگے تو ان پر اسی محلّہ کے ایک ساتھ کھیلے ہوتے ہندوؤں نے دستی بم مارا جس سے باقی مسلمان تو بچ گئے مگر معراج دین بٹ (جو راقم الحروف کے خالہ زاد بھائی ہیں اور تقسیم کے بعد راولپنڈی میں مقیم ہیں) بُری طرح زخمی ہو گئے۔ ان کی دونوں ٹانگوں میں بم کے ان گنت ٹکڑے دھنس گئے۔ شریف پورہ کے ممتاز سماجی کارکن اور مزدور لیڈر ڈاکٹر عبدالمجید مرحوم (جو تقسیم کے بعد چوک گوالمنڈی لاہور میں پریکٹس کرتے تھے) نے کافی تگ و دو کے بعد بم کے فولادی ٹکڑوں کو ایک ایک کر کے نکالا۔ اس موقعہ پر شریف پورہ کے ڈاکٹر عبدالرحمن اور ڈاکٹر محمد شفیع نیاز نے بھی شہر سے آنے والے زخمی مسلمانوں کو مفت طبّی امداد بہم پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا۔

زیلوے کے حامد حسن (جن کی ایک آنکھ چوک فرید کے معرکے میں کام آگئی تھی) نے اپنے محلّہ کوچہ سنگیاں کے لوگوں کو بدلے ہوتے حالات میں پاکستان روانہ ہونے کا مشورہ دیا تو اہلِ محلّہ نے دو تین روز کے لئے اپنی روانگی ملتوی کر دی جس کے نتیجے میں ان کے محلّے کے بیشتر

مسلمان شہید ہو گئے جن میں سے بعض کو بچے کھچے محلے داروں نے اپنے گھروں میں گڑھے کھود کر دفن کیا۔ اروڑیاں والی گلی کے ماسٹر عبدالعزیز کو بھی فسادیوں نے شہید کر دیا اور ان کی جوان ہمشیرہ کو اغوا کر کے لے گئے۔ کٹڑہ شیر سنگھ کہنہ کے صوفی برادران کے چار بھائیوں میں سے تین بھائیوں کو شہید کر دیا گیا۔ ان چار بھائیوں میں سے صرف صوفی ظہور زندہ بچے۔ کٹڑہ باگھ سنگھ کے بابو حسن شاہ کو بھی ان کے محلے داروں نے شہید کر دیا۔ کوچہ خراسیاں کی رحمتے نامی عورت کے جسم کے دو ٹکڑے کر کے فسادی اسے برہنہ بازار میں پھینک گئے۔

ضعیف العمر امام مسجد کی شہادت

امرتسر کے محلہ بکر داناں کے ۷۰ سالہ امام مسجد کو فسادی شہید کرنے لگے تو وہ مسجد میں بچھی ہوئی چٹائی کے ساتھ چمٹ گئے۔ فسادیوں میں سے کسی نے پوچھا کہ بابا۔ تم پاکستان کیوں نہیں گئے۔ اس ضعیف العمر امام مسجد نے مسجد کے صحن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اس مسجد میں گزشتہ پچاس برس سے امامت کے فرائض انجام دے رہا ہوں۔ اس کے چپے چپے اور کونے کونے میں میرے سجدوں کے نشان ثبت ہیں۔ اس لئے میں اس خانۂ خدا کو چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا۔ فسادیوں نے اس بوڑھے امام مسجد کو مخاطب کر کے تلواریں لہرائیں اور کہا بابا۔ ہم تمہیں پاکستان پہنچا دیتے ہیں یہ کہہ کر اس ضعیف العمر امام مسجد کو "پاکستان" پہنچا دیا گیا۔ اس دردناک واقعہ کی تصدیق قیام پاکستان کے بعد اسی محلے کے ایک ہندو کلاس فیلو نے ان دنوں کی جن دنوں راقم مغویہ خواتین کی بازیابی کے سلسلہ میں ہندوستان جانے والے ایک وفد (جس کے قائد رانا محمد جہانگیر تھے) کے ساتھ امرتسر گیا تھا۔

مسلمان دوشیزہ کی درد بھری سرگزشت

کمپنی باغ کے قریب مال روڈ پر واقع گورنمنٹ گرلز ہائی سکول کے مسلمان ہیڈ کلرک

افتخار حسین کاظمی کے والد بڑے بھائی یاور حسین کاظمی آف انبالہ اور ان کی اکلوتی جوان سال ہمشیرہ جوہر کو شہید کرنے کے لئے فسادی جب سکول کے احاطہ کی طرف اشتعال انگیز نعرے لگاتے بڑھے تو انہوں نے سب سے پہلے افتخار حسین کاظمی مرحوم اور ان کے بوڑھے والد کو شہید کیا۔ افتخار حسین کاظمی زخمی حالت میں جب بھاگے تو سکول کے اردگرد لگی ہوئی خاردار تاروں میں اُلجھ گئے۔ فسادیوں نے خاردار تاروں میں اُلجھے ہوتے اس مظلوم مسلمان پر اسس بیدردی سے برچھے مارے کہ ان کا جسم زخموں سے چھلنی ہو گیا۔ اس کے بعد حملہ آور ان کے بڑے بھائی یاور حسین کاظمی پر ٹوٹ پڑے جس کے نتیجے میں وہ بھی شہید ہو گئے۔ فسادیوں نے ان تینوں مسلمانوں کی لاشوں کو یکجا کر کے ان پر پٹرول چھڑک دیا۔ فسادی ابھی ان مظلوموں کی لاشوں کو لگائی جانے والی آگ کے شعلوں کے اردگرد کھڑے ہو کر" نونہال۔ ست سری اکال' جے ہند اور جو مانگے گا پاکستان اس کو دیں گے قبرستان کے بھیانک نعرے لگا رہے تھے کہ اس اثناء میں کاظمی صاحب کی جوان سال ہمشیرہ کو (جو سکول کی ملحقہ کوٹھی کے ایک کمرے میں چھپی ہوئی تھی اور جس کے ہندو مالک اور گھر کی عورتوں نے خطرے کی صورت میں پناہ دینے کا وعدہ کر رکھا تھا) مصیبت کی اس کٹھن گھڑی میں یہ کہہ کر اپنی کوٹھی سے نکل جانے کا حکم دے دیا کہ ہم تمہاری وجہ سے اپنی جائداد اور اولاد کو خطرے میں نہیں ڈال سکتے" اس لئے بہتر یہی ہے کہ تم یہاں سے نکل جاؤ۔

مائی کوشلیا اور استانی سکھونت کور

بیچاری جوہر نے جب دیرینہ ہمسایوں کی طوطا چشمی دیکھی تو وہ اپنے قول سے پھر جانے والے بزدلوں کی کوٹھی کی عقبی کھڑکی سے کود کر چھپتی چھپاتی اس سکول کے بچوں کے پاس سودا بیچنے والی مائی کوشلیا کے کوارٹر کی طرف بھاگی گئی۔ کوشلیا نے کمال جرأت سے جوہر کو اپنے کوارٹر میں چھپا لیا۔ فسادیوں کو جب کسی شرپسند نے بتایا کہ شہید ہونے والے مسلمانوں کے ساتھ ان کی جوان ہمشیرہ
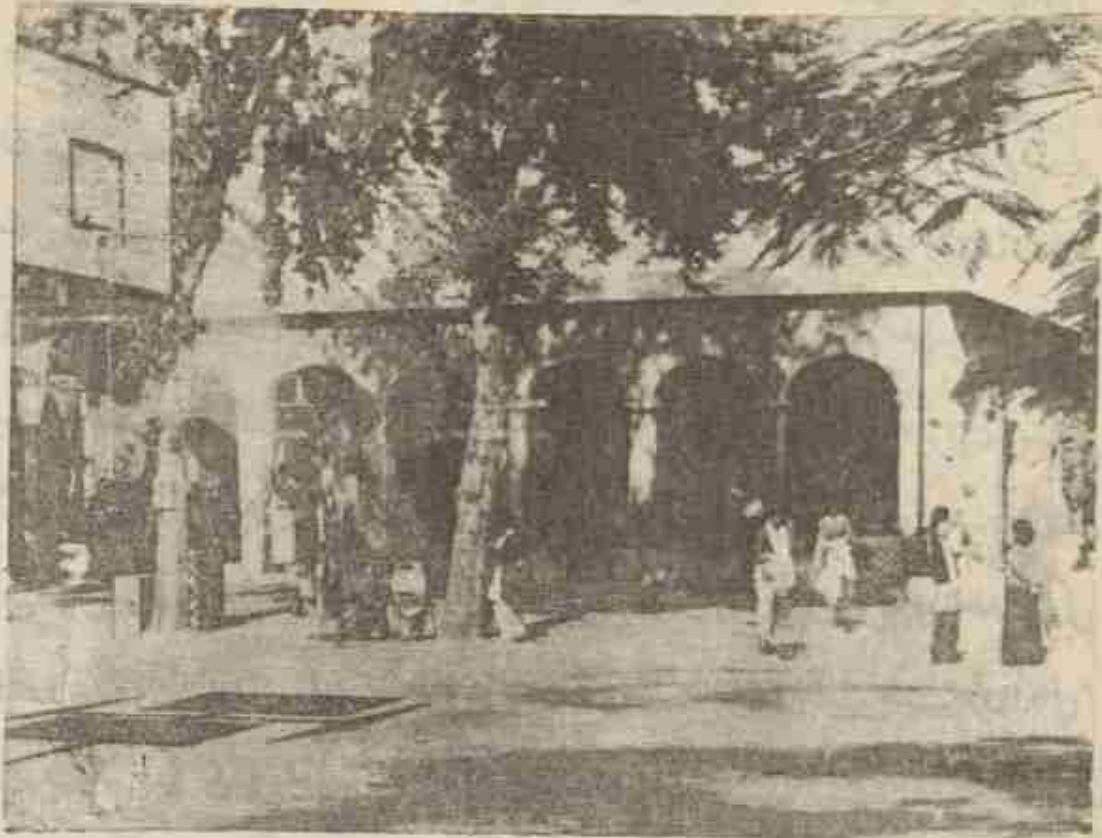
امرتسر گورنمنٹ گرلز ہائی سکول کی عمارت جہاں افتخار حسین کاظمی ہیڈ کلرک اور ان کے افرادِ خانہ شہید کئے گئے لیکن ان کی جوان سال ہمشیرہ جوہر معجزانہ طور پر بچ گئی۔

کرتوہ کرم سنگھ کے دو بھائی چودھری محمد عمر اور چودھری محمد شریف جنہوں نے اپنی گرہ سے اہلِ محلہ کے اجتماعی جرمانے ادا کئے

بھی رہا کرتی تھی تو شراب کے نشے میں دُھت حملہ آوروں نے جوہر کی تلاش شروع کر دی فسادی جوہر کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے جب کوشلیا کے کوارٹر تک پہنچے تو جوہر سجدے میں پڑی کربلا کے شہیدوں کے صدقے میں باری تعالیٰ سے اپنی عزت اور عصمت کی حفاظت کی دعائیں مانگ رہی تھی۔ فسادیوں نے کوشلیا سے جب جوہر کی بابت پوچھا کہ سکول کے کوارٹروں میں رہنے والے مسلمانوں کی جوان بیٹی کہ تم نے ادھر سے گزرتے دیکھا ہے تو ہمیں جلدی سے بتاؤ کہ وہ کس طرف گئی ہے؟

کوشلیا نے فسادیوں کے تیور دیکھ کر مسلمانوں کو غلیظ گالیاں دینی شروع کر دیں اور حملہ آوروں کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ اس لڑکی کو تو اس کے والدین نے کافی عرصہ قبل یہاں سے کسی دوسری جگہ منتقل کر دیا تھا۔

فسادیوں نے کوشلیا کی زبان سے جب یہ بات سنی تو مایوس ہو کر چلے گئے۔ اگلے روز کوشلیا نے جوہر کو سکھ عورت کا لباس (ساڑھی اور لوہے کا کڑا) پہنایا اور گورنمنٹ گرلز ہائی سکول کی فرشتہ سیرت سکھ استانی سکھونت کور کے ہاں پہنچا دیا۔

سکھونت کور نے چند روز جوہر کو اپنی حقیقی بیٹیوں کی طرح بحفاظت اپنے پاس رکھا اور اس کے بعد جالندھر کی طرف سے آنے والے بلوچ رجمنٹ کے ایک فوجی ٹرک میں سوار کر کے پاکستان بھجوا دیا۔ بلوچ رجمنٹ کے فرض شناس فوجیوں نے لاہور پہنچ کر جوہر کو میو ہسپتال کے پاکستان کے نیک دل اور نامور سرجن ڈاکٹر امیر الدین کے حوالے کر دیا۔ ڈاکٹر امیر الدین نے کئی روز تک جوہر کے لواحقین کی تلاش جاری رکھی۔ ایک روز ڈاکٹر صاحب کی ایک ہمسایہ خاتون مس وحیدہ شاہ (جو چوبرجی کوارٹرز گورنمنٹ گرلز ہائی سکول میں معلمہ تھیں) نے اس لڑکی سے اس کی درد بھری کہانی سنی تو راقم الحروف کی والدہ (جو امرتسر گورنمنٹ گرلز ہائی سکول میں پڑھایا کرتی تھیں اور تقسیم کے فوراً بعد چوبرجی کوارٹرز گورنمنٹ گرلز ہائی سکول میں معلمہ تھیں) کو سکول آ کر جوہر کی لرزہ خیز سرگزشت سنائی۔ راقم کی والدہ اسی وقت مس وحیدہ شاہ کے ہمراہ ڈاکٹر

امیرالدین کی کوٹھی پہنچیں۔ وہاں جوہر سے آمنا سامنا ہوا تو وہ چیخیں مارتی ہوئی میری والدہ سے لپٹ گئی اور جوہر اسی روز نسبت روڈ پر ہمارے ہاں آگئی۔ وہ کافی دنوں تک ہمارے گھر میں مقیم رہی۔ بعدازاں جب اس کے قریبی عزیزوں سے رابطہ قائم ہوا تو وہ اپنے رشتہ داروں کے ہاں منتقل ہوگئی۔

فسادی گورنمنٹ گرلز ہائی سکول کے ہیڈ کلرک افتخار حسین کاظمی ان کے والد اور بڑے بھائی یاور حسین کاظمی کے خون سے ہاتھ رنگنے کے بعد کمپنی باغ کی ٹھنڈی کھوئی سے متصل مسجد خواجہ محمد احمد غلام صادق کی طرف بڑھے اور گھنے درختوں کے سائے میں بنی ہوئی اس خوبصورت مسجد کو شہید کردیا۔

الغرض ہندوستانی فوج، پولیس اور ہندو سکھ غنڈے امرتسر کے مسلمانوں کا نام و نشان تک مٹانے پر تلے ہوتے تھے۔ کہیں نوجوان لڑکیوں کی عصمتیں لوٹی جارہی تھیں۔ کہیں مساجد کی بےحرمتی ہورہی تھی اور کہیں مسلمانوں کو کلمہ گوئی اور پاکستان کے مطالبہ کے جرم کی سزا دی جا رہی تھی۔ امرتسر کے گلی کوچوں میں مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہہ رہا تھا اور وہ بےبسی کے عالم میں اپنے عزیزواقارب کی لاشوں سے گزرتے ہوتے چھاؤنی، شریف پورہ اور مقبول فلور ملز کے ریلیف کیمپوں کا رخ کررہے تھے۔

ایم اے او کالج، ہال بازار، چوک فرید، چوک بجلی والا، رام باغ اور اندرون شہر کے مسلمانوں کے متعدد علاقوں سے شعلے اٹھ رہے تھے۔

فوجی درندوں، مقامی پولیس، مہاسبھائی غنڈوں اور اکالی سورماؤں نے جلیانوالہ باغ کی نیویں گلی، بازار بکرواناں اور کوچہ رنگریزاں کے بےبس مسلمانوں کو جس بیدردی سے شہید کیا اس کی تفصیل قلم کی زبان پر لانے کا تصور ہی پلکیں نمناک کردیتا ہے اور جسم کا رواں رواں کانپ اٹھتا ہے۔

○

سرزمینِ امرتسر کے مایۂ ناز فرزند

صوفی غلام محمد ترک

بشیر احمد خاں بختیار

ملک محمد انور

ڈاکٹر عبد المجید

خواجہ غلام حسن ایڈووکیٹ

ایس محمد دین آف نشیش فین
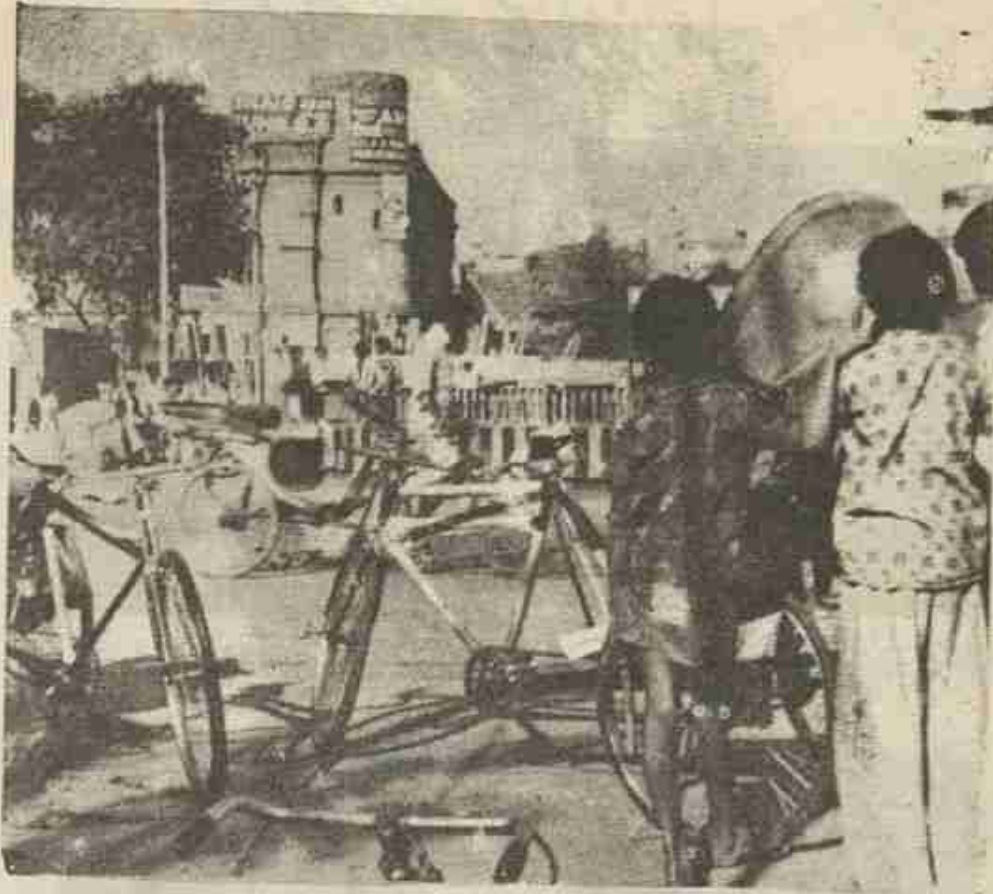
مسلم ہائی سکول (شریف پورہ) امرتسر کی عمارت جس میں مہاجرین کا امدادی کیمپ قائم ہوا۔

شریف پورہ ڈیوڑھی کی بیرونی شاہراہ جی ٹی روڈ کا وہ حصہ جہاں سے بلوچ رجمنٹ کے فرض شناس
جوانوں نے اسلامیان امرتسر کو ٹرکوں کے ذریعے بحفاظت پاکستان پہنچایا۔

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

پانچواں باب

صبحِ آزادی

مسجد ترتم اس شہر کی اہم ترین دینی درس گاہ تھی اور اس میں نہایت پُر آشوب ایام
اور بحیثیت نامساعد حالات میں بھی پانچ وقت اذان کی ایمان افروز صدا بلند ہوتی تھی۔ ہر صبح
قرآن پاک کا ورد ہوتا تھا۔ طالب علم دینی تعلیم میں دن رات مشغول رہتے تھے اور شب و روز
وعظ و کلام درس و تدریس اور رُشد و ہدایت کے چشمے بہتے تھے۔ لیکن پاکستان کی صبح آزادی
اس محلّے کے ساکنوں کے لئے شبِ قیامت ثابت ہوتی۔ عید سے تین دن پہلے رمضان المبارک
کی ۲۷ویں روز ریاستی اور گورکھا فوج نے مقامی ہندو سکھ بلوائیوں کی ایما پر اس مسجد پر حملہ
بول دیا۔ مخدوش حالات کی وجہ سے محلّے کی تمام مستورات نے جن سنگھی غنڈوں اور اکالی دلوں
کے متوقع حملے کے پیشِ نظر اس مسجد میں پناہ لے رکھی تھی اور ان کے تمام رشتہ دار مرد قرآن پاک
کی تلاوت کر رہے تھے کہ ان لعینوں نے نہ صرف تمام مسلمانوں کو بے دردی سے تہ تیغ کر دیا بلکہ
قرآن پاک کے مقدس نسخوں کی بے حرمتی بھی کی۔ مسجد میں موجود مستورات نے جن میں نوجوان لڑکیوں
کی کثرت تھی مسجد کے ملحقہ کنوئیں میں چھلانگیں لگا کر اپنی آبرو بچائی، مگر اس اچانک حملے کی وجہ سے
جو لڑکیاں کنوئیں تک نہ پہنچ سکیں۔ ان بیچاریوں کے ساتھ مسجد کے اندر انتہائی بہیمانہ سلوک
کیا گیا۔ فسادی ان کی عزتیں لوٹنے کے بعد لاشوں کو برہنہ حالت میں چھوڑ کر چلے گئے۔

اس دردناک سانحہ کا ذکر امرتسر کے مشہور بزرگ صحافی فرخ امرتسری مرحوم نے اپنی تصنیف "خون کی ہولی" کے صفحہ ۴۸ پر اس طرح کیا ہے۔

"۱۴ اگست ۴۷ء کو میجر لوپرن سنگھ مجسٹریٹ دفعہ ۳۰۔ انچارج علاقہ شریف پورہ کے کیمپ میں آتے اور صوفی غلام محمد ترک نے جب سکھ وحشیوں کے انسانیت سوز مظالم کا ذکر کیا تو وہ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ جائے واردات تک چلنے کو آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ صوفی غلام محمد ترک، میجر لوپرن سنگھ، دو فوجی سپاہیوں اور میجر صاحب کے عملے پر مشتمل ایک پارٹی شہر میں گئی۔ جابجا لاشیں پڑی پائیں۔ راستہ خون سے رنگین دیکھا۔ مکانات کھنڈر بنے ہوتے بھیانک تباہی کا نقشہ پیش کر رہے تھے۔ یہ دردناک منظر کچھ کم نہ تھا کہ وہ مسجد رنگریزاں میں پہنچے جہاں گیارہ نوجوان لڑکیوں کی دردانگیز لاشیں اپنی مظلومیت کا صورتِ حال سے اظہار کر رہی تھیں۔ وہ سب بے جان تھیں۔ ان کے زخموں سے خون جاری تھا۔ پیٹ چاک تھے" امرتسر کے معروف مزدور لیڈر صوفی غلام محمد ترک (جو سوشلسٹ ذہن رکھتے تھے اور تقسیم کے بعد نسبت روڈ پر ترک ہوٹل کے مالک تھے) نے اپنی سرگزشت "داستانِ ترک" میں اسلامیانِ امرتسر پر ہندوؤں سکھوں کے مظالم کی تفصیل بیان کرتے ہوتے لکھا ہے۔

"جب ہم کوچہ رنگریزاں کی مسجد سے باہر نکلے تو ایک مکان کے پرنالے سے خون بہہ رہا تھا۔ مکان کی چھت پر چڑھ کر دیکھا تو ایک عورت کے شیرخوار بچے کے جو تقریباً ڈیڑھ مہینہ کا ہوگا، ٹکڑے ٹکڑے پڑے ہوتے تھے۔

(صفحہ ۹۲ داستانِ ترک)

دو آنکھیں دو خنجر

مسجد کوچہ رنگریزاں کے برابر والے مکان کے حکیم جان محمد مرحوم، مسعود بٹ (جو آجکل

ملتان ہوتے ہیں) خواجہ حامد حسن خیال کے والد خواجہ غلام حسن ایڈووکیٹ مرحوم (جو تقسیم کے بعد ملتان میونسپل کمیٹی کے قانونی مشیر تھے) ممتاز مسلم لیگی کارکن خواجہ غلام نبی لیڈر اور صوفی غلام محمد ترک (مرحومین) نے بھی اس لرزہ خیز سانحہ کے بعد مسجد زنگریزاں پر گزرنے والی قیامت کے دردناک مناظر دیکھے۔ خواجہ غلام حسن ایڈووکیٹ، خواجہ غلام نبی لیڈر اور صوفی غلام محمد ترک (جو صوفی نصیر آف اوکے ریڈیو ہال روڈ لاہور کے والد تھے) کے بیان کے مطابق جب وہ جائے واردات پر گئے تو ان کی نظریں ایک مکان کے پرنالے پر پڑیں جس میں سے انسانی خون بہہ رہا تھا۔ وہ لوگ اس مکان پر چڑھے تو وہاں ایک مسلمان عورت برہنہ حالت میں مری پڑی تھی اور اس کے قریب ہی اس کا نومولود بچہ خاک و خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ اس کے معصوم جسم پر گولیوں اور برچھیوں کے اُن گنت نشانات ہندو سکھ وحشیوں کی درندگی اور بربریت کا منہ چڑا رہے تھے۔ کوچہ رنگریزاں کی مسجد کے کنوئیں میں جن غیرت مند دوشیزاؤں نے چھلانگیں لگا کر اپنی آبرو بچائی تھی ان کی نعشیں کنوئیں میں تیر رہی تھیں۔ اسی محلے کے ایک جلے ہوتے مکان کی بالائی چھت کے درمیان نصب شدہ آہنی سلاخوں کے چھجے میں ایک مسلمان عورت کی جلی ہوئی ٹانگیں لٹک رہی تھیں اور گوشت کی چربی پگھل پگھل کر قطروں کی صورت میں نیچے صحن میں ٹپک رہی تھی۔ ایک نوعمر بچے کی آنکھوں میں دو خنجر گڑے ہوتے تھے۔ تاکہ اس معصوم کی آنکھیں صبح آزادی کے سورج کو طلوع ہوتے نہ دیکھ سکیں۔

اسلامیان امرتسر نے وزیر اعظم پاکستان خان لیاقت علی خان مرحوم کو اس دردناک سانحہ سے مطلع کر دیا تھا چنانچہ خواجہ غلام نبی لیڈر، خواجہ غلام حسن ایڈووکیٹ اور صوفی غلام محمد ترک نے مسجد کے اندر اور بازار میں پڑی ہوئی برہنہ مستورات اور شہیدوں کے جسموں کے ٹکڑے یکجا کر کے ان پر سفید چادریں ڈال دیں اور اپنی پلکوں پر جھلملاتے ہوتے خون کے آنسو لئے لیاقت مرحوم کی متوقع آمد کا انتظار

کر نے لگے ہو

لیاقت علی خاں مجوزہ پروگرام کے مطابق اسی روز امرتسر چھاؤنی اترے اور چھاؤنی کے ریلیف کیمپ میں موجود مسلمان پناہ گزینوں کی زبانی انہوں نے جب اس دردناک سانحہ کی تفصیل سنی تو بے اختیار رو دیئے اور مسجد رنگریزاں کا دلخراش منظر دیکھنے کی تاب نہ رکھتے ہوئے وہیں سے لوٹ گئے۔ انہوں نے وہاں سے واپس جاکر بلوچ رجمنٹ کی زیرِ نگرانی امرتسر کے مسلمانوں کو پاکستان پہنچانے کے لئے فوجی ٹرک اور سپیشل ٹرینیں چلانے کا انتظام کردیا جس کے باعث اسلامیانِ امرتسر کو بحفاظت پاکستان منتقل ہونے میں کافی سہولت مل گئی۔

الغرض وہ صبح آزادی طلوع ہو چکی تھی جس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے برصغیر کے مسلمان قائداعظم کی ولولہ انگیز قیادت میں اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہو گئے تھے کہ اس اثناء میں ۱۷ اگست ۱۹۴۷ء کے روز ریڈکلف ایوارڈ کا اعلان ہو گیا جس سے اسلامیانِ امرتسر کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔

بدلے ہوئے حالات نے اگرچہ مسلمانوں کے قدم اکھاڑ دیئے تھے لیکن اس کے باوجود امرتسر کی بعض مخلوط آبادیوں میں مسلمان نہایت بے جگری سے لڑ رہے تھے۔ کٹڑہ کرم سنگھ، چوک لونگڑھ اور ہاتھی دروازہ کے بیشتر مسلمانوں نے اپنی مستورات کو احتیاطاً محفوظ علاقوں میں پہنچا دیا تھا اور خود حالات کا مردانہ وار مقابلہ کر رہے تھے کہ قلعہ بھنگیاں اور کٹڑہ کرم سنگھ کے مسلمانوں پر دشمنوں نے یلغار کر دی۔ مسلمانوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا جس سے اس علاقہ کے ہربنس سنگھ وغیرہ کی گولیوں سے عثمان ڈار کی گلی کے دو مسلمان شہید ہو گئے اور دستی بم کے ٹکڑے لگنے سے مجید کی ایک ٹانگ ضائع ہو گئی۔

مسلمانوں نے پہلوانوں کے محلے کی طرف سے "آوے" بر جوابی حملہ کر کے کٹڑہ گربہ سنگھ اور تیلی بناں کی ڈھاب کے ہندوؤں سکھوں کے دانت کھٹے کر دئے۔ اس

تصادم میں کنگھی گاڑھے کے بیٹے لیلین نے شہادت کا جام نوش کیا۔ تیلی پناں کی ڈھاب کے بالمقابل اللہ بخش مداری کے مکان کے قریب ایک ہندو فائرنگ کر رہا تھا۔ مسلمانوں نے اس کو گولی کا نشانہ بنایا تو وہ ڈرامائی انداز میں قلابازیاں کھاتا ہوا اس بلڈنگ سے گر کر ہلاک ہو گیا۔ بابو لیلین کی قیادت میں کئے جانے والے اس حملے سے بازار ستو دالا، دیوی والی گلی اور تیلی پناں کی ڈھاب کے ہندو سکھ اس حد تک خوفزدہ ہوئے کہ ان علاقوں کو خالی کر کے بھاگ گئے۔

یہ سلسلہ جاری تھا کہ اس علاقے کے ہندوؤں سکھوں کو بھی بھارتی فوج کی سرپرستی حاصل ہو گئی اور اس محلے کے ڈٹے ہوئے مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کی سرکاری سطح پر سازشیں ہونے لگیں۔ چنانچہ بابو لیلین نے اس علاقے کے مسلمانوں کے مکانوں کی دیواریں پھاڑ کر ہندوؤں سکھوں پر حملہ کرنے اور آس پاس کی آبادی کے مسلمانوں سے در پردہ رابطہ استوار رکھنے کے خیال سے جو سرنگیں کھود دی تھیں اُن کو حفظِ ماتقدم کے طور پر بعض مسلمان بند کرنے لگے تو بابو لیلین نے انہیں روک دیا اور کہا کہ اگر دشمنوں کو پتہ چل گیا کہ ہم اپنے ہاتھوں سے کھودی ہوئی سرنگوں کے دہانے بند کر رہے ہیں تو وہ ہمارے اس اقدام کو ہماری کمزوری پر محمول کریں گے چنانچہ اہلِ محلہ نے ان کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے ایک نئے عزم اور ولولے کے ساتھ اپنے مورچے سنبھال لئے۔

امرتسر کو بھارت کی جغرافیائی حدود میں داخل ہوئے دو تین روز گزر چکے تھے اور اس کے در و دیوار آگ اور خون میں نہائے ہوئے تھے لیکن اس کے باوجود اسلامیانِ امرتسر کے حوصلے اس قدر بلند تھے کہ بسا اوقات گوہرِ مقصود پانے کے لئے وہ ایسے علاقوں میں انتہائی بے خوفی اور جرأت سے چلے جاتے تھے جہاں چاروں طرف موت ناچ رہی ہوتی تھی۔ بابو لیلین اور ان کے سرفروش ساتھیوں کو پتہ چلا کہ کوچہ

حیدر پہلوان اور بھونیاں والے کنوئیں کے قریب مسلمان خراسیوں کی دو دکانوں میں دال کی بوریاں اور رانفلیں مقفل پڑی ہیں۔ چنانچہ اس شیر دل گروپ کے ارکان مذکورہ اشیاء حاصل کرنے کے لئے روانہ ہو گئے۔ اس گروپ کا ایک بہادر نوجوان "دوندا" اپنی کمر پر دال کی بوری اٹھا کر چند قدم چلا تھا کہ دشمنوں کی گولی لگنے سے شہید ہو گیا۔ اس کے بعد بھولا خراسیہ کو بھی گورکھا فوج کے ایک سپاہی نے شہید کر دیا۔

انہی دنوں چوک لوہگڑھ کے کوچہ بدررو کے اسد اللہ مرزا (جو سٹیٹ لائف انشورنس کارپوریشن آف پاکستان کے سینئر انگیزیکٹو آغا ناصر کے حقیقی چچا تھے) حالات کی نزاکت کے پیش نظر پاکستان منتقل ہونے کے لئے اپنے افرادِ خانہ کے ساتھ ایک پرائیویٹ ٹرک میں سوار ہوئے تو ابھی وہ ٹرک ہاتھی دروازہ کے قریب پہنچا تھا کہ گورکھا فوج نے ان پر گولی چلادی جس کے نتیجے میں اسد اللہ مرزا شہید ہو گئے اور ٹرک ڈرائیور کمال ہوشیاری کے ساتھ باقی مسلمانوں کو بچا کر لے گیا۔

بابو لیسین اور اس علاقے کے کفن بردوش مسلمان اپنے خون کے آخری قطرے تک اپنی مدافعت کا عزم کئے ہوئے تھے کہ بلوچ رجمنٹ کے فرض شناس افسر صوبیدار لال خاں، نائیک محمد انور اور ایک میجر صاحب نے اس علاقے میں آکر بابو لیسین کو بتایا کہ ہمیں معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ ہندوستانی فوج کے سپاہی ایک آدھ روز میں آپ کے محلے پر حملہ کرنے والے ہیں۔ لہٰذا آپ لوگ وقت ضائع کئے بغیر ہمارے ٹرکوں میں بیٹھ جائیں۔ چنانچہ بابو لیسین کے بیان کے مطابق انہوں نے سب سے پہلے عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو ٹرکوں پر بٹھایا، اس کے بعد دیگر محلے داروں کے ساتھ ٹرکوں میں سوار ہو کر اس کارواں کے ساتھ پاکستان پہنچ گئے۔ بابو لیسین نے کٹڑہ کرم سنگھ، بھگتانوالہ دروازہ، گلوالی دروازہ اور لوہگڑھ کے مسلمانوں کو گوریلا جنگ کی تربیت دینے کا کام جس جوش وجذبہ سے کیا وہ مثالی حیثیت کا حامل تھا۔

ان کے علاوہ نتھے جراح کے بیٹے ضیاء بٹ (انچارج بم فیکٹری) شمس دین پہلوان اور اسحاق پہلوان عرف ساقہ رُسلی والا نے بھی ان علاقوں کے مسلمانوں کی ناقابل فراموش خدمت کی۔

پہلی سپیشل ٹرین

ہندوستان کا غیر منصفانہ بٹوارہ ہوتے چار روز گزر چکے تھے اور ۱۸ اگست ۱۹۴۷ء کے روز عید الفطر تھی۔ یہ عید کہاں تھی یہ تو غم واندوہ کا دن تھا جس کی سحر درد والم کی رات سے طلوع ہوئی تھی اور ظلم و وحشت کے تاریک اور مہیب سایوں نے اس تہوار سے وابستہ تمام خوشیوں کے چراغ بجھا کر رکھ دیئے تھے اور مسلمانوں کے لئے خوشی کے پیام کا یہ دن تباہی اور بربادی کی داستان کا عنوان بن گیا تھا اور وہ اپنے عزیز و اقارب کی لاشوں کو بے گور و کفن چھوڑ کر حکومتِ پاکستان کے زیر انتظام بلوچ رجمنٹ کی نگرانی میں چلائی جانے والی پہلی ٹرین اور فوجی ٹرکوں کی آمد کے انتظار میں شریف پورہ کے درمیان سے گزرنے والی ریلوے لائن اور جی ٹی روڈ پر بے سر و سامانی کی حالت میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے کسی کا بھائی شہید ہو چکا تھا تو کسی کی بہن غائب تھی اور کوئی اپنے بوڑھے ماں باپ کو کندھوں پر اٹھائے شریف پورہ کے گوشۂ عافیت کی طرف بڑھ رہا تھا کیونکہ ان کے سہانے خوابوں کی بھیانک اور ڈراؤنی تعبیر نے انہیں ترکِ وطن پر مجبور کر دیا تھا۔

۲۰ اگست ۱۹۴۷ء کے روز شریف پورہ سے اسلامیانِ امرتسر کی پہلی سپیشل ٹرین لاہور کے لئے روانہ ہوئی تو ٹرین کے ڈبوں، چھتوں اور فٹ بورڈوں پر سوار ہزاروں مسلمان اپنے آبائی شہر کے در و دیوار کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے اور اپنے پیچھے افرادِ خانہ کے بحفاظت پاکستان پہنچنے کی دعائیں مانگ رہے تھے کیونکہ خالصہ

کالج اور پتلی گھر کے قریب (جہاں ماسٹر تارا سنگھ رہتا تھا) ہزاروں سکھ ریلوے لائن اور جی ٹی روڈ سے گزرنے والے مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیل رہے تھے۔

اسلامیانِ امرتسر کے پاؤں اکھڑنے کی دیر تھی کہ ان پر ڈھائے جانے والے انسانیت سوز مظالم گوڑگاؤں، رہتک، حصار، کرنال، انبالہ، لدھیانہ، جالندھر، ہوشیارپور گورداسپور، فیروزپور، پٹیالہ، نابھ، جنید، کپورتھلہ، دہلی اور یوپی، سی پی کے بے بس مسلمانوں پر بھی دہرائے جانے لگے۔

جالندھر کے ممتاز مسلم لیگی کارکن اور مشہور شاعر طالب جالندھری کے والدین اور عزیزواقارب جب پاکستان روانہ ہونے لگے تو فسادیوں نے ان کے والد صوفی باغ الدین کو مسجد شیخ اللہ داد (تلونڈی) میں شہید کر دیا۔ صوفی صاحب اپنی شہادت سے قبل ضلع جالندھر کی تحصیل نکودر کے ریلیف کیمپ میں پناہ لے چکے تھے۔ لیکن ان کی بھاوج عائشہ بیگم اور سترہ سالہ بھتیجے محمد صادق تلونڈی میں رہ گئے تھے۔ صوفی صاحب اپنے ان عزیزوں کو لینے کے لئے کیمپ سے روانہ ہونے لگے تو لوگوں نے انہیں حالات کی نزاکت کے پیش نظر جانے سے روکا۔ مگر صوفی صاحب نہ مانے۔ چنانچہ وہ اپنے عزیزوں کی تلاش میں جب تلونڈی پہنچے تو اس گاؤں کے فسادیوں نے ان کو ان کی بھاوج اور بھتیجے سمیت مسجد شیخ اللہ داد میں شہید کر دیا۔ تلونڈی مسلم لیگ کے صدر رحمت علی ڈوگر اور امیر حبیب اللہ سعدی نے اس قصبہ کے بقیہ مسلمانوں کو بحفاظت پاکستان پہنچانے اور اس سے قبل ان کا موثر دفاع کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ طالب جالندھری کے بیان کے مطابق ان کے ماموں مُلا علی حسین ہاشمی جنڈیالہ (جالندھر) کے مشہور عالم دین تھے۔ وہ سورج پور کے سیمنٹ کے کارخانے میں ملازم تھے۔ ان کے صاحبزادے شبیر حسین ہاشمی اپنے والد کو لینے کے لئے سورج پور پہنچے تو وہاں کے مسلمانوں کا ایک قافلہ تین بسوں میں سوار ہو کر پاکستان کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں بلوائیوں نے اس کارواں کو روک کر تمام مسافروں کو بسوں سے اتارنے کے بعد شہید

کر دیا۔ اس قافلے کی صرف ایک خاتون کریم بی بی زندہ بچی تھی جس نے بس کی سیٹ کے نیچے چھپ کر اپنی جان بچائی تھی۔ کریم بی بی کے بیان کے مطابق فسادیوں نے جب مُلّا علی حسین ہاشمی اور ان کے صاحبزادے شبیر حسین ہاشمی کو شہید کیا۔ اس وقت ان دونوں کے گلے میں قرآن پاک کے نسخے لٹک رہے تھے اور انہوں نے یا علیؓ اور پاکستان زندہ باد کے نعرے لگاتے ہوتے شہادت کا جام نوش کیا۔ ریاست کپورتھلہ کے مشہور قصبہ کالا سنگھا کے الٰہی بخش تحریک پاکستان کے پُرجوش حامی تھے۔ انہی دنوں ان کا مقامی ہندو سکھ بدمعاشوں سے جھگڑا ہو گیا۔ چنانچہ وہ کچھ دنوں کے لئے کانپور چلے گئے۔ ہندو سکھ غنڈوں نے ان کا وہاں تک تعاقب کیا اور انہیں شہید کر دیا۔ بعد ازاں ان کی غمزدہ اہلیہ پارس بیگم اور دو صاحبزادیوں سعیدہ نور (متعلمہ جماعت چہارم) اور نصیب اختر کو کالا سنگھا کی بعض دردمند ہندو عورتیں ریلیف کیمپ تک پہنچانے جا رہی تھیں کہ اس اثنا میں کالا سنگھا کی ایک سکھ عورت اپنے بیٹوں اور بلوائیوں کے ساتھ موقعہ پر پہنچ گئی۔ بلوائی مسلمانوں کے اس مختصر قافلے کی مستورات کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک کر لے گئے۔ اس قافلے کی ایک خاتون نصیب اختر اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو گئی اور دیگر مستورات کو بیدردی سے شہید کر دیا گیا۔

بن کے رہے گا پاکستان

ضلع ہوشیارپور کے علاقہ شام چوراسی کے مسلمانوں کی پاکستان میں منتقلی کے دوران ہندوؤں سکھوں کے وحشیانہ مظالم کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرتے ہوئے مسٹر محمد اقبال سہیل روزنامہ نوائے وقت مورخہ ۵ دسمبر ۱۹۸۰ء کی اشاعت میں رقمطراز ہیں کہ

ایک روز صبح سویرے ہمیں اطلاع ملی کہ چوک سراجاں، جہاں ہم رہتے تھے پر آج کسی وقت ہندو سکھ حملہ کریں گے چنانچہ چوک سراجاں کے مسلمان نوجوانوں نے شیخ رفیع

کی حویلی کے نیچے جمع ہو کر اس منظم حملے کو ناکام بنانے کی تیاری کی۔ وہ دن بڑا سخت تھا۔ قریباً تین سو سکھوں اور ہندوؤں نے بندوقوں سے مسلح ہو کر چوک سراجاں پر حملہ کر دیا۔ مسلمانوں کی طرف سے اس حملے کا مقابلہ کرنے والے نوجوانوں کی تعداد بمشکل نوّے پچانوے تھی۔ یہ نوجوان "پاکستان زندہ باد" "لے کے رہیں گے پاکستان" کے پرجوش نعرے لگاتے ہوئے ایک ایک کر کے سر دیتے رہے تھے۔ ایک گرتا تو دوسرا میدان میں آجاتا۔ ایک زخمی نوجوان کو چارپائی پر ڈال کر ہمارے مکان کے سامنے سے لے جایا جا رہا تھا کہ ابا جان نے نکل کر اُسے چوما اور کہا کہ تیرے خون کی قسم پاکستان بنا ہی بنا۔ وہ کہنے لگا کہ یہ انگریز اور ہندو سکھ سمجھتے ہیں کہ ہمارے نہتے ہونے کی وجہ سے مسلمان قائداعظمؒ کا ساتھ چھوڑ دیں گے اور تحریکِ پاکستان ناکام ہو جائے گی۔ ہرگز نہیں خاندان کا بچہ بچہ کٹے گا اور پاکستان بن کے رہے گا۔

آپ یقین کیجیے کہ اُس نوجوان کا خون بہہ رہا تھا اور اِدھر مقابلہ جاری تھا اور محلے کے بزرگ اس نوجوان کی چارپائی اٹھاتے لئے جا رہے تھے۔ اُس نے جس عزم سے یہ بات کی اس نے بڑی عمر کے لوگوں میں بھی عزم نو پیدا کیا اور کچھ تو اُسی وقت جا کر اس حملے کو روکنے میں لگ گئے۔ چوک سراجاں کی وہ جنگ تین روز تک جاری رہی اور اسے ہوشیار پور کے مسلمانوں کی طرف سے بغیر کسی اسلحہ کے فیصلہ کُن دفاعی جنگ کہا جا سکتا تھا۔ قوموں کے لئے وہ بڑی مصیبت کا دن ہوتا ہے جب اُس کے نوجوان فیصلہ کن مرحلوں میں ہاتھ پاؤں چھوڑ کر بیٹھ جائیں لیکن دوآبہ کے نوجوانوں نے یہ ثابت کیا کہ تحریکِ پاکستان کو جس قدر خون کی ضرورت ہے اس کے لئے وہ ہر دم تیار ہیں۔ چوک سراجاں جب خالی ہونا شروع ہوا تو ہم لوگ بھی جامع مسجد کے قریب شیخ جان محمد کی حویلی کے آس پاس ایک مکان میں منتقل ہو گئے لیکن وہاں پہنچنے کے لئے ایک لمبے ویرانے "تودڑ" کو عبور کرنا ضروری تھا۔ اس کے انتہا پر ایک مندر تھا جس سے ہندو غنڈے فائرنگ کرتے تھے۔ سرکاری پولیس بھی ان کی مدد کرتی تھی۔ "تودڑ"

کو عبور کرتے ہوتے بے شمار مسلمان شہید ہوتے۔ ایک دفعہ چھتوں سے ہوتے ہوتے مسلمان نوجوان مندر کے قریب پہنچ گئے۔ اور انہوں نے آگ کے شعلے اس طرف پھینکے۔ اُن کو اس طرح مشغول رکھ کر بے شمار خاندان اس "تودڑ" کو عبور کر گئے۔ اس اثنا میں والد صاحب لاہور سے "کانواتے" لینے چلے گئے۔ مسلمانوں نے قافلوں کی صورت میں جلدی جلدی نکلنا شروع کیا اور ہم لوگ قریباً آخری خاندان کی حیثیت میں آباجی کا انتظار کرتے رہے۔
ایک ہفتہ سے اوپر ہو گیا لیکن والد صاحب نہ آتے اتنے میں ہمارے پرانے نوکر محمود نے خبر دی کہ ہندوؤں اور سکھوں نے ہوشیار پور کی تمام مساجد سے قرآن مجید لے کر سڑکوں پر پھینک دیتے ہیں اور بدمست ہو کر اغوا شدہ مسلمان خواتین کی بے حرمتی سڑکوں پر کی جا رہی ہے۔ خدا نے اس موقع پر مرہٹہ فوج کا ایک دستہ بھیج دیا جو جامع مسجد کے قریب متعین ہوا۔ محمود بمبئی وغیرہ رہا تھا چنانچہ ان کی زبان بھی بول لیتا تھا۔ اُس نے اُن سے جا کر قرآن مجید کی بے حرمتی کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا کہ جب تک تمہارے "کانواتے" نہیں آجاتی اس وقت تک ہم تمہاری حفاظت کا یقین دلاتے ہیں لیکن باقی لوگوں کی حفاظت کے ہم ذمہ دار نہیں۔

قرآنِ پاک کی بے حرمتی

والد صاحب گیارہویں روز "کانواتے" لے کر پہنچے۔ معلوم ہوا دریائے بیاس چڑھا ہوا تھا اس لئے آنے میں رکاوٹ ہوتی۔ آبا جان سے قرآن مجید کی بے حرمتی کا ذکر کیا تو انہوں نے بلوچ رجمنٹ کے سربراہ سے بات کی جو کانوائے میں چند فوجی نوجوانوں کو ساتھ لے کر آتے تھے۔ چنانچہ تیسرے روز سارا دن بلوچ رجمنٹ کے نوجوانوں کے ساتھ ہم سب سڑکوں اور گلیوں سے قرآن پاک کے بکھرے ہوتے اوراق اٹھاتے رہے۔ مرہٹہ فوج نے بھی اس مرحلہ پر ہمارا ساتھ دیا۔ کوئی پچاس عدد بوریاں بھری گئیں جنہیں ایک کنوئیں میں ڈال

دیا گیا۔ اسی دوران ہمیں پانچ مسلمان عورتیں مختلف گلی کوچوں میں بڑی دردناک حالت میں پڑی ہوئی ملیں۔ ان بلوچی مجاہدین نے ان کو احترام سے ایک جگہ دفن کیا۔ چوتھے روز ہم ہوشیار پور سے رخصت ہو گئے۔ راستہ میں اکّادُکّا مسلمان عورتیں ملتی گئیں۔ انہیں ساتھ لیتے گئے۔ ہندوؤں اور سکھوں نے اپنی بربریت اور درندگی کا جی بھر کے مظاہرہ کیا تھا۔ ایک عورت کو والد صاحب نے اٹھایا تو اس کی ٹانگیں اور سینہ کٹے ہوئے تھے۔ وہ ایک مشہور خاندان کی نوجوان خاتون تھیں۔ اس نے صرف اتنا کہا کہ اگر اتنا کچھ ہو جانے پر پاکستان بن گیا ہے تو مجھے خوشی ہے کہ میں اُمّت کے کسی کام تو آئی۔ یہ کہہ کر اس عظیم عورت نے آخری ہچکی لی۔ اس دردناک منظر نے بلوچ رجمنٹ کے لوگوں کو بھی رُلا دیا۔

۱۹۴۷ء کی خوں آشامی جنہوں نے دیکھی ہے وہی یہ بتا سکتے ہیں کہ اس قدر بڑے پیمانے پر قتل و غارت اور اجتماعی ہجرت کسی مجبوری، ڈر یا گھبراہٹ کے نتیجے میں نہیں ہوئی تھی بلکہ سادہ سے سادہ ترین مسلمان مردوں اور عورتوں نے پورے شعور سے پاکستان کے حق میں فیصلہ کر کے قربانیوں کی عظیم ترین مثالیں پیش کی تھیں۔ "کانوائے" پر بلوچ رجمنٹ کے نوجوان سٹین گن اور تھری ناٹ تھری بندوقوں سے لیس ہو کر ہوشیار پور سے بڑی تیزی سے نکلے۔ شام ہوتے ہی شام چوراسی پہنچے تو اُس کی نہر کا پانی خونِ مُسلم سے سُرخ ہو چکا تھا۔ معلوم ہوا کہ شام چوراسی کے مسلم نوجوانوں نے چار دن تک مسلسل پندرہ ہزار سکھوں اور ہندو غنڈوں کو روکے رکھا اور اس دوران مسلمان گھرانوں کو قافلوں کی صورت میں روانہ کیا۔ نہر چڑھی ہوئی تھی ہم عبور نہیں کر سکتے تھے۔ ہم نے ہزاروں مسلمان شہیدوں کے سر دیکھے۔ ہم سب نے اُتر کر دعا کی۔ بلوچیوں نے فوجی روایات کا پاس کر کے اس نہر پر کھڑے ہو کر ان گزرتے ہوتے سروں کو "سلوٹ" کیا۔ رجمنٹ کے سربراہ نے کہا کہ ہم صبح کے وقت نہر عبور کر سکیں گے۔ اب یہیں ڈیرہ ڈالتے ہیں۔ البتہ شبخون کا شدید خطرہ ہے۔ رات کو بلوچی فوج کے ایک جوان نے والد صاحب کو بتایا کہ ہوشیار پور میں مرسبتی

کے لوگوں نے انہیں بتایا کہ وہاں پندرہ روز میں ساڑھے تین ہزار مسلمان شہید ہوتے ہیں۔ اغوا ہونے والی مسلمان خواتین کا اندازہ نہ ہو سکا۔ البتہ بعض جگہوں پر مسلمان خواتین نے شدید مزاحمت کی یہاں تک کہ انہوں نے جلتے ہوتے کوئلوں اور اُبلتے ہوتے پانی کا استعمال بھی اپنے دفاع میں کیا۔ ہم سب تمام شب جاگتے رہے کہ رات ڈیڑھ بجے کے قریب چاند کی روشنی میں شمال و جنوب سے یکایک بڑی تعداد میں سکھ "ست سری اکال" کا نعرہ لگاتے ہوتے قریب آ گئے۔ بلوچ رجمنٹ کے جوانوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ وہ آس پاس چھپ گئے اور "کانواتے" کے مردوں کو کچھ رائفلیں تھما دی گئیں۔ کچھ لوگوں کے پاس پہلے سے ہی موجود تھیں۔ جب وہ بالکل قریب آ گئے تو ان پر زبردست فائرنگ شروع کر دی گئی۔ وہ سمجھے کہ "کانواتے" سوتے ہوتے ہیں۔ ابھی اس بوکھلاہٹ سے وہ فارغ نہ ہوتے تھے کہ پیچھے سے "کانواتے" کو لے جانے والے بلوچ رجمنٹ کے جوانوں نے سٹین گنوں سے انہیں بھون کر رکھ دیا۔ اس کے بعد حملہ آور ایسے بھاگے کہ صبح تک کوئی خبر نہ ملی۔ ہم نے تہجد کی نماز کے ساتھ ہی نہر عبور کر لی۔ نہر کا پانی اس قدر سُرخ تھا کہ رات کی تاریکی میں بھی اس کی سُرخی نمایاں تھی۔

عظیم خاتون کی شہادت

نہر عبور کر کے ہم سب شدت تاثر سے کانپ رہے تھے کہ ایک طرف کراہنے کی آواز آئی۔ ایک بزرگ ڈاکٹر نصیر الدین آگے بڑھے۔ انہوں نے پوچھا کون ہے؟ نسوانی آواز تھی وہ فوراً لپکے تو دیکھا کہ ایک خاتون خون میں لت پت پڑی تھی۔ انہوں نے اس خاتون کو پانی پلانے کے بعد اس کی مرہم پٹی کی۔ اُس خاتون نے بتایا کہ شام چوراسی کے مقابلہ میں اُس کے والد، سات بھائی، چچا اور ان کے چار لڑکے بھی شہید ہو گئے ہیں۔ تین بہنیں لڑتے لڑتے نہر میں ڈوب گئیں۔ والدہ کو حملہ آوروں نے قتل کر دیا۔ میں چھپ گئی لیکن انہوں نے مجھے ڈھونڈھ نکالا۔ جب حملہ آور میرے قریب آتے تو میں نے ٹوکے سے دو حملہ آوروں کو

زخمی کر دیا اور پھر انہوں نے جھلا کر میرا یہ حشر کیا ہے۔ خاتون آخری سانسوں پر تھی۔ اس نے آخری سانس سے پہلے یہ کہا کہ پاکستان کو میرا اسلام پہنچا دیجئے۔

ضلع حصار کے قصبہ (بھوانی) کے مسلمان ہندوؤں سکھوں کے مظالم سے تنگ آ کر ترکِ وطن کرنے لگے تو ہندو سکھ غنڈوں نے ان کے مکانوں کے دروازے توڑ کر انہیں شہید کیا۔ کچھ مسلمان عورتیں اور بچے کمروں کے اندر چھپے ہوئے تھے۔ ان کمروں کے مضبوط دروازے جب نہ ٹوٹ سکے تو ان کمروں کی چھتوں میں سوراخ کر کے مٹی کے تیل میں روئی اور بڑے بڑے گولے بھگو کر اندر پھینکے گئے۔ کمروں کے دروازوں کو باہر سے مقفل کر دیا گیا تاکہ کوئی باہر نہ نکل سکے۔ اس طرح آگ اور دھوئیں کے اس طوفان میں متعدد مسلمان دم گھٹ کر مر گئے۔ اسی قصبہ کے پنڈت نیکی رام شرما صوبائی کانگرس کی مجلسِ عاملہ کے سرکردہ رکن اور مقامی کانگرس کمیٹی کے صدر تھے۔ ان کی متعصبانہ ذہنیت ملاحظہ ہو کہ ایک مرتبہ ریلیف کیمپ میں پناہ لینے والے مسلمانوں نے انتظامیہ سے استدعا کی انہیں تھوڑا سا نمک فراہم کر دیا جائے۔ پنڈت نیکی رام اس وقت کیمپ میں موجود تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کی موجودگی میں انتظامیہ کے افسروں سے کہا کہ آپ ان نمک حراموں کے لئے نمک کا انتظام نہ کریں بلکہ ان کو گولیوں سے اڑا دیں۔

قرول باغ دہلی میں جامعہ ملیہ کے عظیم الشان کتب خانے کو آگ لگا دی گئی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین اور پروفیسر محمد مجیب کے احتجاج پر پنڈت نہرو ٹس سے مس نہ ہوئے اور کانگرسی مسلمانوں کے ادارے جامعہ ملیہ کا بیش بہا ذخیرہ راکھ کے ڈھیروں میں تبدیل ہو گیا۔

اسی طرح لاہور کے ممتاز وکیل سعید حسن ملک اپنے والد احمد حسن ملک امرتسری کے ساتھ کلکتہ سے بذریعہ ٹرین امرتسر آ رہے تھے کہ بلوائیوں نے انبالہ ریلوے سٹیشن پر گاڑی روک لی اور مسلمان مسافروں کا قتلِ عام شروع کر دیا۔ ملک سعید حسن خود تو معجزانہ طور پر بچ گئے لیکن فسادیوں نے ان کے والد بزرگوار کو شہید کر دیا۔

مسلمان عورتیں یا تاش کے پتّے

خونِ مسلم کی ارزانی کا یہ عالم تھا کہ بھارت سے پاکستان آنے والا کوئی پیدل قافلہ یا سپیشل ٹرین صحیح سلامت لاہور نہیں پہنچتی تھی۔ علاوہ ازیں لاکھوں مسلمانوں کو شہید کیا جا رہا تھا اور مسلم دوشیزاؤں کے ننگے جلوس نکال کر انہیں کلمہ گوئی اور پاکستان کا مطالبہ کرنے کے "جرم" کی سزائیں دی جا رہی تھیں۔ ہزاروں مسلمان دوشیزائیں ہندو سکھ غنڈوں نے مالِ غنیمت سمجھ کر تاش کے پتوں کی طرح آپس میں بانٹ لیں اور ایک ایک مغویہ کے ساتھ شراب کے نشے میں دُھت ہو کر ان درندوں نے جو وحشیانہ سلوک کیا اس کا تصوّر کرتے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

لاہور کے روزنامہ آفاق نے ۲ ستمبر ۱۹۷۹ء کے شمارے میں "لاہور سے لاہور تک" کے عنوان کے تحت ننکانہ صاحب کے مقام بابا گورونانک کے استھان پر ہندوستان سے آنے والے ایک سکھ یاتری کا انٹرویو بالاقساط شائع کیا ہے جس میں وہ زود پشیمان سکھ اپنے گھناؤنے جرائم کا اقرار کرتے ہوئے بیان کرتا ہے کہ "میں بابا گورونانک کے استھان پر پاکستان آیا ہُوا ہوں اور ابھی پاکستان میں مقیم ہوں۔ میں بھی تقسیم کے وقت کا ایک کردار ہوں۔ میں ضلع امرتسر کے ایک گاؤں سٹھالہ کا رہنے والا ہوں۔ جن دنوں آگ اور خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ میں نوجوان تھا۔ ابھی نئی نئی مسیں بھیگی تھیں۔ جوانی کا جوش تھا۔ ہندوؤں نے ہمیں ان دنوں ایک نعرہ دیا تھا۔ رنگے اور مُودے کے مظالم کا بدلہ لے لو۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ اورنگ زیب نے سکھوں پر اور محمود غزنوی نے ہندوؤں پر بہت ظلم کئے ہیں۔ ان کا بدلہ لینے کا وقت آگیا ہے اور پھر کیا تھا ہم وحشی بن گئے۔ انسانیت کو پاؤں تلے روند ڈالا۔ حیوانیت اور بہیمیت ہمارے دماغوں پر مسلط ہو گئی درندگی کے عالم میں قتل و غارت، مار دھاڑ، بے کسوں کی چیخیں، مظلوموں کی آہیں اور

بچّوں کی فریادیں کوئی چیز ہمیں پگھلا نہ سکی - ہم نے مسلمانوں کو خوب لُوٹا - ان کے نہتے قافلوں پر حملے کر کے جوانوں، بوڑھوں اور بچّوں کو قتل کر کے ہم ان کی نوجوان بیٹیاں اٹھا لیتے اور دادِ عیش دیتے -

گرُو معاف کرے ہم اس وقت وحشی بن گئے تھے - ہم دس دس سکھوں نے بیک وقت ایک ایک مظلوم لڑکی کو بے آبرو کیا - ہمیں اس وقت تخریب اور درندگی کے سوا کچھ نہ سوجھتا تھا - ہم نے معصوم اور مظلوم بچّوں کو کرپانوں کی نوک پر اٹھا اٹھا کر مارا - عورتوں کی چھاتیاں کاٹ کر انہیں کہتے - یہ تمہارا پاکستان ہے - نوجوان عورتوں کو چھانٹ کر الگ کر لیتے اور باقی بچّوں، بوڑھوں اور بوڑھی عورتوں کو گھروں میں بند کر کے آگ لگا دیتے - جب انسانی جسم جلتے تو ہمیں کئی بوتلوں کا نشہ ہوتا - ہم قہقے لگاتے اور اتنا بھنگڑا ڈالتے کہ ہمارے کیس (یعنی بال) کھل کر رہ جاتے اور پھر نوجوان لڑکیوں کے ساتھ چوہے بلّی کا کھیل کھیلتے - بکروں کا جھٹکا کرتے - شراب پیتے اور پھر ان کھلی سرمستیوں کی کہانی کا باب کھُل جاتا -

میں کیا بتاؤں میاں جی ـــــ ہم بالکل اندھے ہو گئے تھے اور انسانیت کا آخری احساس بھی مٹ چکا تھا - "

سکھ درندے اور پاگل دوشیزہ

یہ تھا لاہور کے روزنامہ آفاق کے ۲ر ستمبر ۱۹۷۹ء کے شمارے میں شائع ہونیوالے اعترافِ جرم کا پہلا حصّہ ـــــ اب اسی اخبار کی ۵ر ستمبر ۱۹۷۹ء کی اشاعت میں شائع شدہ دوسرا حصّہ ملاحظہ فرمائیں جس میں سکھ بھیڑیوں نے ایک ایسی مسلمان لڑکی کو اپنی ہوس کا نشانہ بنایا جو اپنے ماں باپ اور بھائیوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے قتل ہوتے دیکھ کر اپنا دماغی توازن کھو بیٹھی تھی -

"آگ اور خون کی ہولیوں کے دور میں نہ جانے ہم بھگوان اور گرو کو کیوں بھول گئے تھے۔ میاں جی۔ اس پاگل لڑکی کو "دنیا داری" سے کسی قسم کی آگاہی نہ تھی مگر ہم وحشی تھے۔ درندے تھے اور درندوں کا کام ہوتا ہے چیر پھاڑ کرنا۔ سو ہم نے باری باری اس معصوم کو لوٹا۔ ایک مسلمان کی بیٹی سمجھ کر ـــ وہ مظلوم بے ہوش ہو گئی اور ہم تینوں کرتار سنگھ کیکر سنگھ اور میں اُسے جھنجوڑتے اور نوچتے رہے۔ حتیٰ کہ وہ بے ہوشی کے عالم میں مر گئی۔ میاں جی۔ ہم اندھے تھے، درندے تھے۔ ہم انسان نہیں حیوان بن چکے تھے۔ شراب کے نشے نے ہمیں ذلیل ترین حیوان بنا دیا تھا۔ ہم نے مُردے کی ارتھی کی بے حرمتی کی اور پھر بھگوان نے ہمیں کسی قابل نہ رکھا۔ ہم انسان تھے۔ مرد تھے۔ مگر میں اور میرے ساتھی نہ مرد رہے اور نہ انسان۔

بھگوان نے ہمیں زندگیوں میں ہی ہماری حرام کاریوں کی سزا سنا دی اور پھر وہ ہُوا جس کے ہم سزاوار تھے۔ ہم تینوں کی داستان علیحدہ علیحدہ ضرور ہے۔ مگر ایک بات سب میں مشترک ہے کہ ہماری وہ سردارنیاں جنہیں ہم باجوں گاجوں سے بیاہ کر لائے تھے۔ یکے بعد دیگرے ہم سے علیحدہ ہو گئیں۔

کیکر سنگھ کی بیوی ایک اچھوت کے ساتھ نکل گئی (یعنی بھاگ گئی) کرتار سنگھ کی بیوی اس کے نوکر کے ساتھ فرار ہو گئی اور میری پتنی میرے ہی گاؤں کے ایک موچی کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے ہوئے پکڑی گئی اور میں نے اس واقعہ سے دل برداشتہ ہو کر سادھو سنتوں جیسے طور طریقے اپنا لئے اور اپنا گاؤں چھوڑ کر در در کی خاک چھاننا میرا مقدر بن گیا۔"

ننکانہ صاحب میں آتے ہوئے اس سکھ یاتری کے اقرارِ جرم سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان خونخوار بھیڑیوں نے اگر پاگل اور مُردہ لڑکیوں تک کی عصمتیں لوٹنے سے گریز نہیں کیا تھا تو ان ہزاروں مسلمان دوشیزاؤں کے ساتھ انہوں نے کیا سلوک کیا ہوگا جو اپنے ماں باپ اور بھائیوں سے بچھڑنے کے بعد ان خونی درندوں کی تحویل میں آئی ہوں گی۔

اب لاہور کے روزنامہ مغربی پاکستان میں ایک انگریز مصنف بریگیڈیر آر، سی، برسٹو کی کتاب "دی میموریز آف برٹش امپائر" THE MEMORIES OF BRITISH EMPIRE سے ماخوذ تلخیص اور ترجمہ پر مبنی د، اقتباس ملاحظہ فرمائیں جو حفیظ رومانی (مترجم) اور ایس کے محمود کے تعاون سے اس اخبار کی ۲۸ر اگست ۱۹۷۹ء کی اشاعت میں شائع ہُوا۔

بریگیڈیر آر، سی، برسٹو (جنہیں فرقہ وارانہ فسادات کی روک تھام کی ذمہ داری سونپی گئی تھی) لکھتے ہیں۔"میں ان دنوں صورتِ حال کا ٹھیک ٹھیک جائزہ لینے کے لئے روزانہ ایک دو گھنٹے کے لئے طیارے سے نیچی پرواز کر کے خود مشاہدہ کیا کرتا تھا طیارہ کی نیچی پرواز کے باعث وسیع وعریض علاقے کی ساری صورتِ حال واضح طریقے پر سامنے آجاتی۔مسلمان گاؤں اور تارکین وطن کے کیمپوں میں محصور ہوتے تھے جب کہ سکھوں کے جتھے شاہراہوں اور گاؤں میں دندناتے پھرتے تھے اور جگہ جگہ ان کے غول کے غول مسلمانوں کا لوٹا ہُوا مال اسباب اِدھر سے اُدھر لے جاتے ہوئے صاف نظر آتے تھے۔ اگرچہ میں نے چار بٹالین اس علاقے کے لئے مخصوص کر دی تھیں لیکن اتنے وسیع و عریض علاقے کے لئے مزید افواج کی ضرورت تھی تاکہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر فوجیں موجود رہیں اور ان کے درمیان زیادہ بُعد نہ رہے۔

خُونِ مسلم کی ارزانی

سکھوں کو پوری چھوٹ ملی ہوئی تھی اور وہ آزادی کے ساتھ بے خوف وخطر گھوم رہے تھے۔ انہوں نے اس سہولت سے بھرپور فائدہ اٹھایا تھا۔ وہ جگہ جگہ اکٹھے ہو کر جتھوں کی صورت میں مسلم اکثریت کے دیہاتوں یا مسلم آبادی کے علاقوں پر اچانک حملہ کرتے۔مسلمان اپنا تھوڑا بہت دفاع کرتے لیکن کوئی جوابی کارروائی کرنے سے گریز کرتے۔

کیونکہ ایسی صورت میں سکھ حملہ آور محافظ دستوں کے درمیان مزاحم ہو جاتے جس کی وجہ سے ہلاکت اور بھی یقینی ہو جاتی۔ یہی وجہ تھی کہ سکھوں کے حوصلے بڑھتے جا رہے تھے اور وہ حملے پر حملے کرتے جا رہے تھے۔ انہیں یقین ہوتا تھا کہ مسلمانوں کے مقابلے میں ان کے نقصانات نہ ہونے کے برابر ہونگے۔ بعض مواقع ایسے بھی آتے کہ مسلمانوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا، لیکن زیادہ تر ہتھیار ڈال دیتے۔ ہتھیار ڈالنے کے بعد مسلمانوں کے مقدر کا فیصلہ جتھے داروں کی مرضی پر منحصر ہوتا تھا۔ بعض اوقات تو صرف مال و اسباب اور جوان عورتوں کو چھین لیا جاتا اور اُن خاص خاص لوگوں کو جن سے پہلے کوئی عناد ہوتا قتل کر کے باقیماندہ لوگوں کو چھوڑ دیا جاتا۔ اس کے برعکس جہاں کہیں مقابلہ کیا گیا وہاں عموماً قابو پانے کے بعد وہ کسی کو زندہ نہیں چھوڑتے تھے۔ ان حملوں میں ایک طرح کی یکسانیت ہوتی تھی۔ مسلمانوں کو بسا اوقات حملے کی پہلے سے اطلاع مل جاتی تھی اور وہ سب اپنی اپنی چھتوں پر جمع ہو جاتے تھے اور انہیں جو بھی ہتھیار ملتا وہ اسے اپنے دفاع کے لئے رکھ لیتے۔ لیکن حملہ آوروں کے چند فائروں کے بعد ہی وہ دیواروں اور درختوں کا سہارا لے کر چھپنے کی کوشش کرتے۔ پھر یکبارگی جب حملہ آوروں کے غول کے غول انہیں چاروں طرف سے گھیر لیتے تو وہ بالآخر مجبور ہو کر اپنے اپنے گھروں میں بند ہو کر بیٹھ جاتے۔ اس کے بعد بلوائی ٹکڑیوں میں بٹ کر یکے بعد دیگرے ایک ایک گھر کا صفایا کرتے چلے جاتے۔

میں نے خود فضائی جائزے میں مشاہدہ کیا کہ حملے سے پہلے ہزاروں سکھوں کا ایک ہجوم مسلمانوں کے ایک گاؤں کے قریب ایک گوردوارے کے باہر جمع ہو گیا۔ مقصد یہ تھا کہ قتل و غارت کا خونی کھیل کھیلنے سے پہلے اپنے سیاسی یا روحانی پیشواؤں کی حمایت اور آشیرباد بھی حاصل کر لی جائے۔ میرے لئے اس سے زیادہ مکروہ اور تکلیف دہ بات اور کیا ہو سکتی تھی کہ کچھ ہی دیر بعد چند باریش بزرگ باہر آئے اور انہوں نے بلوائیوں کو قتل و غارت پر اکسانا شروع کر دیا۔ یقیناً ان بزرگوں میں کوئی غیر ذمہ دار نوجوان نہیں تھا

جس سے اس قسم کی توقع بھی کی جا سکتی تھی۔ اس واقعہ سے یہ بات قطعی واضح ہو جاتی ہے کہ ان فسادات میں غنڈوں کا کوئی ہاتھ نہ تھا بلکہ سکھوں کے گردواران کے مذہبی پیشواؤں کے اشارے پر یہ غلیظ کھیل کھیلا جا رہا تھا۔ انہی دنوں فضائی جائزہ کے دوران مجھے ایک مرتبہ شاید آخری بار اس خونی ڈرامے کو بہت قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔

ہمارا طیارہ دریائے ستلج کے شمال میں راحل نامی بستی پر پرواز کر رہا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ ہزاروں سکھوں کا ایک غول بستی کے چاروں طرف مکھیوں کی طرح بھنبھنا رہا ہے اور لوگ جلدی جلدی لوٹا ہوا مال گاڑیوں میں لاد رہے ہیں۔ جو لوگ بچ گئے تھے ان کی تعداد سنو کے لگ بھگ معلوم ہوتی تھی وہ بھی قیدی بنا لئے گئے تھے اور انہیں لمبی لمبی قطاروں میں کھڑا کر دیا گیا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اب ان لوگوں سے پریڈ کرائی جائے گی لیکن ذرا قریب جا کر دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہ سب نوجوان عورتوں اور لڑکیوں کی قطاریں تھیں اور چند سفید داڑھیوں والے جتھیداران کا معائنہ کر رہے تھے ایسا دکھائی دیتا تھا جیسے کوئی جشن منایا جا رہا ہے اور لوگ اپنی اپنی پسند کی چیزیں چھانٹ رہے ہیں۔ گلی کوچوں میں چاروں طرف لاشیں ہی لاشیں بکھری پڑی تھیں اور اندازہ ہوتا تھا کہ ان لوگوں کو بھاگتے ہوئے گولیوں کا نشانہ بنایا گیا ہے۔

بستی کے چاروں طرف کھلا ہوا میدان تھا۔ میں نے دُور دُور تک نظر دوڑائی۔ لیکن کوئی شخص بھاگتا یا چھپا ہوا دکھائی نہیں دیا۔ پوری بستی میں کوئی زندہ شخص، بچہ یا بوڑھا نظر نہ آتا تھا۔ اس سے ہمیں بخوبی اندازہ ہو گیا کہ بستی کے اور لوگ بھی گھروں کے اندر ہی ڈھیر کر دیئے گئے ہوں گے اور ان بدنصیب عورتوں نے انہیں اپنے سامنے قتل ہوتے ہوئے دیکھا ہو گا۔ میرا پائیلٹ توپ خانہ کا ایک نوجوان سکھ افسر تھا اور وہ اپنے ہی ہم قوم لوگوں کے اس شرمناک فعل پر نادم دکھائی دیتا تھا۔ اس نے نہایت افسردگی کے ساتھ اس واقعہ پر ندامت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ان لوگوں نے میرا سر شرم سے جھکا دیا ہے۔ میں نے

اس سے ذرا نیچی پرواز کرنے کے لئے کہا تو اس نے میری رائے سے اتفاق کیا اور نیچی پرواز شروع کر دی۔ اس وقت میرے پاس صرف ایک ریوالور تھا۔ چنانچہ میں نے فائرنگ شروع کر دی۔ اس کے پاس بھی ایک سادہ سا ریوالور تھا جس سے معمولی فائرنگ کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے بھی اس واقعہ پر اظہار ناگواری کے طور پر گولیاں چلانی شروع کر دیں۔ سکھوں نے جب اوپر سے گولیاں چلتی ہوئی دیکھیں تو وہ فوراً زمین پر لیٹ گئے تاکہ اپنا بچاؤ کر سکیں۔ جونہی حملہ ہوا۔ انہوں نے نیچے سے ایک دو فائر کر ڈالے۔ ہم فوراً ہیڈ کوارٹر واپس پہنچے اور وہاں سے قریبی چوکی کو اطلاع دی تاکہ فوراً امدادی فوجیں گاؤں روانہ کی جا سکیں لیکن سکھ پہلے ہی چوکس ہو چکے تھے اور وہ وقت ضائع کئے بغیر قریبی دیہاتوں کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ فوجوں کو وہاں پہنچتے پہنچتے خاصا وقت لگ گیا۔ لہٰذا وہاں سوائے لاشوں کے اور کچھ نہ مل سکا۔ چنانچہ قرب و جوار کے دیہات کی تلاشی کے لئے فوجی دستے روانہ کئے گئے لیکن گاؤں کے لوگوں نے اپنی مستورات کی بے حرمتی کا جواز بنا کر فوجیوں کو اپنے مکانوں میں (جہاں بلوائی روپوش ہو گئے تھے) داخل نہ ہونے دیا۔ جس کی وجہ یہ بھی تھی کہ فوج میں شامل ہندوؤں سکھوں نے (جو ایک اچھی خاصی تعداد میں تھے) گاؤں والوں کے اس مؤقف کی تائید میں دیگر فوجیوں کو بھی پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ ادھر پولیس کی خاموشی بھی پشت پناہی کے مترادف تھی۔ لہٰذا اس مہم سے کوئی فائدہ نہ ہو سکا۔

بریگیڈیر برسٹو ہزاروں مسلمان لڑکیوں کے اغوا کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اغوا شدہ خواتین کا مستقبل بھی بھیانک نظر آتا تھا۔ کیونکہ ابھی تک خواتین کی ایک بہت معمولی سی تعداد بازیاب ہو سکی تھی جنہیں ان کے لواحقین کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ عورتوں کی جو لاشیں دستیاب ہو رہی تھیں۔ ان سے معلوم ہوتا تھا کہ سکھوں نے انہیں اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کے بعد ایک وحشیانہ طریقے سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ بریگیڈیر صاحب کلفرڈ ولیم

کے چشم دید واقعات کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کلفرڈ ولیم جی، ٹی روڈ (گرانڈ ٹرنک روڈ) سے لدھیانے کے درمیان اپنی جیپ میں سفر کر رہے تھے تو انھوں نے سڑک کے کنارے تقریباً چالیس عورتوں کی لاشیں دیکھیں جو سکھوں کی بربریت کا ہولناک منظر پیش کر رہی تھیں۔ ان عورتوں کو بُری طرح چیر پھاڑ کر پھینک دیا گیا تھا۔ ان کی چھاتیاں کاٹ دی گئی تھیں۔ حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کر کے بچے باہر نکال پھینکے گئے تھے۔ ان کی شرمگاہوں کو چاک کر دیا گیا تھا۔ ان حالات میں فوج کا کام صرف انتظامیہ کی مدد کرنا تھا لیکن انتظامیہ خود بحران کا شکار ہو کر غیر مؤثر ہو کر رہ گئی تھی اور قانون نافذ کرنے والے ادارے مفلوج نظر آتے تھے۔ فوجی جوانوں پر سے بھی اعتماد اُٹھ گیا تھا۔ سارا نظام درہم برہم دکھائی دیتا تھا جو لوگ فوجی نظم و ضبط کے خلاف حکم عدولی کے مرتکب ہو رہے تھے ان کے خلاف کوئی تادیبی کارروائی نہیں کی جاتی تھی جس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ فوجی جوان دوسرے مذہب کے افسروں کو کسی قیمت پر برداشت نہیں کرتے تھے اور ذرا ذرا سی بات پر مرنے مارنے پر آمادہ ہو جاتے تھے یا آپس میں لڑ پڑتے تھے۔ فرقہ وارانہ کشیدگی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ ان حالات میں نہتے مسلمانوں کی جانیں بچانے کے لئے امدادی کیمپ ایسے مقامات پر قائم کرنے کی کوشش کی جاتی تھی کہ جہاں پر کوئی کنواں موجود ہو۔ کیونکہ شدید گرمی میں پانی کے بغیر گزارہ ممکن نہ تھا۔ علاوہ ازیں ان کی خوراک وغیرہ کا مسئلہ بھی نہایت اہم تھا۔ چنانچہ ابتدا میں بڑی بڑی مسلم بستیوں کے آس پاس ایسی جگہوں کا انتخاب کیا گیا جہاں پانی اور خوراک کی سہولتیں موجود تھیں۔ لیکن سکھ (جو مسلمانوں کو سرحد پار دھکیلنے کا تہیہ کر چکے تھے) اس نظام سے مطمئن نہ تھے اور حکومت بھی ان کی حمایت پر مجبور نظر آتی تھی۔ جو لوگ فوجیوں کی حفاظت میں گاؤں سے نکال کر محفوظ جگہوں پر پہنچا دیئے گئے تھے۔ وہ تو اپنے ساتھ خوراک اور دوسرا ضروری سامان بیل گاڑیوں میں ڈھو کر لے آتے تھے۔ اس کے برعکس جو لوگ فوجیوں کی آمد سے قبل جان بچا کر بھاگ نکلے تھے اپنے ساتھ سوائے تن کے کپڑوں کے

اور کچھ نہ لا سکے تھے۔ جس کی وجہ سے ان کو بھوک اور پیاس کی تکلیفیں برداشت کرنا پڑیں۔ یہاں تک کہ ہزاروں افراد بھوک پیاس کی شدت سے ہلاک ہو گئے تھے۔ جیسے جیسے دیہاتوں سے مسلمانوں کا انخلاء ہوتا گیا امدادی کیمپوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ یہ تعداد ۵۰ ہزار تک پہنچ گئی۔ قصبوں میں بھی یہی صورتِ حال تھی۔ تاہم ایک جگہ اکٹھا ہونے کی صورت میں جانوں کا تحفظ تو یقینی ہو گیا تھا لیکن خوراک کا مسئلہ سنگین نوعیت اختیار کرتا جا رہا تھا کیونکہ مسلمان خوراک کا ذخیرہ ساتھ نہ لائے تھے اور جو بیچارے لائے تھے وہ بھی لوٹ لیا گیا تھا اور شہری انتظامیہ کی طرف سے کبھی کبھار سوائے آٹے کی چند بوریوں کے کچھ نہ مہیا کیا جاتا۔ ان امدادی کیمپوں میں پناہ گزینوں کے ساتھ ان کے مویشی بھی بھوک سے دو چار تھے۔ انسانوں کے ساتھ گائے بیل بھی دم توڑ رہے تھے۔ اس عالم میں بھی ان میں اتنی جرأت نہ تھی کہ اپنے جانوروں کو ذبح کر کے اپنی بھوک مٹا سکیں۔ کیونکہ کیمپ کے ہندو محافظ مسلمانوں کی اس حرکت کو کسی قیمت پر برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے اس وقت امدادی کیمپ کے الفاظ اپنی معنویت کے اعتبار سے قطعی گمراہ کن معلوم ہوتے تھے۔ علاوہ ازیں قدرتی آفات سے بچاؤ کی کوئی تدابیر اور صورت نظر نہ آتی تھی اور یہ کیمپ کھلے میدان سے زیادہ حیثیت نہ رکھتے تھے جہاں ذرا سی بارش میں سارا میدان ایک دلدل کا سماں پیش کرتا تھا جہاں ان کو جانوروں کی طرح پینے کا پانی ضرور مل جاتا تھا لیکن یہ لوگ بارش میں بھیگتے رہتے اور دلدل کے اُس پار اُن کی نظریں اپنے مکانوں اور جھونپڑوں پر پڑتیں تو وہ حسرت و یاس میں ڈوب جایا کرتے تھے۔

مسلمان فاقوں سے نڈھال ہو چکے تھے لیکن صبر و تحمل کا زبردست مظاہرہ دیکھنے میں آیا۔ صفائی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ لوگ رفع حاجت کے لئے کھلے کھیتوں اور میدانوں کے عادی تھے۔ لہٰذا وہ ٹولیوں کی شکل میں کیمپوں کے اطراف میں رفع حاجت کرنے جاتے۔ ... ان کھیتوں میں جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ ادھر فضلے کے تھاپ کے تھاپ لگے ہوئے

تھے۔کوئی اس غلاظت کی صفائی کے لئے تیار نہ تھا۔جس کے باعث فضا متعفن ہو گئی تھی اور مکھیوں کی بہتات کے ساتھ پیچش اور ہیضہ کی بیماریاں پھوٹ پڑیں۔ بہت سارے پناہ گزین (جن میں عورتیں اور بچے شامل تھے) شدید زخمی حالت میں کیمپوں تک پہنچے تھے جنہیں جالندھر کے ملٹری ہسپتال پہنچا دیا گیا تھا۔جہاں ڈاکٹر زیادہ سے زیادہ مریضوں اور زخمیوں کی دیکھ بھال میں مصروف تھے۔اس کے باوجود بے شمار زخمی ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہلاک ہو گئے تھے۔

سول ہسپتال جالندھر صرف زخمی ہندوؤں اور سکھ شرنارتھیوں کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔چنانچہ ملٹری کے چند مسلمان ڈاکٹروں نے فوجی بیرکوں میں عارضی طور پر مسلمان زخمیوں کے لئے ایک ہسپتال قائم کیا اور اپنے طور پر ان کے علاج معالجے میں کوئی کسر اٹھا رکھی لیکن دواؤں کی قلت، جگہ کی تنگی اور تربیت یافتہ نرسوں کی غیر موجودگی کے باعث انہیں بڑی مشکلات کا سامنا تھا۔

O

گونجی بہت ہے اس میں فریادِ بیکسوں کی
ٹکڑے اڑیں گے اک دن اس گنبدِ کہن کے

چھٹا باب

ایک سو برہنہ عورتیں

بریگیڈیئر برسٹو مسلمان مہاجروں کی سپیشل ٹرینوں پر ہندوؤں سکھوں کے منظم حملوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "گیارہ ستمبر ۱۹۴۷ء کو جنگ سنگھ اور اس کے ڈوگرہ گروپ کو ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ سہ پہر کے وقت مسلم پناہ گزینوں سے بھری ہوئی ٹرین روانہ ہوئی۔ اس ٹرین کے ہمراہ اسٹیٹ فورس اسکارٹ تھا۔ ٹینک بھی ساتھ ساتھ حرکت میں آ گئے۔ جب یہ ٹرین ریاست کپورتھلہ کی سرحد کے قریب پہنچی تو جنگ سنگھ نے دیکھا کہ ٹرین کا اگلا ڈبہ پٹڑی سے اتر گیا ہے۔ وہ پیچھے مڑا تو کیا دیکھتا ہے کہ دو ہزار کے قریب سکھوں نے ٹرین پر حملہ کر دیا ہے۔ جنگ سنگھ نے حملہ آوروں پر فوراً یورش کی اور مار بھگایا لیکن اس دوران سکھ بے شمار مسلمانوں کو قتل کر چکے تھے۔ لاتعداد زخمی ہوئے اور حملہ آور دو سو کے قریب عورتوں اور لڑکیوں کو بھی اپنے ساتھ لے گئے چنانچہ اس واقعہ کے فوراً بعد جنگ سنگھ کی جگہ لیفٹیننٹ وجاہت حسین نے لے لی اور ان کے ہمراہ سی، آئی، ایچ کے جو کچھ جوان موجود تھے اس بدقسمت ٹرین کے مسافروں کی حفاظت اپنے تیس کے لگ بھگ ساتھیوں سمیت کر رہے تھے کہ اندھیرا بڑھنے لگا۔ چاروں طرف سے زخمیوں کی کراہیں اور چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔ وہ اپنے عزیزوں کو تلاش کر رہے تھے۔ تمام رات سخت بے چینی

رہی اور خوف و ہراس چھایا رہا۔ سکھ جا چکے تھے۔ جب صبح ہوئی تو ایک عورت کی جوتی کچھ فاصلہ پر ملی۔ اس سے آگے ایک میل کے فاصلے پر جھاڑیوں میں تقریباً ایک سو برہنہ عورتیں ملیں۔ ان میں سے ابھی کچھ زندہ تھیں اور بیشتر عورتوں کی چھاتیاں کاٹ کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ بچے قتل کر دیئے گئے تھے۔ بیس کے قریب بچے رینگ رہے تھے اور اپنی ماؤں کو تلاش کر رہے تھے۔ عورتوں کی برہنہ لاشیں دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ رات میں ان عورتوں کی بار بار عصمت دری کی گئی تھی اور اس کے بعد انہیں قتل کر دیا گیا تھا۔ کئی ہزار اکالی گھوڑوں پر سوار تھے۔ انہوں نے دو مرتبہ حملہ کیا۔ چنانچہ ان بچے کھچے پناہ گزینوں کی زندگیاں سخت خطرے میں تھیں۔ لیفٹیننٹ وجاہت حسین اور سی، آئی ایچ کی مختصر پارٹی نے ٹینکوں کی مدد سے حملہ آوروں کا مقابلہ کیا اور پناہ گزینوں کو قتلِ عام سے بچا لیا۔

بریگیڈیئر برسٹو ٹرینوں پر ہندوؤں سکھوں کے حملوں کی روداد کے بعد پاکستان کا رُخ کرنے والے مفلوک الحال مسلمانوں کے پیدل قافلوں اور کیمپوں کی حالت کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ستمبر ۱۹۴۷ء کے آخر میں منتقلی کا کام زیادہ تیز رفتاری سے جاری تھا۔ ہزاروں افراد ٹرینوں اور لاریوں میں سوار اور بے شمار پیدل قافلوں کی شکل میں دریائے بیاس کے پُل پر رواں دواں تھے اور دوسرے کیمپوں میں پناہ گزین بھاری تعداد میں جمع ہو رہے تھے کہ اواخر ستمبر ۱۹۴۷ء میں ایک بہت بڑی تباہی نے ہمیں پریشان کر دیا۔ یہ تباہی قدرتی تھی۔ ان دنوں میں عام طور پر برسات کا زور تھم جاتا ہے لیکن ایسی قیامت خیز بارشیں ہوئیں کہ دریائے بیاس میں سیلاب آ گیا۔ بیاس نصف میل کی چوڑائی سے دس میل چوڑا ہو گیا۔ بیین ایک چھوٹا سا نالا تھا، دریا بن گیا اور ریلوے کا پُل ٹوٹ گیا جب میں بیین پر پہنچا تو جہاں کیمپ تھا وہ مکمل طور پر غائب ہو گیا تھا۔ درخت جڑ سے اکھڑ گئے تھے۔ لوگ مدد کے لئے چیخ رہے تھے۔ اندازاً دو ہزار افراد [illegible] وغیرہ وغیرہ۔
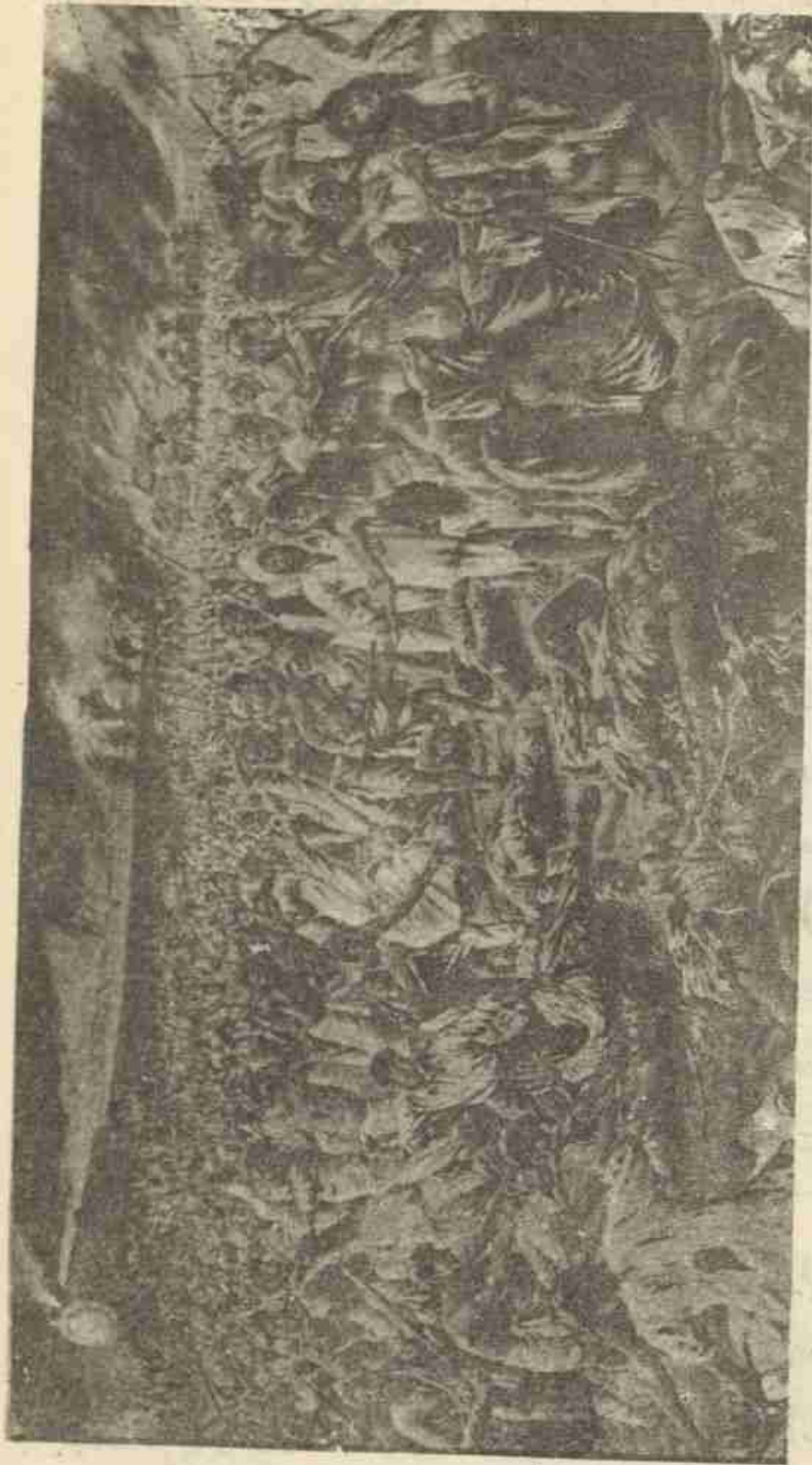
مہاجرین کی ٹرین پہ فسادیوں کا وحشیانہ حملہ - خون ہی خون، آگ ہی آگ ـــــ منظر کشی ایم، تراب آرٹسٹ ۔ بشکریہ: سردار علی احمد خاں

اچانک پہاڑی نالے تیز پانی میں بہہ گئے۔ جب سیلاب کا پانی اتر گیا تو کیمپ کی تباہی کا صحیح نقشہ سامنے تھا۔ پانچ سو افراد کے مردہ جسم اور تین سو گائے بھینسیں اس کیمپ میں مردہ حالت میں ملیں۔ مسلمانوں نے اپنے مردوں کو دفن کر دیا۔ یہ بڑا رقت آمیز منظر تھا۔ ہم نے بچے کھچے مسلمانوں کی جانیں بچانے کے لئے ہیلی کاپٹر میں بیٹھ کر محفوظ جگہ کے انتخاب کی کوشش کی۔ تمام ہموار میدان چاروں طرف پانی میں گھرے ہوئے تھے۔ بے شمار مکانات پانی میں ڈوب چکے تھے۔ بعض اونچے مکانوں کی چھتوں پر لوگوں نے پناہ لے رکھی تھی۔

یہ قسمت کی عجیب ستم ظریفی تھی کہ جو لوگ قتلِ عام سے بچ چکے تھے ان میں سے اکثر سیلاب کی نذر ہو گئے تھے۔ اب یہ امید کی جا رہی تھی کہ سکھ اس صورتِ حال میں حملہ نہیں کریں گے لیکن افسوس کہ سکھ اپنی بربریت سے باز نہیں آئے اور ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ اب پناہ گزین منتشر تھے۔ سیلاب کی تباہ کاریوں نے ان کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ۲۷ ستمبر ۱۹۴۷ء کی صبح کو سکھوں نے بیاس کے ریلوے پل کے قریب حملہ کر کے تیس پناہ گزینوں کو قتل کر دیا اور دس لڑکیوں کو اغوا کر لیا۔ یہ اس وقت ہوا جب یہ لوگ کیچڑ اور پانی میں ڈوبی ہوئی گاڑیاں اور خورد و نوش کا سامان تلاش کر رہے تھے۔ کوئی اس بزدلی اور غیر انسانی فعل کا تصور نہیں کر سکتا تھا جو سکھ کر رہے تھے۔ جب سیلاب کا پانی اتر گیا اور دریائے بیاس آمد و رفت کے قابل ہوا تو پتہ چلا کہ پانچ ہزار جانیں اور سینکڑوں بیل گاڑیاں ضائع ہو چکی ہیں۔ بچے کھچے معدودے چند لوگ انتہائی کسمپرسی کے عالم میں تھے اور موت سے پنجہ لڑا رہے تھے۔ ان سب کی بس ایک ہی خواہش تھی کہ وہ کسی طرح اپنی مملکت (پاکستان) پہنچ جائیں۔"

بریگیڈیئر برسٹو کے مندرجہ بالا دردناک مشاہدات کے مطالعہ کے بعد غیر ملکی مصنف لاری کولنز اور ڈومینک لاپیری کی کتاب "فریڈم ایٹ مڈ نائٹ" کے ترجمے اور تلخیص کی جھلک ملاحظہ فرمائیں جسے ماہنامہ اردو ڈائجسٹ کے اگست ۱۹۷۹ء کے آزادی نمبر میں

مسٹر ذوالفقار کاظم نے سپرد قلم کیا ہے۔ فاضل مترجم مذکورہ بالا کتاب کا اقتباس پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ہندوستان کا یوم آزادی پنجاب کے لئے تباہی کا دن تھا۔ اس روز طلوع ہونے والا آزادی کا سورج بنفشی اور سنہری نہیں بلکہ تشدد کے اَن گنت واقعات اور خونریزی کی بنا پر قرمزی رنگ اختیار کر چکا تھا۔ امرتسر میں نئے حکام آزادی کے بعد اپنے اختیارات سنبھال چکے تھے۔ مگر شہر میں امن و امان کی صورت حال بدستور مخدوش تھی۔ شہر کے اندر سکھ اپنے مسلمان ہمسایوں کا بے دریغ خون بہا رہے تھے۔ مردوں کو بے رحمی سے قتل کیا جا رہا تھا۔ عورتوں کو اغوا کیا جاتا۔ ان کی آبرو ریزی ہوتی۔ خوف و تشدد سے کانپتی ان برہنہ بے بس عورتوں کو شہر بھر میں پھرا کر گولڈن ٹمپل (دربار صاحب) تک لایا جاتا اور پھر بہت سی عورتوں کی گردنیں اُڑا دی جاتیں۔

مسلمانوں کی نسل کُشی

پٹیالہ کی سکھ ریاست پر دوندر سنگھ اپنے تمام تر جاہ و جلال کے ساتھ حکمرانی کرتا تھا۔ ریاستی سکھوں کے جتھے ان بے گناہ نہتے مسلمانوں پر حملے کر رہے تھے جو سرحد پار کر کے پاکستان جا رہے تھے۔ مہاراجہ کے بھائی بلندرا سنگھ نے سکھوں کے ایک جتھے کو روکا جو بڑی بڑی کرپانوں سے مسلح تھا۔ اُس نے ان سے گاؤں واپس چلنے اور فصلوں کی کٹائی کی تلقین کی تو اس جتھے کے سردار نے جواب دیا کہ

"ایک اور فصل بھی تو ہے جس کا کاٹنا بہت ضروری ہے" اور یہ کہہ کر وہ مسلمانوں کے تعاقب میں کرپانیں لہراتے ہوئے روانہ ہو گئے۔

مسلمانوں کا قتل عام، لوٹ مار اور آتش زدگی کی وارداتیں نہ صرف روز کا معمول بن گئی تھیں بلکہ ہر لمحے تشدد کا کوئی نہ کوئی واقعہ رونما ہو جاتا۔ ہندو سکھ اپنی اکثریت ...

طاقت کے بل بوتے پر مسلمان اقلیت پر دھاوا بولتے اور پل بھر میں ہنستی بولتی زندگیاں موت کی ویرانیوں میں گم ہو جاتیں۔ ملک کے دارالحکومت نئی دہلی کی اورنگ زیب روڈ، پرانی دہلی کے چاندنی چوک، امرتسر کے محلوں، ریلوے لائنوں اور سٹیشنوں غرض ہر جگہ افراتفری کا عالم تھا۔ نفرت کی ایک ایسی آگ بھڑک اٹھی تھی جس نے ہزاروں انسانی جانوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ احترام انسانیت کا جذبہ مفقود ہو کر رہ گیا تھا۔ اخلاقی اقدار کو پس پشت ڈال دیا گیا تھا۔ انسانیت کا رشتہ ٹوٹ چکا تھا۔ ہندو اور سکھ وحشی درندوں کا روپ دھار چکے تھے۔ ایسے درندے جو صرف اور صرف مسلمانوں کے خون کے پیاسے تھے۔ یہ سرحدی جنگ نہیں تھی۔ خانہ جنگی بھی نہیں تھی۔ نہ ہی اسے گوریلا جنگ کا نام دیا جاسکتا تھا۔ بس ایک کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ وحشت اور بربریت کی ایک لہر تھی۔ بموں کے دھماکوں سے تو عمارتیں تباہ ہوتی ہیں مگر یہاں پنجاب کی معاشرت تباہ ہو رہی تھی تہذیب و تمدن کی بلند و بالا دیواریں آپس میں ٹکرا کر زمین بوس ہو رہی تھیں۔ مسلمان ہر جگہ خوف اور دہشت کی گرفت میں تھے۔ ان فسادات نے کتنی ہی دردناک کہانیوں کو جنم دیا۔ صفحہ ہستی پر کتنی ہی روح فرسا داستانیں رقم ہوئیں۔ وحشت اور بربریت کے ایسے انمٹ نقوش ثبت ہوئے جو ہندوؤں سکھوں کی مسلمان دشمنی کا منہ بولتا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔

احمد زار اللہ فیروزپور کے ایک قریبی دیہات میں مزارع تھا۔ فسادات کے دوران میں ایک رات سکھ بلوائیوں نے اس کے گھر پر حملہ کیا "ہم جانتے تھے کہ ہمیں بلیوں کی طرح جان سے مار دیا جائے گا۔" اس نے بیتے دنوں کی کہانی دہراتے ہوئے کہا "ہم میں سے کوئی چارپائیوں کے نیچے چھپ گیا۔ قریب ہی گائے کے چارے کا ڈھیر پڑا تھا۔ کسی نے اس میں پناہ لی۔ سکھوں نے کلہاڑیوں سے دروازہ توڑ ڈالا۔ وہ اندھا دھند گولیاں برسا رہے تھے۔ اچانک ایک گولی میرے بائیں بازو میں لگی۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو دیکھا کہ میری بیوی کو چار گولیاں لگی تھیں۔ اس کی پنڈلیوں اور پشت سے خون بہہ رہا تھا

پھر دیکھتے ہی دیکھتے میرے تین سالہ بچے کے پیٹ میں گولی لگی - وہ بیچارہ چیخ بھی نہ سکا۔ گرا اور وہ مر چکا تھا۔ حملہ آور جا چکے تھے - میں نے بیوی اور دوسرے بچے کو اپنی گرفت میں لیا۔ مُردہ بچے کو وہیں چھوڑا اور گرتا پڑتا گھر سے باہر نکل پڑا اور میں نے دیکھا کہ دوسرے گھروں سے نکلنے والے مسلمانوں کو سکھ گولیوں کا نشانہ بنا رہے تھے - کچھ اپنے کندھوں پر نوجوان لڑکیاں اٹھائے بھاگے جا رہے تھے - ہر طرف چیخ پکار تھی - دو تین سکھ نوجوان مجھ پر پل پڑے - میری مُردہ بیوی کو مجھ سے چھین لیا گیا - میرے دوسرے بچے کا جسم بھی تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا اور مجھے مرنے کے لئے وہیں چھوڑ گئے - میری آنکھیں خوف اور دہشت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں - وہ ایسے خشک تھیں جیسے دریائے سندھ مون سون سے قبل ہوتا ہے - پھر میں بے ہوش ہو کر گر پڑا ۔"

جس بیدردی سے سکھ مسلمانوں کا قتلِ عام کر رہے تھے - یوں لگتا تھا کہ یہ قوم وحشی درندوں کا رُوپ دھار چکی ہے - پنجاب باؤنڈری فورس کے ایک برطانوی افسر کو ایک ایسے گاؤں سے جسے سکھوں نے نذرِ آتش کر دیا تھا - چار بچوں کی لاشیں ملیں جو بُری طرح جھلس چکی تھیں -

چودہ سالہ محمد یعقوب امرتسر کے قریب رہتا تھا - یہ مسلمان نوجوان دوسرے ہمجولیوں کے ساتھ اپنے گھر کے سامنے گولیاں کھیل رہا تھا - اس کے چھ دوسرے بہن بھائی اپنے والدین کے پاس گھر میں تھے - بندوقوں، تلواروں اور کرپانوں سے مسلح سکھ جتھوں نے گاؤں پر حملہ کر دیا - یعقوب کسی نہ کسی طرح بھاگ کر گنّے کے کھیت میں چھپ گیا - سکھوں نے کچھ عورتوں کی چھاتیاں کاٹ ڈالیں - دوسری خوفزدہ ہو کر اِدھر اُدھر بھاگ رہی تھیں -

اس نے اپنے ماضی میں جھانکتے ہوتے کہا - ہمارے کچھ دیہاتیوں نے محض اس ڈر سے کہ سکھ ہماری بیویوں اور بیٹیوں کو اٹھا نہ لے جائیں انہیں اپنے ہاتھوں سے قتل کر ڈالا تھا - سکھوں کے نیزے میرے دو بھائیوں کے جسم چھلنی کر چکے تھے - میرے والد برداشت نہ کر سکے -

ہاتھ میں تلوار لہراتے ہوتے دیوانہ وار ادھر اُدھر دوڑنے لگے۔ پھر سکھوں نے انہیں بھی بوچ لیا۔ چند ایک نے سختی سے پکڑ کر نیچے گرایا اور پھر کتنی ہی تلواریں ان پر برس پڑیں۔ ان کا سر، بازو اور ٹانگیں جسم سے الگ کر دی گئیں اور پھر مُردہ جسم کو کھانے کے لئے اس پر کتے چھوڑ دیئے گئے۔

اس گاؤں کی آبادی پانچ سو نفوس پر مشتمل تھی۔ صرف پچاس افراد کو پنجاب باؤنڈری فورس کی مدد سے بچایا جا سکا۔ محمد یعقوب کے پورے خاندان میں سے تنہا وہی زندہ بچ سکا۔

مغویہ خواتین کا بھیانک مستقبل

تحصیل ترنتارن کے گاؤں بھوجیاں اور آس پاس کے دیہات میں بسنے والے مسلمان تقسیم برصغیر تک ڈٹ کر حالات کا مقابلہ کرتے رہے۔ لیکن جب ہندوؤں سکھوں کو ریاستی غنڈوں اور فوجی وردیوں کی اعانت حاصل ہو گئی تو وہاں کے مسلمان بے بس ہو گئے۔

یہ گاؤں امرتسر سے دس میل کے فاصلے پر واقع تھا اور اس میں چار ہزار کے قریب مسلمان رہتے تھے۔ البتہ اردگرد کے دیہات میں ہندوؤں سکھوں کی غالب اکثریت آباد تھی۔ فرقہ وارانہ فسادات کے ابتدائی ایام میں اس گاؤں کے مسلمانوں کو تہ تیغ کرنے کی غیر مسلموں نے کئی مرتبہ کوششیں کیں۔ لیکن اس آبادی کے بہادر مسلمان ان کے ہر حملے کا دندان شکن جواب دیتے رہے۔ بعد ازاں جب ۱۵ اگست ۴۷ء کا دن قریب آیا تو آس پاس کی مخلوط آبادیوں کے مسلمان اپنی جانیں بچانے کے خیال سے بھوجیاں میں اکٹھے ہو گئے۔ یہ وہ وقت تھا جب بھوجیاں ہندوستان کی جغرافیائی حدود کا حصہ بن چکا تھا۔ چنانچہ بھارتی فوج کی سرپرستی میں گردو پیش کے دیہاتی غنڈوں نے اس گاؤں پر حملہ کر دیا۔ جس کے نتیجے میں وطن عزیز کی مشہور سیاسی و سماجی شخصیت علامہ عزیز انصاری

آف گوجرانوالہ کے والد گرامی حاجی امان اللہ، معروف عالم دین مولانا عبدالرحمان، مولانا عبداللہ، مولانا عبدالرحیم خان اور دیگر ہزاروں مسلمان شہید کر دیئے گئے۔ ایک ہزار کے قریب مسلمان لڑکیاں اغوا کر لی گئیں۔ موخرالذکر تینوں شہدا ممتاز روحانی شخصیت مولانا فیض محمد کی آنکھوں کے نور تھے۔ اس خاندان کے شاگرد آج بھی درجنوں کی تعداد میں اہل حدیث کے مدارس میں طلبا کو دینی تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے میں مصروف ہیں۔ ہفت روزہ الاعتصام کے مالک و مدیر مولانا عطاءاللہ بھوجیانی اسی گاؤں میں رہا کرتے تھے اور انہیں بھی مولانا فیض محمد کا شاگرد ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔

علامہ عزیز انصاری کے والد کی شہادت کا زخم ابھی تازہ تھا کہ علامہ صاحب کے بہنوئی مولانا محمد صاحب (سکنہ موضع جوبلہ تحصیل ترنتارن) حملہ آوروں کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے والد گرامی سمیت شہید ہو گئے۔ ان کے تین کمسن بچے ادریس، نذیر اور بشیر معجزاتی طور پر بچ گئے۔ ان کی والدہ آمنہ بی بی نے انہیں فسادیوں کے حملہ کے پیش نظر مرغیوں کے ڈربے میں چھپا دیا تھا اور خود لحافوں والے ٹرنک میں چھپ گئی تھیں۔

بھوجیاں سے ایک ہزار کے قریب اغوا ہونے والی مسلمان دوشیزاؤں کے ساتھ فسادیوں نے جو وحشیانہ سلوک کیا اس کا تصور کرتے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

علامہ عزیز انصاری ۴۳ برس کے بعد آج سے دو سال قبل جب اپنے آبائی گاؤں بھوجیاں گئے تو بھوجیاں میں تقسیم سے قبل کریانہ کی دکان کرنے والے چھیانتی سروپ نامی ہندو سے ان کی ملاقات ہو گئی۔ علامہ صاحب کے بیان کے مطابق چھیانتی سروپ نے ماضی کے دریچوں میں جھانکتے ہوتے علامہ صاحب کو بتایا کہ بھوجیاں پر حملے کے بعد ایک ہزار کے لگ بھگ اغوا شدہ مسلمان عورتوں کو حملہ آور بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک کر لے گئے تھے۔ چھیانتی سروپ نے بھوجیاں کے ایک کھاتے پیتے گھرانے کی ایک مسلمان لڑکی کے اغوا کی روداد بیان کرتے ہوتے انکشاف کیا کہ بھوجیاں کی

مسجد (جسے فسادیوں نے شہید کر دیا تھا) اب ایک حویلی کے روپ میں موجود ہے اور اس میں ایک سکھ خاندان رہائش پذیر ہے۔ آپ اس مسجد کو دیکھنے کے بہانے چلے جائیں آپ کو اس حویلی کے صحن میں ایک ادھیڑ عمر عورت بیٹھی دکھائی دے گی۔ آپ اس عورت کو جب غور سے دیکھیں گے تو پہچان جائیں گے کہ وہ عورت بھوجیاں کے کون سے معزز گھرانے کی آبرو تھی۔

علامہ صاحب جب چھیانتی سرٹپ کے انکشاف کی روشنی میں اس مسجد کے ملبے اور حویلی کے پاس پہنچے تو وہ عورت اپنی حویلی کے صحن میں چارپائی پر بیٹھی سردیوں کی دھوپ تاپ رہی تھی۔ اس عورت نے جب علامہ صاحب کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا تو اس نے انہیں ایک ہی نظر میں پہچان لیا اور وہ اپنے گاؤں کے اس دیرینہ مسلمان ہمسائے کا سامنا کرنے کی تاب نہ لاتے ہوئے اپنی آنکھوں سے برسنے والے آنسوؤں کو اپنے دوپٹے سے پونچھتی ہوئی بجلی کی سی تیزی سے ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ علامہ صاحب کا کہنا ہے کہ اس عورت کے اوجھل ہوتے ہی ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی اور تقسیم کے موقع پر اغوا ہونے والی ایک مسلمان دوشیزہ کی داستان نے پاکستان کے نام پر قربان ہونے والی ہزاروں مسلمان دوشیزاؤں کے اغوا کی داستانوں کی درد بھری یاد تازہ کر دی اور وہ اس سوچ میں ڈوب گئے کہ ان کے گاؤں کی اس مسلمان مغویہ کی طرح نہ جانے کتنی مسلمان عورتیں کسی محمد بن قاسم کے گھوڑوں کی ٹاپ سننے کی آس میں اپنی کوکھ سے غیر مسلم بچوں کو جنم دیتے دیتے بوڑھی ہو چکی ہوں گی۔

اس وحشت ناک اغوا اور سفاکانہ قتل و غارت کے چشم دید واقعات نے لاکھوں افراد کے ذہنوں پر ناقابلِ فراموش نقوش چھوڑے ہیں۔ ایسے نقوش جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گہرے ہوتے چلے گئے اور ہر آنے والا یوم آزادی انہیں کچھ اس طرح تڑپا دیتا ہے جیسے ابھی کل کی بات ہو۔ شاید ہی کوئی پنجابی خاندان ایسا ہو گا جس نے اپنا کوئی رشتے دار یا عزیز

اس وحشیانہ قتل و غارت کی نذر نہ کیا ہو۔ پنجاب آئندہ برسوں کے لئے اَن گنت یادوں کا مسکن بن گیا اور ہر یادداشت دوسری سے زیادہ تلخ اور روح فرسا ہے۔

لکھنؤ کی ایک دولت مند مسلم خاتون عالیہ حیدر کی داستانِ غم بھی کچھ کم تکلیف دہ نہیں۔ اس نے اپنے والدین اور بہنوں کے ساتھ پاکستان روانہ ہونے کا منصوبہ بنایا۔ وہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو رہے تھے مگر یوں لگتا تھا جیسے ایک سیاح کی طرح مختصر سفر پر روانہ ہو رہے ہوں۔ انہیں صرف بیس کلو وزنی سامان اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت ملی تھی۔

وہ صبح اسے اچھی طرح یاد ہے جب وہ مقررہ وزن تک کا سامان اکٹھا کر رہے تھے۔ اس کی بہن نے اپنی سُرخ اور سنہری رنگ کی عروسی ساڑھی کا انتخاب کیا۔ ماں نے مخمل کی بنی ہوئی خوبصورت جائے نماز اٹھائی۔ خود عالیہ نے قرآن پاک کا نسخہ اور اس کا غلاف لیا۔ یہ تھی کُل کائنات جو اتنے بھرے پُرے گھر میں سے لے کر وہ لوگ پاکستان کی طرف ہجرت کر گئے۔ ایسی کتنی ہی مثالیں موجود ہیں۔

مسلمان مہاجرین کو پاکستان لانے والی ٹرینوں پر بھی حملے شروع ہو گئے تھے۔ سکھ جتھے سٹیشن پر کھڑی گاڑیوں پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ چلتی گاڑیوں کو روک لیا جاتا اور قتلِ عام شروع ہو جاتا۔ لگاتار چار چار دن تک لاہور اور امرتسر ریلوے سٹیشن پر کوئی گاڑی ایسی نہ پہنچتی جس میں مُردہ اور زخمی نہ ہوتے۔ گاڑی جب لاہور ریلوے سٹیشن پر آ کر رکتی تو ڈبوں کے دروازوں میں سے خون پانی کی طرح بہتا دکھائی دیتا۔

افراتفری کے اس عالم میں بھی بہت سے مسلمان نوجوانوں نے عزم و ہمت کے ایسے مظاہرے کئے کہ بلاشبہ انہیں قومی ہیرو کہا جا سکتا ہے۔ ایسا ہی ایک نوجوان ریلوے ملازم ظہور احمد تھا۔ اس نے دیکھا کہ دو سکھ ہندو انجن ڈرائیور کو رشوت دے رہے ہیں کہ وہ گاڑی امرتسر کے ریلوے سٹیشن پر روک دے جہاں مسلح سکھ جتھے ان کے انتظار میں چوکڑیاں جمائے بیٹھے تھے۔ ظہور احمد چھپتا چھپاتا برطانوی لیفٹننٹ کمانڈر کے پاس پہنچا جو سٹیشن پر ٹرینوں کی نگرانی

کے لئے مقرر تھا) اور اسے تمام صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ ٹرین امرتسر ریلوے سٹیشن سے چند میل دُور تھی۔ لیفٹیننٹ کمانڈر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ڈرائیور کے ڈبے میں داخل ہوا اور ڈرائیور کو تیز گاڑی چلانے کا حکم دیا۔ ڈرائیور نے بریکیں کمزور ہونے کا بہانہ کیا۔ کمانڈر کا اشارہ پاتے ہی اس کے ساتھی ڈرائیور پر ٹوٹ پڑے۔ انگریز افسر نے گاڑی کا کنٹرول سنبھال لیا اور پھر گاڑی ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے امرتسر ریلوے سٹیشن سے گزر گئی۔ اس طرح ایک مسلمان نوجوان کی بروقت اطلاع اور انگریز افسر کی مدد سے ہزاروں مسلمانوں کی جانیں بچ گئیں۔

اسلامیانِ دہلی کی حالتِ زار

ہندوستان کا مرکز دہلی بھی ظلم و تشدّد کے واقعات سے خالی نہ رہا۔ دوسرے بڑے شہر کئی دنوں سے ہنگاموں کی زد میں تھے۔ قرب و جوار کے ہزاروں مسلمانوں نے دہلی میں پناہ لے رکھی تھی۔ مختلف شہروں سے ہندو سکھ بھی بھاگ کر دہلی پہنچے۔ انہوں نے اپنے بھائیوں کو مسلمانوں کے خلاف اکسانا شروع کر دیا۔

مغلوں کے دَور کا دہلی ۱۹۴۷ء تک مسلمانوں کا شہر تھا۔ مسلمانوں کی آبادی بھی زیادہ تھی اور ان کی معاشرت کا رنگ بھی دوسری قوموں پر زیادہ غالب تھا۔ تانگہ بانوں، سبزی اور پھل فروشوں اور بازارِ تجارت کے دُوسرے افراد کی اکثریت مسلمان تھی۔ یہی وجہ تھی کہ دہلی ابھی تک ہنگاموں کی زد سے باہر تھا۔ مگر کب تک؟

وہ دہلی جس نے کتنے ہی نشیب و فراز دیکھے تھے۔ جس کی گلیوں میں کتنے ہی موقعوں پر کشت و خُون ہوا اور جس کی رونقیں کتنی ہی بار لُٹیں۔ آج پھر تاریخ کے گزشتہ دور سے گزر رہا تھا۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت کی خلیج گہری ہوتی چلی گئی۔ غم و غُصے کی لہریں سرکشی

اختیار کر گئیں اور ۳ ستمبر کو دہلی میں مسلمانوں کے قتلِ عام کا آغاز ہو گیا۔

جامع مسجد دہلی کے امام مولانا سعید احمد بخاری، دہلی میونسپل کارپوریشن کے صدر خان بہادر حبیب الرحمان کے علاوہ سینکڑوں بے گناہ مسلمانوں حتیٰ کہ ریلوے سٹیشن کے درجنوں مسلمان قلیوں کو بھی کلمہ گوئی کی پاداش میں بیدردی سے شہید کر دیا گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک فرانسیسی صحافی میکس دہلی کے مشہور تجارتی مرکز کناٹ سرکس میں پہنچا۔ اس نے دیکھا ہندوؤں کا ایک مسلح ہجوم مسلمانوں کی دکانیں لوٹ رہا ہے اور ان کے مالکوں کو قتل کر رہا ہے۔ یہ حملے اکالی سکھ کمانڈوز کے لئے ایک اشارہ تھے۔ انہوں نے اپنی کارروائی شروع کر دی۔

پرانی دہلی کی گرین مارکیٹ جہاں ہزاروں مسلمان پھل اور سبزی فروش رہتے تھے نذرِ آتش کر دی گئی۔ نئی دہلی میں ہمایوں کے مقبرے کے قریب واقع لودھی کالونی پر ہندو غنڈوں نے حملہ کر دیا اور چن چن کر مسلمانوں کو شہید کیا گیا۔ شاید ہی کسی گھر سے کوئی فرد زندہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو سکا ہو۔ دوپہر ہونے تک شہر میں جا بجا لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ گلیاں، بازار اور مکانات مسلمانوں کے خون سے رنگین تھے۔ راشٹریہ سیوک سنگھ کے ایک گروہ نے ایک برقع پوش مسلمان خاتون کو اس کے گھر سے اغوا کیا اور اس پر پٹرول ڈال کر آگ لگا دی۔ اس کا گناہ صرف یہ تھا کہ اس نے مسلمانوں کے قتلِ عام کے خلاف نہرو سے احتجاج کیا تھا۔ سکھوں نے انتباہ کر دیا کہ مسلمانوں کو پناہ دینے والوں کے گھر جلا دیئے جائیں گے۔ چنانچہ ہندوؤں، سکھوں، پارسیوں اور عیسائیوں نے اپنے مسلمان ملازموں کو گھروں سے نکال کر فسادیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ ہر جگہ مسلمانوں کا صفایا ہو رہا تھا۔ گرد و نواح سے ہزاروں مسلمانوں نے یہاں آ کر پناہ لی تھی۔ مگر دوسرے تمام شہروں سے زیادہ یہاں خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ یہ آخری پناہ گاہ بھی اب محفوظ نہیں رہی تھی اور ۴ ستمبر کی شام تک ہزاروں مسلمان قتل کئے جا چکے تھے۔

مہاجرین کے قافلے پاکستان کی طرف رواں دواں تھے۔ دن کے وقت دُور دُور تک ہزاروں بیل گاڑیوں کے ساتھ گرد کے بادل اڑتے دکھائی دیتے۔ رات کو سڑکوں کے دائیں

باہیں آگ کے الاؤ روشن ہو جاتے۔ کسی کے پاس تھا ہی کیا کہ کھانا پکتا۔ کبھی کچھ پک جاتا تو سب مل کر کھا لیتے۔ یہ لوگ جان ہتھیلیوں پر رکھ کر اور بچتے بچاتے اپنے گھروں سے بھاگنے میں کامیاب ہو گئے تھے مگر حملہ آوروں کا خوف سائے کی طرح ان کا پیچھا کر رہا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ کسی بھی لمحے دشمن ایک خونخوار جنگلی جانور کی طرح ان پر جھپٹ سکتے ہیں۔ یہ تباہ حال، بے بس اور خوفزدہ مخلوق بے شمار مسائل سے دوچار تھی۔ آنکھیں اور حلق گرد سے خشک ہوتے جا رہے تھے۔ مسلسل سفر سے پاؤں زخمی ہو چکے تھے۔ بوڑھے، نوجوان، بچے اور عورتیں سبھی بھوک اور پیاس سے بے حال تھے۔ خوف و دہشت کا یہ عالم تھا کہ بوڑھی عورتیں اپنے بیٹوں سے اور حاملہ عورتیں اپنے خاوندوں سے چمٹی ہوتی تھیں۔ بہت سے آدمی اپنی بیمار اور کمزور بیویوں، ماؤں اور بہنوں کو کندھوں پر اٹھاتے چلے جا رہے تھے۔ کچھ عورتیں اپنے شیر خوار بچوں کو سینے سے لگاتے قافلے کے ساتھ رواں تھیں۔ انہیں مصائب کا یہ بوجھ ایک یا دو نہیں بلکہ ایک سو دو سو یا اس سے بھی زیادہ میلوں تک برداشت کرنا تھا۔ یہ نہتے اور کمزور مسلمانوں کا ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں تک سفر نہ تھا۔ وہ تو اپنے گھروں سے اُجڑ چکے تھے۔ ہزاروں میل دُور نیا وطن ان کی منزل تھا۔ یہ ایک ایسا سفر تھا جس کے ہر میل پر رنج و الم کا سامنا تھا تباہی اور بربادی کے سامان تھے۔ بھوک، پیاس اور ہیضے کی وبا کسی بھی لمحے ان کے لئے جان لیوا ثابت ہو سکتی تھی اور سب سے بڑھ کر حملہ آوروں کا ڈر جس کے خلاف انہیں کوئی تحفظ حاصل نہ تھا۔

پاکستان کی طرف ہجرت کرنے والے یہ مسلمان بے گناہ اور نہتے تھے۔ ان میں وہ کسان بھی تھے جن کی زندگی کھیتوں میں کام کرنے تک محدود تھی اور اب وہ قتل و غارت اور لُوٹ مار کے خوف سے اس بے بسی اور غیر یقینی صورت حال سے دوچار ہو گئے تھے۔ مہاجرین گھروں سے روانہ ہوتے تو انہیں حالات کی سنگینی کا کچھ علم نہ تھا۔ انہوں نے فوری ضرورت کا کچھ سامان اپنے ساتھ لے لیا مگر جوں جوں راستہ کٹھن ہوتا چلا گیا اور جان بچانا بھی مشکل نظر آنے لگا تو یہ تھوڑی بہت اشیا بھی وہ راستے میں پھینکنے لگے۔ لیفٹیننٹ سردی لال

۱۹۴۷ء کی قیامت کے دوران اسلامیانِ دہلی کی پناہ گاہ ——— مقبرہ ہمایوں

دہلی کا پرانا قلعہ جو قیام پاکستان کے موقع پر دہلی کے مسلمانوں کے لئے جائے پناہ ثابت ہوا۔

جو ایک مہاجر قافلے کی نگرانی کر رہا تھا بیان کرتا ہے کہ قریبی دیہات کے سکھ گِدھوں کی طرح مسلمانوں کے قافلوں کا پیچھا کرتے رہتے تھے۔ ان کی اشیاء کی خرید و فروخت کرتے، مسلمانوں کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے اور انہیں بہت کم قیمت ادا کرتے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات یہ مایوس مہاجرین صرف چائے کی پیالی کے بدلے میں اپنی کوئی قیمتی چیز بیچنے پر تیار ہو جاتے۔ بدترین حالت ان مسلمانوں کی تھی جو کمزوری، بیماری یا بھوک کی وجہ سے موت کی سی کیفیت سے دوچار تھے۔ ایسے دردناک مناظر بھی دیکھنے میں آتے کہ والدین اپنے بچوں کو محض اس لئے دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑ رہے تھے کہ انہیں ساتھ لے جانے کی ہمّت ان کے اندر نہ تھی۔ بہت سے بوڑھے افراد درختوں کی تلاش میں تھے تاکہ ان کے سائے میں آرام کی موت مر سکیں۔ ایک انگریز مصنف مارگریٹ بورک وائٹ نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ ایک ننھا مُنّا معصوم بچہ اپنی مُردہ ماں کے پاس بیٹھا اس کے دونوں بازو جھنجھوڑ رہا تھا۔ شاید وہ اپنی ماں کی آغوش میں جانے کے لئے بیقرار تھا مگر وہ یہ حقیقت سمجھنے سے قاصر تھا کہ اب اس کی ماں کبھی اسے اپنے بازوؤں میں نہیں لے سکے گی۔

لاہور سے امرتسر تک کی ۵۰ میل لمبی سڑک کے دونوں کناروں پر جا بجا لاشوں کے ڈھیر تھے۔ یوں لگتا تھا یہ سارا علاقہ ایک طویل و عریض قبرستان میں تبدیل ہو گیا ہے۔ ہر طرف گلی سڑی لاشوں کی سڑاند پھیلی ہوئی تھی۔ کیپٹن اٹکنس فسادات کی کہانی یوں دہراتے ہیں۔ راستے میں ایک ایک گز پر کوئی نہ کوئی لاش پڑی تھی۔ کسی شخص کی گردن کٹی ہوئی تھی اور کوئی بدنصیب بھوک اور ہیضے کا شکار ہو کر مرا تھا۔ سڑک کے کنارے پڑی ان لاشوں پر جا بجا گِدھ منڈلا رہے تھے اور جنگلی کتے ان کی بوٹیاں نوچ رہے تھے۔ لیفٹیننٹ لال ایک ناقابلِ فراموش واقعہ بیان کرتا ہے۔ مسلمان مہاجرین کے قافلے میں ایک بوڑھا تھا جو صرف ایک بکری ساتھ لا سکا تھا۔ راہ چلتے ہوتے بکری قافلے سے الگ ہو گئی۔ بوڑھا اسے پکڑنے کے لئے دوڑ لگا رہا تھا۔ اچانک گنے کے کھیت میں سے ایک سکھ ہاتھ میں ننگی تلوار لے کر نکلا۔ بوڑھے آدمی کا سر تن سے جُدا

لیا اور بکری اٹھا کر کھیتوں میں غائب ہو گیا۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ ہم دیکھتے ہی رہ گئے۔

ملک کا دارالحکومت نئی دہلی ابھی تک ظلم و تشدد کی زد میں تھا۔ شہر میں لاشوں کے اس قدر ڈھیر تھے کہ ایک پولیس افسر کے بقول مُردہ آدمی، گھوڑوں اور بیلوں کی لاشوں میں امتیاز ناممکن ہو گیا تھا۔ مسلمانوں کی لاشیں کئی روز تک گلیوں اور بازاروں میں پڑی رہیں کیونکہ ہندو انہیں مُردہ خانوں تک پہنچانے کے لئے ہاتھ لگانے کو تیار نہ تھے۔ ایڈوینا ماؤنٹ بیٹن اور اس کا شوہر نیول اے ڈی سی لیفٹننٹ کمانڈر پیٹر ایک گلی سڑی اور پھولی ہوئی لاش کے قریب سے گزرے۔ لیڈی نے اپنے شوہر سے ٹھہرنے کو کہا۔ پھر اس نے ایک ٹرک کو اشارے سے پاس بلایا۔ ہندو ڈرائیور سے لاش اٹھا کر ٹرک پر لادنے کو کہا تو اس نے انکار کر دیا۔ دونوں میاں بیوی نے خود لاش کو ٹرک میں ڈالا۔ ڈرائیور حیرانی سے منہ پھاڑے کھڑا تھا۔ لیڈی نے اسے حکم دیا کہ لاش مُردہ خانہ لے جاؤ۔

دہلی کے مہاجر کیمپ میں ہزاروں مسلمانوں نے پناہ لے رکھی تھی۔ یہ اپنے وطن پاکستان جانا چاہتے تھے۔ جب تک انہیں بحفاظت پہنچانے کا انتظام نہ ہو جاتا انہیں اس کیمپ میں رہنا تھا۔ یہ کیمپ پرانے قلعے میں لگایا گیا تھا۔ یہ وہ قلعہ تھا جس نے مسلمانوں کا دو ہزار سالہ دورِ حکومت دیکھا تھا۔ اس قلعے کے در و دیوار پر اکبر، جہانگیر اور اورنگ زیب جیسے پُرشکوہ مسلمان حکمرانوں کے جاہ و جلال کی داستانیں رقم تھیں۔ آج اسی چار دیواری میں مسلمان کسمپرسی کی حالت میں دن گزار رہے تھے۔ انہیں ضروریاتِ زندگی بھی پوری طرح میسّر نہیں تھیں

تاریخ میں بہت کم ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ کسی علاقے کی تقسیم کے وقت فسادات اور خوں ریزی کے دوران میں اغوا اور آبرو ریزی کے واقعات نہ ہوتے ہوں۔ لیکن پنجاب کو آزادی کی بہت بڑی قیمت ادا کرنا پڑی۔ جان، مال اور گھر بار کے ساتھ ساتھ پنجاب کے بے شمار گھرانوں نے اپنی عزتوں کو بھی وطن کی خاطر قربان کر دیا۔ فسادات کے دنوں میں ہزاروں

کی تعداد میں نوجوان مسلمان لڑکیوں کو اغوا کیا گیا۔ ان کے ماں باپ اور بہن بھائیوں کی موجودگی میں ان کی آبرو ریزی کی گئی۔ جو گھروں سے بحفاظت بچ نکلیں وہ راہ چلتے قافلوں میں سے اٹھالی گئیں۔ سکھوں کے دسویں گرو نے اپنے پیروکاروں کو مسلمان عورتوں کے ساتھ جنسی اختلاط سے خاص طور پر منع کیا تھا۔ آنے والے واقعات نے ثابت کر دیا کہ انہوں نے اپنے گرو کی نصیحت کا کیا اثر لیا۔ صرف پنجاب ہی میں ہزاروں مسلمان عورتوں کو زبردستی اپنی ہوس کا نشانہ بنایا گیا۔ سکھ اپنی غیر صحت مندانہ حماقت سے کام لیتے ہوتے ہر جگہ مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے۔ نوجوان لڑکیوں کو اغوا کر کے کئی ماہ تک اُن کی آبرو ریزی کی گئی اور پھر ان بے سہارا اور بد نصیب لڑکیوں کو گائے بھینسوں کی طرح نیلام کر دیا گیا۔ ستمبر کی ایک سہ پہر پچپن ۵۵ سالہ بوٹا سنگھ اپنے کھیتوں میں کام کر رہا تھا۔ اس نے اپنے پیچھے دلدوز چیخ سُنی۔ وہ جلدی سے مُڑا دیکھا کہ ایک نوجوان مسلمان لڑکی بھاگی آرہی ہے۔ ایک دوسرا سکھ اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ لڑکی نے بوٹا سنگھ کے قدموں پر گرتے ہوتے التجا کی کہ مجھے بچاؤ۔ مجھے بچاؤ۔

بوٹا سنگھ جلدی سے لڑکی اور حملہ آور کے درمیان کھڑا ہو گیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ لڑکی کسی مہاجر قافلے سے اغوا کی گئی ہے۔ بوٹا سنگھ ابھی تک غیر شادی شدہ تھا کیونکہ اس کے خاندان میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ اس کی شادی کے اخراجات پورے کر سکتے اور اب اس کی عمر اتنی زیادہ تھی کہ کوئی اس کو لڑکی دینے کو تیار نہ تھا۔ بوٹا سنگھ نے موقعہ غنیمت جانتے ہوتے سکھ نوجوان سے کہا کہ کیا قیمت لوگے اس چھوکری کی۔

"پندرہ سو روپے" جواب ملا۔ بوٹا سنگھ اپنی جھونپڑی میں گیا اور روپے لاکر اس کے ہاتھ میں تھما دیتے۔ خریدی جانے والی لڑکی کی عمر صرف سترہ برس تھی۔ اس کا نام زینب تھا اور راجستھان کے کسی زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔

یہ بھی ہزاروں مسلمان مغویہ خواتین میں سے ایک بد نصیب مسلمان دوشیزہ کی لرزہ خیز

سرگزشت اور ہندوؤں سکھوں کے مظالم کی وحشت اثر جھلک جس کو غیر ملکی مصنفوں نے اپنے غیر جانبدارانہ مشاہدات کی روشنی میں تاریخ کے حوالے کیا۔ اب پاکستانی فوج کے سابق کمانڈر انچیف جنرل محمد موسیٰ (جو اُن دنوں لاہور میں پرنسپل سٹاف آفیسر تھے) کے اس مضمون کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں جو لاہور کے روزنامہ مشرق کے آزادی نمبر (۱۴ اگست ۶۹ء) میں شائع ہوا —

جنرل محمد موسیٰ لکھتے ہیں :۔ انڈین آرمی کی تقسیم کے بعد مجھے ۱۰ اگست ۴۷ء کو دینا پور (بہار) سے راولپنڈی تبدیل کر دیا گیا۔ جب واپسی پر میں انبالہ سے آگے بڑھا تو مجھے اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ فرقہ وارانہ فسادات کی وجہ سے ماحول میں سخت کشیدگی پائی جاتی تھی۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ ان فسادات میں مسلمانوں کو بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑا اور وہ خوفزدہ ہو کر اپنے گاؤں چھوڑ کر مہاجر کیمپوں میں پناہ لے رہے تھے۔ ان لوگوں پر کیمپوں کو جاتے ہوئے قافلوں پر حملے کئے گئے اور یہاں تک کہ مہاجر کیمپ بھی ان حملوں سے محفوظ نہیں تھے۔ میں مختلف ریلوے سٹیشنوں پر اترا اور اس سلسلے کی ضروری اطلاعات جمع کرتا چلا گیا۔ ان اطلاعات میں اس حقیقت کا بھی انکشاف ہوا کہ بعض ہندو ریاستوں کی باقاعدہ فوج بھی اس قتل و غارت میں حصہ لے رہی ہے۔ پنجاب باؤنڈری فورس جو غیر مسلموں اور مسلمانوں پر مشتمل تھی اس کو ختم کر دیا گیا۔ وہ مسلمانوں اور غیر مسلم مہاجرین کی نقل و حمل اور ان کے راستوں کو محفوظ رکھنے کے مقاصد کو پورا کرنے میں ناکام رہی تھی۔

مہاجر کیمپ اور پیدل قافلے

بھارت کے مہاجر کیمپوں سے آنے والے زیادہ تر قافلے پیدل آ رہے تھے۔ جو راستہ میں محفوظ نہ تھے۔ بیمار بوڑھے اور بھوک سے نڈھال لوگ گاڑیوں پر سوار ہو کر پاکستان کا رُخ کر رہے تھے۔ یہ بہت ہی دردناک منظر تھا۔ مجھے جب بھی وقت ملتا۔ ان لوگوں سے ملاقات کرتا۔ ان المناک مناظر کو دیکھ کر انسان کے لئے اپنے جذبات پر قابو رکھنا ممکن نہ تھا۔ لاہور ایریا میں

ایک اہم مسئلہ یہ درپیش تھا کہ ہمیں مختلف کاموں کی انجام دہی کے لئے مناسب تعداد میں مسلم فوجی دستے درکار تھے۔ جو چند یونٹ ہمارے پاس تھے وہ دن رات کام کرتے تھے اور بڑے ہی جوش و جذبہ اور مہارت تامہ کے ساتھ مشکل کام سرانجام دے رہے تھے۔ ان کا بیشتر وقت قافلوں کے ساتھ چلنے میں گزرتا۔ رات کو اُن کی حفاظت کے لئے پہرے پر کھڑے ہو جاتے۔ اپنا فوجی راشن نیم فاقہ زدہ مہاجروں میں بانٹ کر کھلاتے جن میں بہت سے ملیریا، بخار، ہیضہ اور اسہال کا شکار تھے۔ ان بے لوث نوجوان افسروں اور فوجی جوانوں نے ان لوگوں کی خدمت اور تحفّظ کرکے عزم و ہمّت کا ایک ولولہ انگیز منظر پیش کیا جن کی حفاظت اور بہتری ان کے سپرد کی گئی تھی۔ ان کے تعاون کے بغیر ہمارے لئے ان بے شمار لوگوں کو بحفاظت پاکستان لانا قطعی طور پر ناممکن تھا۔

ہمارا ایک قافلہ ایک لاکھ افراد پر مشتمل تھا جس میں چار ہزار پانچ سو کے قریب بیل گاڑیاں تھیں۔ اس قافلے کا آخری حصّہ ابھی امرتسر ہی میں تھا جبکہ اس کا ہراول حصّہ واہگہ پہنچ چکا تھا۔ یہ قافلہ تیس میل سے زیادہ لمبا تھا۔ یہ ایک ایسے علاقے سے گزرتا تھا جہاں حد درجہ حفاظتی و احتیاطی اقدامات کی ضرورت تھی۔ لیکن ہمارے پاس صرف ایک مسلمان بٹالین تھی اور ان کی نفری بھی پوری نہ تھی کہ مہاجروں کی حفاظت کر سکتی چنانچہ میں نے اس مشکل صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے اس بٹالین کو مزید گاڑیاں فراہم کر دی تھیں جس سے ان کے لئے کام کرنا آسان ہو گیا تھا۔ علاوہ ازیں بھارت کے سخت اعتراض کے باوجود قافلے کے اوپر "وقتاً فوقتاً" طیاروں کی پرواز کا انتظام کیا تاکہ قافلے کو اپنی حفاظت میں لانے والے فوجی دستے کے ساتھ دشمنانہ کارروائی نہ ہونے پائے۔ ان انتظامات سے ہمیں اپنا مقصد حاصل ہو گیا اور قافلہ صحیح سلامت سرحد پار کرکے پاکستان میں داخل ہو گیا۔ تب ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔

فوجی جوان بہت تھک گئے تھے وہ دن بھر بڑی تندہی سے مٹرگشت کرتے رہے

تھے۔ تاہم بڑے مطمئن تھے کہ انہوں نے مہاجروں کو حفاظت کے ساتھ ان کے نئے وطن (پاکستان) پہنچا دیا تھا۔ مجھے اس کارنامے پر انتہائی فخر محسوس ہوا۔ لیکن میری یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی۔ مہاجروں کے کیمپ پہنچنے کے بعد بارش ہو گئی اور سخت سردی پڑنے لگی۔ تھکن کے آثار اور موسم کی شدت سے بوڑھے اور بیمار مرنے لگے۔ جوں جوں راتیں ٹھنڈی ہوتی گئیں۔ توں توں مرنے والوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ والٹن کے کیمپ کمانڈنٹ نے کہا کہ مرنے والوں کی بڑھتی ہوئی تعداد سے نمٹنا مشکل ہو گیا ہے اس لئے اسے بلڈوزر کی ضرورت ہے۔ میں یہ سن کر سناٹے میں آ گیا اور حالات کا جائزہ لینے خود کیمپ چلا گیا اور جانے ہوتے اپنے انجنیروں کو کہہ گیا کہ وہ بلڈوزر تو لے جائیں لیکن اس وقت تک استعمال نہ کریں جب تک کہ میں نہ پہنچ جاؤں۔ چنانچہ مرنے والوں کی کثیر تعداد دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ لیکن بلڈوزر کا استعمال مجھے مناسب نظر نہ آیا۔ لہذا میں نے والٹن کیمپ کے عملے کو کہا کہ انہیں مذہبی طریقے سے دفن کرنے کا انتظام کیا جائے۔ چنانچہ تھکے ہارے فوجیوں نے اس کٹھن کام کو تکمیل تک پہنچایا۔

یہاں اس امر کا تذکرہ بے محل نہ ہو گا کہ اس کتاب کے ناچیز مصنف کو بھی تقسیم برصغیر کے فوراً بعد اپنے نوجوان دوستوں کے دوش بدوش لاہور کے والٹن کیمپ میں چند ماہ ان مفلوک الحال مہاجرین کی خدمت کرنے کی سعادت حاصل ہوئی تھی جو ہندوستان سے کسمپرسی کی حالت میں پاکستان پہنچ رہے تھے۔ اس عرصہ کے دوران میری گناہگار آنکھوں نے جو دلدوز مناظر دیکھے اس کی تفصیل تحریر کرنے کے لئے پتھر کا کلیجہ درکار ہے۔ خون سے لتھڑی ہوئی سپیشل ٹرینیں جب والٹن پہنچتی تھیں تو ہم لوگ لرز اٹھتے تھے۔ کسی کی بہن غائب ہوئی تھی تو کسی کے ماں باپ لاپتہ ہوتے تھے۔ اس پر مستزاد ہیضے کی وبا تھی جس نے سینکڑوں مہاجرین کو نگل لیا تھا اور ہم لوگ مقامی انتظامیہ اور فوجی جوانوں کے تعاون سے قبریں کھود کر ایک ایک قبر میں متعدد مسلمانوں کو دفن کرتے تھے۔

سارے قافلے اتنے خوش قسمت نہیں تھے کہ محفوظ منزل مقصود پر پہنچ جاتے۔ مسلاً...
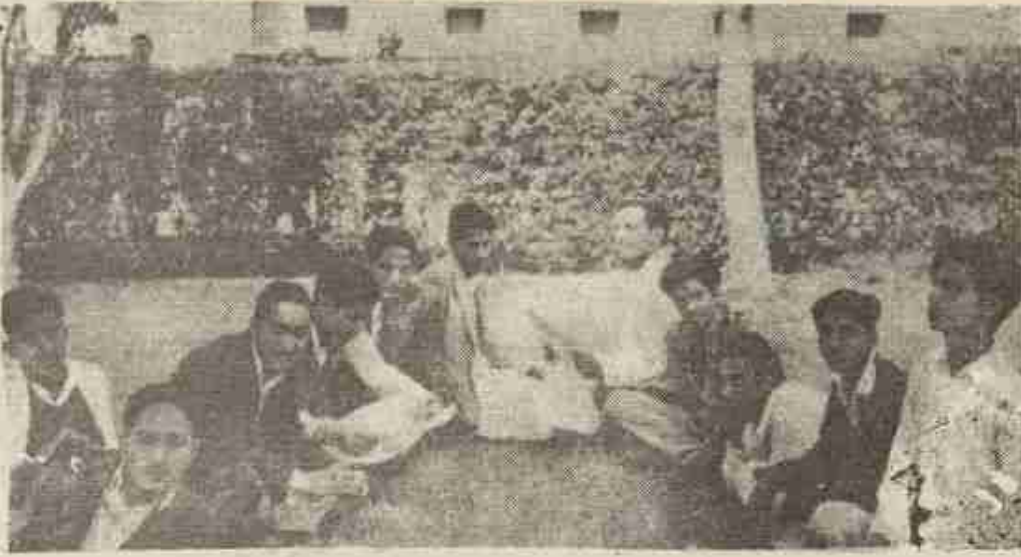
لاہور والٹن کیمپ میں مہاجرین کی شب و روز خدمت کرنے والے رضاکار۔ طلباء اخبارات کا مطالعہ کر رہے ہیں

رضاکارانہ خدمت انجام دینے والے نوجوان کارکنوں کا گروپ فوٹو۔ دائیں سے بائیں :۔ کرنل سیف الدین، ظفر صادق، ملک شیخ صادق حسن، خواجہ افتخار محمود صادق، زاہد سعید، خواجہ لیتین، خواجہ محمود الحسن، فاروق احمد، اور ملک حامد سرفراز وغیرہ

مہاجروں کی ایک ٹرین امرتسر کے خالصہ کالج کے پاس ایک جتھے نے روک لی اور اس کے تقریباً
اسی فیصد مسافر، ایک ہزار سے زائد مرد، عورتیں اور بچے شہید کر دیے گئے اور ٹرین کھینچ کر واپس
امرتسر کے سٹیشن پر لے جائی گئی۔ وہاں پر موجود ہمارے رابطہ افسر نے مجھے ٹیلی فون پر صورتِ حال
سے آگاہ کیا تو میں امرتسر پہنچا اور وہاں نہایت ہی دلدوز منظر دیکھا۔ ہر طرف مُردہ اجسام بکھرے
پڑے تھے اور ٹرین کے ڈبے خون میں نہلائے ہوتے تھے

قیامتِ صغریٰ

پاک فوج کے سابق کمانڈر انچیف جنرل محمد موسیٰ کے تحریر کردہ مضمون کے اقتباس کے بعد
تقسیم برصغیر کے موقع پر دہلی سے پاکستان روانہ ہونے والی ایک سپیشل ٹرین کا سچا واقعہ تحریر کیا
جاتا ہے جو ڈاکٹر زاہدہ امجد علی کے حوالے سے روزنامہ جنگ کی اشاعت مورخہ ۲۱ ستمبر ۸۰ء
میں شائع ہوا ہے۔ ڈاکٹر زاہدہ امجد علی لکھتی ہیں کہ

دہلی کے پرانے قلعے سے ٹرین کی روانگی سے قبل ڈوگرا فوجیوں نے تمام مسافروں کی تلاشی
لے کر انہیں ایک چھوٹے سے چھوٹے چاقو تک سے محروم کر دیا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ مزدور پیشہ
لوگوں کے بچے کھچے اوزار بھی چھین لئے تھے۔ تمام مسافروں کو بوگیوں میں بھیڑ بکریوں کی مانند
بھر دیا گیا تھا۔ جس کی وجہ سے گرمی اور گھٹن میں شدت پیدا ہو گئی تھی اور جس کی وجہ سے سانس
لینا بھی دشوار تھا۔ لیڈیز کمپارٹمنٹ میں تو عورتوں اور بچوں کا گرمی سے بُرا حال تھا۔ گھبراہٹ
اور پریشانی کے عالم میں وہ نہایت بے چین و بے قرار تھے، لیکن گھٹے ہوتے ماحول پر طاری
پراسرار اور انجانے خوف سے مرعوب ہو کر مائیں اپنے اپنے جگر کے ٹکڑوں کو ہر ممکن طریقہ سے
خاموش کرانے لگیتں۔ یہ ٹرین دو دن کے سفر کے بعد جب کسی مسلم آبادی والے ریلوے سٹیشن پر
رُکی تو مقامی لوگوں کی امدادی پارٹیوں نے ہماری ٹرین کو اپنے نرغے میں لے لیا تھا۔ وہ لوگ روٹی،
سالن، پکے ہوتے چاول، سبزی اور فروٹ وغیرہ مسافروں میں کثرت سے تقسیم کر رہے تھے۔
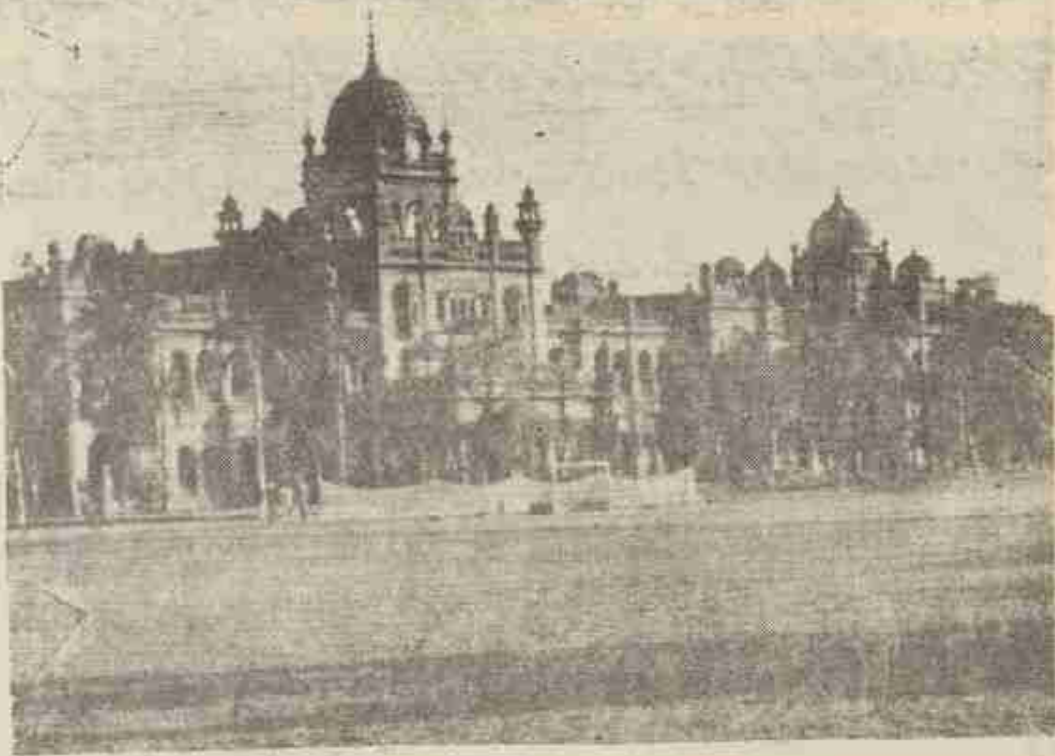
خالصہ کالج امرتسر کی عمارت جو تقسیم کے وقت قاتلوں کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔
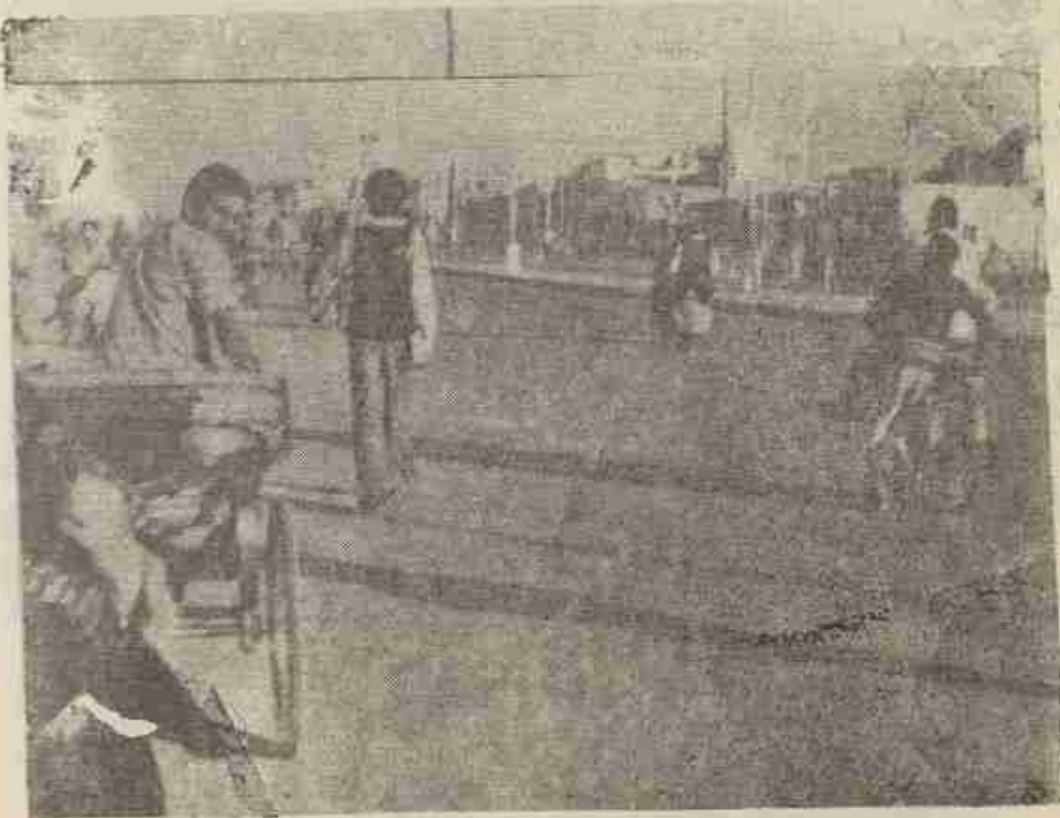
خالصہ کالج کے صدر دروازے کی قریبی شاہراہ جی ٹی روڈ کا وہ حصہ جو تقسیم کے موقعہ پر مسلمانوں کے خون میں نہا گیا

پانی کے بے شمار چھوٹے بڑے برتنوں کا انتظام تھا۔ یہیں امدادی پارٹیوں نے ایک خاص خبر دی اور مستقبل کے خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے مشورہ دیا۔ کہ

"کچھ ہندوؤں اور سکھوں نے اس گاڑی کو بیاس کے سٹیشن پر حملہ کر کے بالکل صاف کر دینے کا خوفناک منصوبہ تیار کیا ہوا ہے۔ اس لئے آپ لوگوں کو چاہیئے کہ اپنے اپنے کمپارٹمنٹس کے دروازے اور کھڑکیاں اچھی طرح بند رکھیں۔"

وہ اسی شام کا دھندلکا تھا جب ہماری ٹرین آہستہ آہستہ رینگتی ہوئی نئی منزل کی جانب بڑھ رہی تھی۔ موسم انتہائی خوشگوار تھا۔ کبھی کبھی ٹھنڈی ہوا کے ساتھ سڑے ہوئے انسانی گوشت کی بدبو بھی اندر پھیل جاتی تھی۔ باہر جھانکنے پر جگہ جگہ انسانی لاشیں دُور تک بکھری ہوئی نظر آتی تھیں۔ بغیر گوشت پوست کی کھوپڑیاں پڑی ہوئی اس بات کی نشاندہی کر رہی تھیں کہ یہاں پہلے بھی انسانوں کا بیدردی سے قتل عام کیا گیا ہے۔ کئی مقامات تو ایسے بھی دیکھے گئے تھے جہاں بہت سی لاشیں بے ترتیبی سے ایک دوسرے کے اوپر پڑی ہوئی تھیں اور جن کا کوئی بھی پُرسان حال نہیں تھا۔ کہیں کہیں دیواروں اور سڑکوں پر خون کی ہولی کھیلی ہوئی صاف دیکھی جا سکتی تھی۔ ایک جگہ تو معصوم بچوں کی لاشیں ایسی حالت میں نظر آئیں کہ کتنا بھی پتھر دل انسان انہیں دیکھتا تو چند لمحوں کے لئے اس کا سانس بھی رُک جاتا۔ ایک نوزائیدہ بچہ کی لاش کو دیکھنے سے صاف پتہ چلتا تھا کہ اسے دونوں ٹانگوں سے پکڑ کر چیرا گیا ہے۔

یہی وہ رقت انگیز مناظر تھے جنہیں دیکھ دیکھ کر پوری گاڑی میں توبہ استغفار کا ورد جاری ہو گیا تھا اور سب کے چہروں پر خوف و ہراس نے اپنا رنگ جما لیا تھا۔ سُرخ و سفید جلد زرد پڑ گئی تھی۔ اگرچہ ابھی تک کوئی غیر معمولی واقعہ رونما نہیں ہوا تھا پھر بھی ہر شخص کو ایک ایک لمحہ انتہائی وحشت ناک اور کربناک معلوم ہو رہا تھا۔ بہت سی عورتیں اپنے اپنے بچوں کو سینوں کے نیچے دبا کر پڑ گئی تھیں۔ قدرتی طور پر اس وقت ہر مرد و زن یہی سمجھ رہا تھا کہ شاید عنقریب اس گاڑی کے مسافروں کا بھی ایسا ہی حشر ہونے والا ہے۔

ابھی ہماری ٹرین بیاس کے سٹیشن میں داخل ہوکر آہستہ آہستہ رُک رہی تھی کہ اچانک کہیں قریب ہی سے رائفل کی گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ پھر اس کے بعد مزید گولیاں چلیں اور خاموشی چھاگئی۔ لیکن اس اثنا میں توبہ استغفار کا ورد تیز ہوگیا اور ٹرین میں دبا دبا شور مچنے لگا۔

کچھ لوگوں نے دیکھا کہ سٹیشن کے پل کے اُوپر سے چند آدمی تیزی سے دوڑتے ہوئے ٹرین کی جانب آرہے ہیں۔ ابھی دھند لکا اتنا گہرا نہیں تھا کہ کچھ دُور سے آدمی کو پہچانا نہ جاسکے۔ اسی لئے مرمئی دھند لکے میں دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہ چند سکھوں کا ایک گروہ تھا جو غالباً پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق گاڑی پر حملہ کرنے آرہے تھے۔

گاڑی کے ساتھ چلنے والی ڈوگرہ فوج نے ہوائی فائر صرف اشارہ دینے کے لئے کئے تھے لیکن غلط فہمی کی بنا پر حملہ آور یہ سمجھ بیٹھے کہ فوجیوں نے ہم پر گولی چلائی ہے' اسی لئے وہ سب چھپ گئے۔ پھر چند لمحے انتظار کے بعد کچھ آدمیوں کو بات کرنے کے لئے فوجیوں کے پاس بھیج دیا اور پھر دوسرے لمحے نیزوں' بھالوں' تلواروں اور کرپانوں سے مسلح وہی سکھ حملہ آوروں کا گروہ' فوجیوں کے کمپارٹمنٹ کے سامنے کھڑے ہوکر کسی مخصوص اشارہ سے اپنے مزید ساتھیوں کو بُلا رہا تھا۔

آناً فاناً میں سکھوں اور ہندوؤں کی جنونی یلغار' بے بس و مجبور اور نہتے مسافروں پر ٹوٹ پڑی چونکہ ٹرین کے بیشتر ڈبوں کی کھڑکیاں اور دروازے مضبوطی سے بند تھے جس کی وجہ سے انہیں کھولنے کے لئے حملہ آوروں کو تھوڑا وقت صرف کرنا پڑا۔ لیکن باہر سے بڑے بڑے پتھروں اور کلہاڑیوں کی مسلسل چوٹیں پڑنے سے ٹرین کے بوسیدہ تختے کب تک محفوظ رہ سکتے تھے۔ دوسری طرف وہ کھڑکیاں حملہ آوروں کے بہت کام آئیں جو پہلے ہی سے کھلی ہوئی تھیں۔

آخر کار تھوڑے ہی وقت میں ہر کمپارٹمنٹ ایک ایک قصاب کی دکان کا منظر پیش کر رہا تھا۔ بہت سے حملہ آور اندر گھس آئے تھے' جو تلواروں' نیزوں اور کلہاڑیوں سے نہتے اور بے بس لوگوں پر مسلسل وار کر رہے تھے۔ حملہ آوروں میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو زخموں سے چور مسافروں کو کھینچ کھینچ کر بوگی سے باہر پھینک رہے تھے' جہاں ہر بوگی کے سامنے بہت سے حملہ آور

موجود تھے اور جو باہر گرنے والے مردوں عورتوں اور بچّوں کے جسموں کے مختلف حصوں کو نہایت بے دردی سے کاٹ کاٹ کر الگ پھینک رہے تھے۔ اس کے علاوہ بہت سے حملہ آور ایسے بھی تھے جو گرنے والے زخمیوں کو کھینچ کر پلیٹ فارم پرے جاتے تھے۔ جہاں ایک کنواں تھا کچھ وحشی قسم کے سکھ وہاں پہلے سے موجود تھے، جو بے رحم قصاب کی مانند ہاتھ پاؤں، دھڑ اور سر وغیرہ کو بہت سے ٹکڑوں میں کاٹ کاٹ کر کنویں میں پھینک رہے تھے۔

قیامت صغریٰ کا دردناک منظر پیش کرنے والا وہ وقت بھی پاکستان کی جدوجہد آزادی کی تاریخ میں سنہری حرفوں میں لکھا جائے گا۔ عورتوں نے اپنے بچّوں کو پہلے ہی سیٹوں کے نیچے چھپایا ہوا تھا تمام مسافروں کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ دعا و ثنا کی تیز آوازیں آہ و فغاں اور چیخ و پکار میں شامل ہو کر پر ہول سماں پیدا کر رہے تھے۔ شیر خوار معصوم بچّوں کا درد کرتڑپنا دیکھ کر ہمدردانہ دل رکھنے والے ہر انسان کا کلیجہ پھٹا جا رہا تھا۔

خُون کا دریا

شام کے گہرے دھندلکے مزید تاریکی میں ڈوب رہے تھے۔ حملہ آوروں کی اکثریت نے منہ پر کپڑے باندھے ہوتے تھے جس کی وجہ سے وہ کچھ زیادہ ہی خوفناک لگ رہے تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا ظلم و بربریت کا خوفناک دیوتا آج ہی اپنی خون کی پیاس ہمیشہ کے لئے بجھا لے گا۔ ہر مرد، عورت اور بچہ اپنی اپنی جان بچانے کی فکر میں تھا آہ و بکا اور چیخ و پکار کے ساتھ ساتھ نفسا نفسی کا عالم تھا، خون کا دریا تھا جو پانی کی مانند بے تحاشہ بہہ رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے حملہ آوروں نے بے شمار عورتوں اور بچّوں کو کاٹ کاٹ کر باہر پھینک دیا۔ میری چھوٹی بہن "مینہ" جو صرف چھ ماہ کی تھی ابھی تک ماں کی چھاتی سے چپکی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر تک خاموشی سے لیٹے لیٹے جب بچی کو کچھ سکون محسوس ہوا تو وہ کھیلنے کے لئے ہاتھ پاؤں چلانے لگی۔ چونکہ اس کے پاؤں میں چھوٹی چھوٹی پازیب پڑی ہوئی تھیں

اس لئے کھیلنے سے آواز پیدا ہونے لگی۔ ماں نے کوشش کی کہ اس کے پاؤں پکڑ لے تاکہ پازیب کی آواز بند ہو جاتے لیکن بچّی بھی جیسے کھیلنے کے لئے بضد ہو گئی تھی۔ پاؤں پکڑے جانے کے بعد اب وہ رونے کی کوشش بھی کرنے لگی۔ ماں نے اسے چُپ کرانا چاہا لیکن بے سُود۔ اس آواز کے رکنے کی جدوجہد کو کسی دشمن نے بھی سُن لیا۔ وہ تیزی سے دوڑتا ہوا آیا اور آتے ہی اپنا نیزہ بچّی کے سینے میں پیوست کردیا۔ نیزہ کی انی بچی کے سینہ سے پار ہو کر ماں کی پسلیوں کو بھی پار کر گئی۔ دشمن نے دوسرا نیزہ بچی کو پھر مارا اور معصوم بچی کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

اب لاہور کی ایک ایسی لڑکی کا بیان قارئینِ کرام کی نذر کیا جاتا ہے جو قیامِ پاکستان کے موقعہ پر زندہ دلانِ لاہور کے دوش بدوش واہگہ سرحد عبور کرنے والے پریشان حال مہاجرین کی رضاکارانہ طور پر خدمت انجام دے رہی تھی۔ ماہنامہ حکایت کے سالنامہ (اپریل ۱۹۸۰ء) کے شمارے میں شائع ہونے والے اس لڑکی (زری) کے بیان کے مطابق پاکستان معرضِ وجود میں آگیا تھا۔ مشرقی پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کا قتلِ عام شروع کر دیا۔ ان کی پناہ پاکستان تھی۔ پناہ گزینوں کے قافلے سیلاب کی طرح چلے آ رہے تھے۔ مسلم لیگ ہائی کمان سے حکم جاری ہوا کہ کالجوں کے طلبا تعلیم ترک کر کے واہگہ اور گنڈا سنگھ والا چلے جائیں اور مہاجرین کو سنبھالیں۔ یہ ایک نئی ڈیوٹی تھی۔ میں اسے معمولی سا کام سمجھ کر ایک روز لڑکیوں کے ساتھ واہگہ چلی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ میں پچھتانے لگی کہ میں یہاں کیوں آگئی تھی۔ قیامت اس سے زیادہ ہولناک اور ہیبت ناک کیا ہوگی۔ انسانوں کا ایک ریلا تھا جو ہندوستان سے چلا ہی آ رہا تھا۔ ان میں بہت سے ایسے تھے جن کے کپڑے خون سے لال تھے۔ جو زخمی نہیں تھے ان کے ذہن اور دل اتنے زخمی تھے کہ ان کے چہرے لاشوں کی مانند تھے اور وہ خالی خالی نگاہوں سے ہر کسی کو دیکھتے تھے۔ یہ چند سو یا چند ہزار نہیں لاکھوں تھے۔ وسیع کھیتوں میں ایک ہجوم بکھرا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ہر کوئی پانی سے نکالی اور ریت پر پھینکی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپ رہا ہے۔ ان میں مرد

بھی تھے۔ جوان اور بوڑھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں۔ جوان کم اور بوڑھی زیادہ اور ان میں بچے بھی تھے۔ بچے ماؤں اور باپوں کو پکارتے، روتے اور بلبلاتے پھر رہے تھے۔ شاید چند ایک بچوں کو ماں باپ مل گئے ہوں۔ لیکن مہاجرین کہتے تھے کہ جن بچوں کو اِدھر اُدھر بھٹکتے ہوتے مہاجرین اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ ان کے ماں باپ اور گھر کے دوسرے لوگ مارے گئے ہیں۔

تین زندہ مائیں، تین مُردہ بچے

پاکستان کے نام پر یتیم اور بے گھر ہو جانے والے ان بچوں کی چیخ و پکار کے ساتھ عورتوں کے بین اور بعض کی سینہ کوبی آسمان کو بھی رلاتی تھی۔ میں نے تین مائیں دیکھیں جنہوں نے دودھ پیتے کی عمر کے مُردہ بچے سینوں سے لگا رکھے تھے۔ تینوں کا یہ عالم تھا کہ لوگ انہیں بتاتے تھے کہ یہ بچہ مر گیا ہے لاؤ اسے دفن کر دیں تو وہ بچوں کو اور زیادہ اپنے ساتھ چپکا لیتیں اور ان پر دوپٹے ڈال دیتی تھیں۔ بولتی کچھ بھی نہیں تھیں۔ آنکھیں اور منہ کھولے ہوئے سب کو دیکھتی تھیں۔ ان کے خاوند مارے گئے تھے اور خاندان کے باقی مردوں کا انہیں کچھ پتہ نہیں تھا۔

ہندوستان سے آنے والے قافلوں میں بیل گاڑیاں بھی تھیں۔ ان پر عورتیں، بچے اور بوڑھے سوار تھے۔ بیشتر بیل گاڑیوں میں لاشیں تھیں۔ اس کے علاوہ کئی مہاجرین کندھوں اور چارپائیوں پر بھی لاشیں اٹھاتے چلے آ رہے تھے۔ میں نے لوگوں کو قبریں کھودتے ہوئے بھی دیکھا۔ لاشیں دفن بھی کی جا رہی تھیں۔ اتنے زیادہ ہجوم میں جنازہ پڑھنے والے دس بارہ سے زیادہ آدمی نہیں ہوتے تھے۔ شاید اس لئے کہ ان لوگوں کے لئے موت اور تجہیز و تکفین کوئی اہمیت اور کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ بچوں کی چیخ و پکار اور عورتوں کے بین مل کر ایسی آواز بن گئے تھے جسے موت کی آواز کہا جا سکتا تھا۔ بعض منزل پر آ کر گرتے اور اللہ کو پیارے ہو جاتے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو اپنے گھر، جائدادیں اور اپنے عزیزوں کی لاشیں سرحد پار چھوڑ آتے تھے۔ انہیں دیکھ کر ہم اپنی قربانیوں کو بھول گئے۔ میں تفصیل میں نہیں جاؤں گی کہ مہاجرین کس حال میں آتے تھے

اور ان کے خون کے رشتوں کا کس طرح قتلِ عام ہوا تھا اور ان کی جوان اور کمسن بیٹیوں کو کس طرح بے آبرو اور اغوا کیا گیا تھا۔ میں پاکستان میں پیدا ہونے والی نسلوں کو صرف یہ بتانا چاہتی ہوں کہ قوم نے پاکستان کے لئے کتنا زیادہ خون، کتنے ہزار بچے اور کتنے ہزار جوان مرد اور عورتیں قربان کی تھیں۔ مہاجرین کو طلبا سنبھالتے تھے۔ انہیں کھلاتے پلاتے، زخمیوں کو ہسپتال اور دوسروں کو ریفیوجی کیمپ تک لے جاتے تھے۔ ہم لڑکیاں عورتوں کو سنبھالتی تھیں۔ ان دنوں ریفیوجی کیمپ تو ایک ہی تھا جسے والٹن کیمپ کہتے تھے لیکن سارا لاہور ریفیوجی کیمپ بن گیا تھا۔ سڑکوں کے کنارے مہاجرین نے ڈیرے ڈال دیتے تھے اور لاہور کے مقامی لوگ انہیں کھانا اور کپڑے دیتے تھے

میری یہ حالت تھی کہ میں بھول گئی تھی کہ میں جوان لڑکی ہوں۔ میرے اندر انقلاب آگیا تھا۔ قوم سے کفار نے پاکستان کی جو قیمت وصول کی تھی اس نے مجھے سر سے پاؤں تک جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ میں مہاجرین کے خون میں ڈوبی جا رہی تھی۔ ان کی مظلوم عورتوں اور معصوم بچوں کی فریادوں کے طوفان میں تنکے کی طرح اُڑی جا رہی تھی۔ انہی دنوں اس ہجوم میں میں نے اپنی عمر کی ایک خوبصورت لڑکی دیکھی۔ وہ اپنے بال نوچتی، اپنے سینے پر زور زور سے ہاتھ مارتی اور روتی تھی۔ اس کے گالوں پر خراشیں تھیں۔ وہ روتے روتے ایک دم چپ ہو جاتی۔ سہمے ہوئے انداز سے اِدھر اُدھر دیکھتی اور دوڑ کر ایک جوان آدمی کے قدموں میں جا بیٹھتی اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ جاتی۔ وہ آدمی اُسے اٹھا کر اور بازوؤں میں لے کر اپنے سینے سے لگا لیتا۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا اور اُسے تسلیاں دیتا تھا مگر وہ خود بھی ہچکیاں لینے لگتا اور اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر دھاڑیں مارنے لگتا۔ اُس وقت یہ لڑکی اور ایک بوڑھی عورت اسے بہلانے بیٹھ جاتیں۔

وہاں تو اس سے زیادہ دردناک منظر دیکھنے میں آتے تھے۔ پتھر بھی پگھل رہے تھے لیکن اس لڑکی سے میری توجہ ہٹ نہ سکی۔ میرے ساتھ دو اور رضاکار لڑکیاں تھیں۔ ہم نے اس لڑکی کو دلاسہ دیا جس کا کچھ بھی اثر نہیں ہو سکتا تھا۔ انہیں ہم ایک طرف لے گئے۔ معلوم ہوا

کہ جو جوان آدمی اس لڑکی کو اپنے ساتھ بار بار لگاتا ہے وہ اس کا بھائی ہے اور بوڑھی عورت ان دونوں کی ماں ہے۔ وہ امرتسر کے قریب کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے۔ اُس گاؤں میں آدھے گھر مسلمانوں کے تھے۔ سکھوں نے ایک روز اُن پر حملہ کیا۔ گھر میں یہ بہن بھائی تھے۔ ایک ان سے بڑا بھائی تھا اور ایک بھائی چودہ پندرہ سال کی عمر کا تھا۔ ان کا باپ بھی تھا اور یہ بوڑھی ماں بھی۔ حملے کے وقت سب گھر میں موجود تھے۔ اُن کے گھر میں داخل ہونے والے حملہ آوروں کے پاس برچھیاں اور کرپانیں تھیں۔ گھر والوں نے لڑکی کو ایک چارپائی کے نیچے چھپا دیا۔ اسی چارپائی کے نیچے دو ٹرنک پڑے تھے۔ سکھوں نے لوٹ مار کے لئے ٹرنک باہر گھسیٹے تو انہوں نے لڑکی کو دیکھ لیا۔ گھر کے تمام افراد اِدھر اُدھر چھپ گئے تھے۔ انہیں لڑکی کی چیخیں سنائی دیں جو فوراً ہی خاموش ہو گئیں۔ مرد حیران ہوتے کہ خاموشی کیوں ہو گئی ہے۔ گاؤں میں قیامت بپا تھی۔ باپ باہر آیا۔ اُسے دیکھ کر تینوں بیٹے بھی سامنے آ گئے۔ ان کے پاس کلہاڑیاں، ایک کے پاس لمبی چھری اور ایک کے پاس چارہ کاٹنے والا ٹوکہ تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ لڑکی کو سکھوں نے اندر فرش پر گرایا ہوا تھا اور لڑکی کی آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ لڑکی کا باپ اور بھائی سکھوں پر ٹوٹ پڑے۔ اس لڑائی میں لڑکی کا باپ، چھوٹا بھائی اور سب سے بڑے بھائی مارے گئے۔ لیکن لڑکی کی آبرو لٹ چکی تھی۔ میں نے اس کے گالوں پر جو خراش نما زخم دیکھے تھے۔ وہ سکھوں کے ناخنوں اور دانتوں کے نشان تھے۔ لڑکی نیم بے ہوشی میں تھی۔ یہ تینوں جس طرح اُس گاؤں سے نکل کر پاکستان تک آئے وہ ایک معجزہ اور سنسنی خیز کارنامہ تھا۔ آپ تصور میں لا سکتے ہیں کہ اس ماں، اُس کی بیٹی اور بیٹے کی جذباتی حالت کیا ہو گی جو اپنے خون کے رشتے کی لاشیں، اپنا گھر اور بیٹی کی آبرو پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ ذرا تصور میں لائیں کہ اگر ان کی جگہ ہم ہوتے تو ہماری ذہنی کیفیت کیا ہوتی؟

لاہور سے ہندو سکھ ہندوستان چلے گئے تھے اور ان کے محلے خالی ہو گئے تھے۔ بہت

اور دیسلے والے مہاجرین ان کے مکانوں میں آباد ہو رہے تھے۔ میں نے اس لڑکی، اس کے بھائی نذیر اور ان کی ماں کو ریفیوجی کیمپ لے جانا مناسب نہ سمجھا۔ جی میں آتی تھی کہ کم از کم اس لڑکی کو اپنے گھر ضرور لے جاؤں۔ میں بھی اس جیسی لڑکی تھی اور اس کے جذبات کو میں ہی سمجھ سکتی تھی۔ چنانچہ میں نے اپنے ساتھ والی لڑکیوں سے بات کی۔ انہوں نے اپنی جان پہچان کے تین چار طلباء سے بات کی۔ شام تک ان نوجوانوں نے ایسا انتظام کر دیا کہ نذیر اپنی ماں اور بہن کے ساتھ ایک ہندو کے خالی مکان میں پہنچ گیا۔ میں ان کے ساتھ تھی۔ چار کمروں کا بڑا اچھا مکان تھا۔ لیکن وہاں کوئی سامان نہ تھا۔ ہم نے کئی ایک گھروں سے برتن، کپڑے اور بستر جمع کر کے نذیر کا گھر آباد کر دیا۔ لوگوں نے انہیں کچھ پیسے بھی دیتے۔ ہمارا گھر ان کے گھر سے زیادہ دُور نہیں تھا۔ میں ان کے ہاں تقریباً روزانہ جاتی تھی۔ نذیر اور اس کی ماں کا سوائے رونے کے کوئی کام نہ تھا۔ نذیر کی بہن چپ چاپ چارپائی پر پڑی رہتی تھی۔ کبھی چیخ مار کر اٹھ کھڑی ہوتی اور دوڑ پڑتی لیکن صحن میں جا کر اِدھر اُدھر دیکھتی اور سر جھکا کر اندر آ کر چارپائی پر لیٹ جاتی تھی۔ نذیر نے مجھے بتایا کہ یہ رات کو بھی ایک دو مرتبہ ایسے ہی کرتی ہے۔

ایک روز اس لڑکی نے مجھ سے پوچھا کہ "کنواری" ہو؟ میں نے کہا "ہاں" تو اس نے اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھا اور سسک سسک کر رونے لگی۔ میں اس کا اشارہ سمجھ گئی۔ اس کی شادی نہیں ہوئی تھی لیکن وہ کنواری نہیں تھی۔ تھوڑے دنوں کے بعد نذیر گھبراہٹ کی حالت میں ہمارے گھر آیا۔ اس کی بہن لاپتہ ہو گئی تھی۔ وہ رات کو سو گئی تھی۔ معلوم نہیں کس وقت نکل گئی۔ صبح گھر میں نہیں تھی۔ نذیر ہمارے گھر میں ہی تھا کہ اس کے محلے کا ایک آدمی دوڑا آیا۔ اس نے نذیر کو بتایا کہ تھانے سے پولیس کا سپاہی آیا ہے۔ اُسے تھانے بلایا گیا تھا۔ نذیر تھانے گیا تو وہاں اس کی بہن کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ چہرہ اور سینہ ٹھیک تھا۔ نیچے کا دھڑ کئی ٹکڑوں میں کٹ گیا تھا۔ اس نے ریل گاڑی کے نیچے آ کر خودکشی کر لی تھی۔

تھانیدار نے نذیر کو ایک رقعہ دکھایا۔ یہ مرنے والی کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ بعد میں میں نے بھی وہ رقعہ دیکھا تھا۔ وہ چھ جماعتیں پڑھی ہوئی تھی۔ اس نے لکھا تھا کہ میں اپنے پیٹ میں کسی کافر کا بچہ نہیں پال سکتی۔ میں اپنی جان خود لے رہی ہوں۔ اس رقعے پر اس نے اپنے بھائی کا نام اور محلّہ لکھا ہوا تھا۔ نذیر نے تھانیدار کو بتایا کہ امرتسر کے ایک گاؤں کے ہندو سکھوں نے اس کی بہن کی عزّت لوٹ لی تھی۔ چنانچہ تھانیدار نے نذیر کا بیان لینے کے بعد لاش واپس کردی۔

ضلع حصار کے مشکور حسین یاد اپنی تصنیف "آزادی کے چراغ" میں اپنی بیوی خدیجہ، ڈیڑھ سالہ بیٹی مسرور بانو اور دیگر افرادِ خانہ کی شہادت کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "ہمارے گھر میں پانی ختم ہوچکا تھا۔ میرا حقیقی بھائی اظفر حسین اور خالہ زاد بھائی ظہیر کہنے لگے کہ ہم کنوئیں سے پانی لے آتے ہیں۔ کنواں ہمارے مکان کے پچھواڑے میں تھا اور وہاں کچھ اجنبی ہندو آتے ہوتے تھے۔ میں نے مشورہ دیا کہ فی الحال پانی لانا خطرے سے خالی نہیں اس لئے یہ ارادہ ترک کردیا جائے تو بہتر ہے۔ ظہیر اور اظفر میرا مذاق اڑانے لگے "مشکور بھائی بزدل ہیں۔ ہندوؤں سے ڈرتے ہیں، ہم پانی ضرور لے کر آئیں گے۔ ہم سے چھوٹے بچوں کی پیاس نہیں دیکھی جاتی"۔ یہ دونوں جوان پانی لینے گئے اور چند لمحوں بعد ہی ان کی چیخ پکار سنائی دی۔ خالو صغیر حسین پہلے ہی وردی پہنے بیٹھے تھے۔ پستول ہاتھ میں لے کر اُن کی مدد کو گئے اور چھڑا کر لے آئے۔ اظفر کا سر زخمی ہوچکا تھا اور ظہیر بازو سنبھالے آرہا تھا۔ ہندو ہمارے گھر کی چھتوں پر چڑھ آئے تھے اور آگ لگانا چاہتے تھے۔ خالو صغیر نے مجھ سے کہا کہ میں بندوق کا ایک ہوائی فائر کردوں تاکہ پولیس ہماری مدد کو آجائے۔ فائر کی آواز سنتے ہی پولیس والے آ گئے لیکن برابر والے دو منزلہ مکان پر چڑھ کر ہمارے ہی گھر پر گولیاں برسانے لگے۔ خالو صغیر مسلسل چلّا رہے تھے "پولیس" میں صغیر حسین سب انسپکٹر بول رہا ہوں۔ میرے گھر پر کیوں گولی چلا رہے ہو۔ ہمارا کوئی قصور نہیں"۔

گولیوں کی رفتار تیز ہوتی گئی۔ اُدھر ظہیر اور اظفر کے زخموں سے بُری طرح خون بہہ رہا تھا۔

نفیس بانو نے مجھ سے کہا۔ "شکور بھائی باہر سماوار میں تھوڑا سا پانی ہے۔ اگر وہ آجاتے تو میں ان دونوں کو پٹی باندھ دوں۔ میں سوچ رہا تھا باہر صحن میں سے پانی کیسے لایا جائے۔ گولیوں کی لگاتار بارش ہو رہی تھی۔ نفیس بانو مجھے تذبذب میں دیکھ کر بھانپ گئی کہ میں باہر جانے سے کترا رہا ہوں۔ چنانچہ کچھ کہے بغیر اٹھی اور گولیوں کی بارش میں سماوار اٹھا لائی۔ جیسے ہی وہ برآمدے میں داخل ہوئی، ایک گولی سماوار پر آگر لگی۔ میں اپنی بزدلی پر سخت نادم تھا۔ اظفر اور ظہیر خون بہہ جانے سے خاصے نڈھال ہو گئے تھے۔ نفیس بانو ان دونوں بھائیوں کی پٹی کرتی جاتی تھی اور کہتی جاتی تھی۔ "واہ بھئی واہ، آپ اچھے جوان ہیں، ایک ایک زخم کھا کر نڈھال ہوتے جا رہے ہیں۔ ہم نے آزادی حاصل کی ہے، آخر اس کی کوئی قیمت بھی تو ادا کرنی چاہیئے۔"

میں نے دیکھا کہ نفیس بانو کے ان الفاظ نے دونوں زخمیوں کو خاصا ہوشیار کر دیا تھا۔ نفیس بانو ان چند پڑھی لکھی لڑکیوں میں سے ایک تھی جو مغربی تعلیم حاصل کرنے کے باوجود اپنی مشرقی روایات کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتیں اور وقت پڑے تو ہر کڑی سے کڑی مصیبت کو خندہ پیشانی اور بے جگری سے جھیل جاتی ہیں۔

ایک دُکھیا ماں کی فریاد

پولیس کی مدد سے بلوائی ہمارے گھر کی چھتوں کو کھود کر آگ لگا رہے تھے۔ اب ہم سب کے سب برآمدے میں آگئے۔ دھوئیں سے ہمارا دم گھٹا جا رہا تھا۔ کمروں کے بعد جب برآمدے کی چھت کو کھودا جانے لگا تو ظہیر یکایک اٹھ کر باہر صحن میں آگیا۔ اس کا صحن میں آنا تھا کہ ایک گولی اس کے چوڑے چکلے سینے کے وسط میں آکر لگی۔ میں نے دیکھا کہ میرا خالہ زاد بھائی عجیب انداز سے اپنا سینہ پکڑے بل کھاتے ہوئے گر رہا ہے۔ نفیس بانو چیختی ہوئی نکلی۔ "بھیا، میرے پیارے بھیا" اس نے اپنے بھائی کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ ظہیر اپنی بہن سے کہہ رہا تھا۔ "نفیس تمہارا کیا بنے گا..... یہ ظالم..... یہ ظالم..... تمہاری عصمت....."

نفیس بانو نے نہایت اطمینان سے جواب دیا "بھیا آپ اطمینان سے خُدا کے حضور میں جائیں۔ اس سے قبل کہ کوئی میری طرف اپنے ناپاک ہاتھ اٹھائے، میں اپنا خاتمہ کر چکی ہوں گی۔"
بہن کے یہ الفاظ سُن کر ظہیر نے صرف "اچھا" کہا اور پھر ہمیشہ کی نیند سو گیا۔ میں سمجھتا ہوں جس طرح ظہیر نے اطمینان کے ساتھ جان دی۔ اس طرح شاذ ہی کوئی داعیِ اجل کو لبیک کہتا ہے۔ اُس کے چہرے پر کرب کے آثار نہ تھے۔ نفیس بانو کے ساتھ ہی میری خالہ بھی باہر نکل آئی تھیں۔ لیکن اپنے کڑیل جوان بیٹے کی لاش پر بین کرنے کے بجائے وہ بار بار ہندو سپاہیوں کو مخاطب کر کے یہی فریاد کرتی رہیں۔ "اے بھائیو! جہاں تم نے میرے لال کا خاتمہ کیا ہے، وہاں مجھے بھی گولی مار کر ختم کر دو۔ خدا تمہارا بھلا کرے۔ کیوں دیر کر رہے ہو۔ اس وقت مجھ دکھیاری پر یہ تمہارا بہت بڑا احسان ہو گا۔"
خالو صغیر حسین برآمدے میں میرے پاس چُپ چاپ کھڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کسی گہری سوچ میں کھوئے ہوئے ہیں۔ حُسنہ بھی ان کے پاس بُت بنی کھڑی تھی۔ واضح رہے کہ حُسنہ کی شادی ظہیر سے چند ہی روز بعد ہونے والی تھی۔ خالو صغیر اچانک سوچ سے بیدار ہوئے۔ جیسے انہوں نے کوئی فیصلہ کر لیا ہو اور پھر حُسنہ کو سینے سے لگا کر کہنے لگے "میری بیٹی، میری حُسنہ، میرے گھر کی رونق چلو ظہیر کے پاس۔ میں ایک بار تمہیں دامن تو بنا لوں۔"
حُسنہ خاموشی سے ظہیر کی لاش کے قریب آئی اور خالو صغیر نے اُس پر پستول کا فائر کر دیا۔ گولی اس کی کنپٹی پر لگی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گئی۔ گولی لگنے سے خون کی ایک لکیر اس کے ماتھے پر تیر گئی۔ خالو صغیر مجھ سے کہنے لگے۔ "دیکھا مشکور، حُسنہ بیٹی کے سر پہ کیسے سُرخ پھولوں کا سہرا بندھا ہے۔ وہ دلہن بن رہی ہے۔ لو بھئی، میں ایک بڑے فرض سے سبکدوش ہو گیا۔"
حُسنہ کے بعد نفیس بانو نے سینہ تان دیا۔ خالو صغیر نے اس پر لگاتار تین فائر کئے لیکن نفیس بانو اب بھی اسی طرح بیٹھی تھی۔ اس نے صرف اس قدر کہا۔ "پیارے ابا ذرا ہمت سے کام لیجئے، آپ کے تمام فائر میرے بازوؤں پر لگے ہیں۔ نشانہ باندھ کر ایک فائر میرے سینے

یا سر پر کر دیجئے تاکہ میرا خاتمہ جلدی ہو۔"

خالو نے پستول دوبارہ بھرا۔ اس مرتبہ بھی انہوں نے تمام گولیاں چلائیں نفیس بانو زمین پر پڑی تڑپ رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ "ابا، آپ نے میرا تمام جسم چھلنی کر دیا ہے لیکن ایک گولی بھی ایسی جگہ نہ لگی کہ میں ختم ہو جاتی"۔

خالو صغیر نے فریاد کا جواب دیا۔ "کیا کروں بیٹی، مجھے کچھ نظر نہیں آرہا ہے۔ معاف کر دو میری لال۔ میں آخری وقت بھی تمہارے کام نہ آسکا"۔ اس کے بعد خالو مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے "مشکور بیٹا، تم ہی میری کچھ مدد کر دو۔ یہ لو پستول اور نفیس بانو کا خاتمہ کر دو"۔

میں نے جواب دیا۔ "خالو مجھ سے ایسا نہیں ہو سکتا"۔

انہوں نے کہا۔ "اچھا بیٹا، تمہاری مرضی"۔

اگرچہ خالو کے پستول سے خالہ بھی زخمی ہو چکی تھیں، تاہم وہ ابھی تک ہندو سپاہیوں سے یہی کہے جا رہی تھیں۔ "اے بھائیو، تم نے میرے لال کو مار ڈالا، مجھ پر بھی ایک گولی چلا دو......" اتنے میں پولیس کی طرف سے کسی نے کہا۔ "اگر تم لوگ اپنا پستول اور بندوق ہمیں دے دو تو ہم تمہیں کچھ نہ کہیں گے اور تمہاری جانیں بچ جائیں گی"۔

خالہ یہ آواز سن کر ایک دم میری والدہ سے مخاطب ہو کر کہنے لگیں۔ "بانو، میرا گھرانا تو تباہ ہو گیا۔ تو ہی اپنے بچوں کو بچا لے۔ ان سے کہہ دے ہم اسلحہ واپس کرتے ہیں"۔ اسی اثناء میں خالو صغیر حسین پستول میرے حوالے کر کے نہایت ملتجیانہ لہجے میں کہہ رہے تھے۔ "مشکور بیٹا انکار نہ کرنا، بس ایک گولی میرے سینے کے پار کر دو۔ دیکھ میرے بیٹے، یہ آخری التجا ہے"۔

میں نے کہا۔ "خالو ابا، میں یہ کیسے کر سکتا ہوں۔ یقین کیجئے مجھ میں قطعی ہمت نہیں ہے"!

میرے یہ الفاظ سن کر خالو نے ایک لمبا سانس لیا اور کہنے لگے۔ "اچھا بیٹا، تمہاری مرضی، تو پھر یہ پستول اور بندوق ان لوگوں کے حوالے کر دو، شاید تم لوگوں کی جانیں بچ جائیں، مجھے تو

یہ لوگ پھر بھی نہیں چھوڑیں گے۔" میں نے کہا۔ یہ لوگ ہمیں دھوکہ دے رہے ہیں، چھوڑیں گے کسی کو بھی نہیں۔"

"پھر بھی تم بندوق اور پستول انہیں دے آؤ۔" خالو نے جواب دیا۔

"میں سمجھتا ہوں اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔"

"میں جو کہتا ہوں، اسلحہ ان لوگوں کے سپرد کر دو۔" خالو ذرا سخت لہجے میں بولے۔

"کون دے کر آئے۔" میں نے اپنی کمزوری کا صاف صاف اظہار کر دیا۔

"تم سخت بزدل ہو۔" خالو نے ناراض ہوتے ہوئے کہا اور مرحوم کی یہ آخری ناراضگی تھی۔

ہماری گفتگو سن کر میرے چھوٹے بھائی اظفر نے جواب دیا۔ "لائیے خالو جان، میں اسلحہ ان لوگوں کو دے آتا ہوں۔" میری والدہ نے اسی اثناء میں ہندو سپاہیوں سے قسمیں لیں کہ وہ اسلحہ لینے کے بعد ہمیں کچھ نہ کہیں گے۔ اظفر بندوق اور پستول لے کر باہر گیا۔ لیکن چند ثانیے بعد ہی ہمیں اظفر کی آواز سنائی دی۔ "دیکھو تم لوگ وعدہ خلافی کر رہے ہو۔" اور پھر یکے بعد دیگرے دو فائر ہوتے۔ فائر کی آواز سنتے ہی میری والدہ بے قرار ہو کر دوڑیں۔ "ارے ظالموں نے میرے بچے کو مار ڈالا۔" جب میں والدہ کے پیچھے چلنے کو تیار ہوا تو خدیجہ نے مجھ سے پوچھا۔ "فرمایئے میرے لئے کیا حکم ہے؟"

میں نے جواب دیا۔ "تم بھی باہر چلو۔" میری معصوم بچی مسرور بانو اُس وقت اُس کی گود میں تھی۔ میں ظہیر کی لاش کے قریب آیا اور دروازے سے باہر دیکھا کہ بلوائی نیزے برچھیاں تانے ہمارے گھر سے نکلنے والوں پر حملہ کر رہے ہیں۔ میں اپنی دانست میں عقل مندی سے کام لیتے ہوئے وہیں ظہیر کی لاش کے قریب لیٹ گیا۔ البتہ مجھے اس وقت ایک دھماکہ ضرور سنائی دیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ مجھ پر فائر کیا گیا تھا۔ میں اس سے زخمی بھی ہوا لیکن اس وقت مجھے گولی کے زخم کا ذرا سا بھی احساس نہ ہوا اور میں یہی سمجھا کہ ہوشیاری سے اپنی جان بچا رہا ہوں۔ میں زمین پر ظہیر اور نفیس بانو کے خون میں ڈوبا ہوا پڑا تھا اور سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ خالہ ابھی تک پکارے جا رہی

نفیس۔ "اے بھائیو! ایک گولی میرے سینے میں بھی مار دو۔ میرا لال کیا کہتا ہوگا کہ ماں نے اس کے ساتھ آنے میں اتنی دیر کر دی۔"

چھت پر چڑھے ہوئے بلوائی ہم پر اینٹ، پتھر اور کانچ کی ٹوٹی ہوئی بوتلیں برسا رہے تھے۔ اتنے میں مجھے محسوس ہوا کہ کوئی ٹھنڈی ٹھنڈی چیز ہم پر پھینکی جا رہی ہے۔ چند لمحوں بعد ہمارے جسموں میں آگ لگ گئی۔ خالہ نے اللہ کے حضور احتجاج کیا "یا اللہ اب ہم کافروں کی طرح جلائے بھی جائیں گے۔"

دیر سے نفیس بانو کی کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ تمام گھر اور لاشوں سے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ مجھے لمحہ بھر کے لئے خیال آیا یہ سب کچھ حقیقت نہیں بلکہ خواب ہے۔

خالو صغیر حسین کے بلند نعرۂ تکبیر نے مجھے چونکا دیا۔ وہ جس وقت باہر نکلے، ان پر پے در پے تھری ناٹ تھری کے تین چار فائر ہوئے۔ وہ ہر گولی پر "اللہ اکبر" کہہ رہے تھے۔ میں نے اپنے آپ سے کہا۔ "مشکور تم خواب نہیں دیکھ رہے ہو، یہ سب کچھ حقیقت ہے۔"

ظالم کا بُوٹ اور معصوم بچّی

جس وقت میرا چھوٹا بھائی اظفر بندوق اور ریوالور پولیس کے حوالے کرنے کے لئے باہر نکلا تو خدیجہ نے مجھ سے باہر جانے کی اجازت مانگی۔ اُس وقت مسرور، خدیجہ کی گود میں تھی۔ ہندو اپنے گھروں سے اینٹ اور پتھر برسا رہے تھے۔ خدیجہ، مسرور کو اپنے ایک ہاتھ سے بچانے کی کوشش میں مصروف چلی جا رہی تھی۔ میری بیٹی کے بھورے بھورے بال پریشان تھے۔ چلتے وقت اُس نے مجھے ایسی نگاہ سے دیکھا جس میں ہزار ہا معنی پوشیدہ تھے۔ میں نے یوں محسوس کیا جیسے میری بیٹی مجھ سے کہہ رہی ہے۔ "لیجئے بابا جان، ہم تو چلے آپ کو یہ زندگی مبارک۔"

ایک لمحے کے لئے شدّت کے ساتھ میرا دل چاہا کہ اپنی لاڈلی کو سینے سے لگا کر رخصت کروں۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میرے اور میری پیاری بیٹی کے درمیان مصلحت حائل ہو گئی۔

میں نے دل میں کہا "مشکور جذباتی نہ بنو زندگی ہے تو پھر ملیں گے۔"

میرا خیال تھا اور بالکل خیالِ خام کہ شاید باہر نکلنے پر ہندو ہمیں حسبِ وعدہ کچھ نہ کہیں گے اور یوں ہماری جان بچ جائے گی۔ مجھے اچھی طرح تو یاد نہیں لیکن خیال پڑتا ہے کہ خدیجہ نے چلتے وقت نہ صرف اپنے لئے اجازت چاہی تھی بلکہ مسرور کے بارے میں بھی پوچھا تھا کہ اس امانت کو آپ اپنے پاس رکھیں گے یا میں گود میں سنبھالے رکھوں۔ غالباً میں نے نہایت غیر ذمہ داری کا ثبوت دیتے ہوئے اور اپنی جان کی فکر کرتے ہوئے خدیجہ کو یہی جواب دیا کہ مسرور کو تم ہی اپنے پاس رکھو۔

اُس وفا شعار نے چوں و چرا کئے بغیر سرِ تسلیم خم کیا اور قدم آگے بڑھا دیئے۔ میں اپنے گھر کے دروازے کے قریب ہی جہاں ظہیر اور نفیس بانو خون میں نہائے پڑے تھے گر گیا تھا اور خدیجہ، مسرور کو لے کر باہر آگئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ہندو برچھیوں اور بلموں سے ہمارے گھر سے باہر نکلنے والوں کو مار رہے ہیں۔

میری معصوم بیٹی کے ساتھ اُس وقت فی الواقع کیا بیتی مجھے نہیں معلوم۔ البتہ میں نے اپنی ماں کی یہ آواز ضرور سُنی۔ "اے بہو مسرور کو مجھے دے دو۔"

بعد کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ہندوؤں نے خدیجہ پر حملہ کیا اور معصوم بچی کو بچانے کی غرض سے میری والدہ نے اسے اپنی گود میں لے لیا اور جب اُن پر حملہ ہوا تو مسرور اپنی ماں کی گود میں آگئی۔ دونوں نے بچی کو بچانے کی کوشش میں اپنا فرض ادا کر دیا۔ میں اپنی جگہ پڑا یہ سمجھ رہا تھا کہ مسرور بھی ان کے ساتھ ختم ہو چکی ہے۔ کیونکہ [illegible] کرپانوں اور بلموں سے مارنے کے فوراً بعد ہندو حملہ آوروں نے مٹی کا تیل اور جلا[illegible]نے والی گیس پھینک کر ہمارے مکان اور لاشوں کو آگ لگا دی تھی۔ لیکن رات کے اندھیرے میں جب حملہ آور جا چکے اور آگ بھی قریب قریب بجھ چکی تھی۔ میں نے مسرور کی آواز سنی۔ مسرور نے پہلے اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں دادی کو پکارا اور جب دادی کی لاش نے کوئی جواب نہ دیا تو وہ اپنی ماں سے مخاطب

ہوتی۔ وہ ابھی اپنی ماں کو بُلا رہی تھی اور مَیں اس کے قریب جانے کا موقعہ بھانپ ہی رہا تھا کہ ایک ہندو سپاہی آگے بڑھا اور کہا۔ "ارے تُو ابھی زندہ ہے؟"

اس فقرے کے ختم ہوتے ہی مسرور کی ایک چیخ سنائی دی۔ پھر مجھے کچھ پتہ نہ چل سکا کہ کیا ہوا۔ صبح کو جب میں لاشوں سے نکل کر بھاگا تو میں نے دیکھا کہ مسرور اپنی ماں اور دادی کی لاشوں کے درمیان پڑی مسکرا رہی تھی۔ اس کے ننھے سے گلے پر ہلکا سا زخم تھا اور سینے پر جُوتے کا نشان جس سے مَیں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اُس ہندو سپاہی نے پہلے تو میری معصوم ڈیڑھ سالہ لاڈلی کو زور سے ٹھوکر ماری جو اُس کے گلے پر لگی اور بعد میں فوراً اُس کے ننھے سے سینے کو اپنے پاؤں تلے کچل دیا۔

جب میں نے چلتے وقت اپنی لاڈلی بیٹی کو دیکھا تو یقین کیجیے کہ اُس کے چہرے پر خاص قسم کی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا میں اس کے بھُورے بال اُڑ رہے تھے۔ اس کی ننھی سی لاش عجب طرح کا منظر پیش کر رہی تھی۔

مشرقی پنجاب کے ضلع کرنال کی تحصیل کیتھل کے محمد ظفیر ندوی کی ہجرت کا واقعہ بھی زبردست عبرت رکھتا ہے۔ ندوی صاحب لکھتے ہیں کہ "میرے والد ماجد مولوی محمد فضل نذیر ظفر ندوی عرصہ تک یہاں میونسپلٹی کے چیئرمین رہے۔ اس کے آس پاس نابھ اور جنید کی ریاستیں واقع تھیں۔ جب پاکستان بنا تو ہمارے خاندان کو ٹرین پر پاکستان کے لئے سوار کرا دیا گیا۔ اس کے بعد شہر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ کیتھل سے ٹرین نو بجے صبح روانہ ہوتی اور مغرب کے وقت کورکشیتر پہنچی۔ ایک گھنٹہ کا فاصلہ اتنے طویل وقت میں طے ہوا۔ راشٹریہ سیوک سنگھ (آر ایس ایس) کے غنڈے ہماری ٹرین پر ایک سیلاب کی مانند بڑھے اور لوٹ مار شروع کر دی۔ امرتسر کے قریب ایک ایسا پُل بھی آیا جس پر لوہے کے گارڈر لگے ہوتے تھے۔ جو لوگ ٹرین کی چھت پر بیٹھے تھے ان میں سے کئی ان گارڈروں سے ٹکرا ٹکرا کر گرے اور شہید ہو گئے۔

دے کے رہیں گے پاکستان

ریاست نابھہ کے گاؤں دھنولہ کے دس ہزار مسلمانوں کا ایک قافلہ بھی لٹی پٹی حالت میں پاکستان کی طرف عازم سفر ہوا۔ اس کے میر کارواں میرے والد صاحب کے سگے ماموں مولانا محمد نذیر عرشی تھے۔ مولانا عرشی ایک جیّد عالم اور علم دوست ہستی تھے۔ قافلہ کوچ کرنے ہی والا تھا کہ سکھوں اور ہندوؤں کا ایک گروہ آیا۔ اس نے ریاستی پولیس سے کچھ بات چیت کی۔ یہ لوگ سب کے سب مسلح تھے۔ اس گروہ نے مولانا عرشی کے فرزند مرزا یعقوب کو قافلہ سے کھینچ لیا۔ دس ہزار مسلمان انہیں خود سے بچھڑتے ہوئے دیکھتے رہے اور اُف تک نہ کی۔ احتجاج تک نہ کیا۔ پھر یہ دردناک منظر سب نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ مرزا یعقوب کے والد ماجد نے، ماں نے، بیوی نے، جگر گوشوں اور حقیقی بھائیوں نے بھی۔

ان درندوں نے مرزا یعقوب کی ناک کو کرپان کی نوک سے چھید کر اس میں نکیل ڈال دی اور یہ کہہ کر انہیں گھسیٹنے لگے۔ "دے کے رہیں گے پاکستان"۔

وہ مرزا یعقوب کو اسی حالت میں گھسیٹتے رہے۔ ان کے جسم کو بلموں، بھالوں اور کرپانوں سے کچوکے دیتے رہے۔ مرزا یعقوب کے بدن سے خون کے فوارے چھوٹتے رہے۔ مگر آفرین ہے نہ وہ چیخے نہ تلملائے حتیٰ کہ ان کا جسم ٹھنڈا ہو گیا۔ مرزا یعقوب کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ مسلم لیگی تھے اور قیام پاکستان کے پُرزور حامی تھے۔ وہ دھنولہ میں سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ جن لوگوں نے ان کے ساتھ بہیمانہ سلوک کیا ان میں سے بیشتر ان کے شاگرد رہ چکے تھے۔ اس قافلے میں سے بمشکل چھ ساڑھے چھ ہزار افراد بچے تھے اور ڈیڑھ سو کے قریب جوان بیٹیاں درندوں کے ہتھے چڑھ کر ہم سے بچھڑ گئی تھیں۔

یہ تمام واقعات نئی نسل کے لئے لمحہ فکریہ ہیں اور اس امر کی یاد دلاتے ہیں کہ ہمیں کیا

کی نعمت سونے کی طشتری میں رکھ کر پیش نہیں کی گئی تھی۔ یہ آزادی ملتِ اسلامیہ کی ان مسلسل کوششوں اور لگاتار قربانیوں کا ثمر ہے جو اس نے پاکستان کے جلیل القدر بانی حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ کی ولولہ انگیز قیادت میں پیش کی تھیں۔

کتنے عظیم تھے وہ دن ۔۔ اور کتنے بہادر اور قابلِ ستائش تھے وہ لوگ جنہوں نے عزّت، جان اور مال کی قربانی دے کر ہمیں پاکستان جیسا انمول تحفہ دیا۔ ہم سب کو وطنِ عزیز کی آزاد فضاؤں میں عزّت اور آسائش کی زندگی گزارتے وقت بانیؒ پاکستان کے فرمودات پر عمل کرنے اور نظریہ پاکستان کو جزوِ ایمان بنانے کا عہد کرنا چاہیئے اور ان لوگوں کی قربانیوں کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے جنہوں نے حصولِ پاکستان کی جدوجہد کو ساحلِ مراد تک پہنچا کر نہ صرف ہمیں انگریزوں، ہندوؤں اور سکھوں کی غلامی سے نجات دلائی بلکہ آزادی کی اس گراں قدر نعمت سے بھی مالا مال کیا جو صدیوں کی جدوجہد کے بعد کسی قوم کا مقدر بنتی ہے ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

○
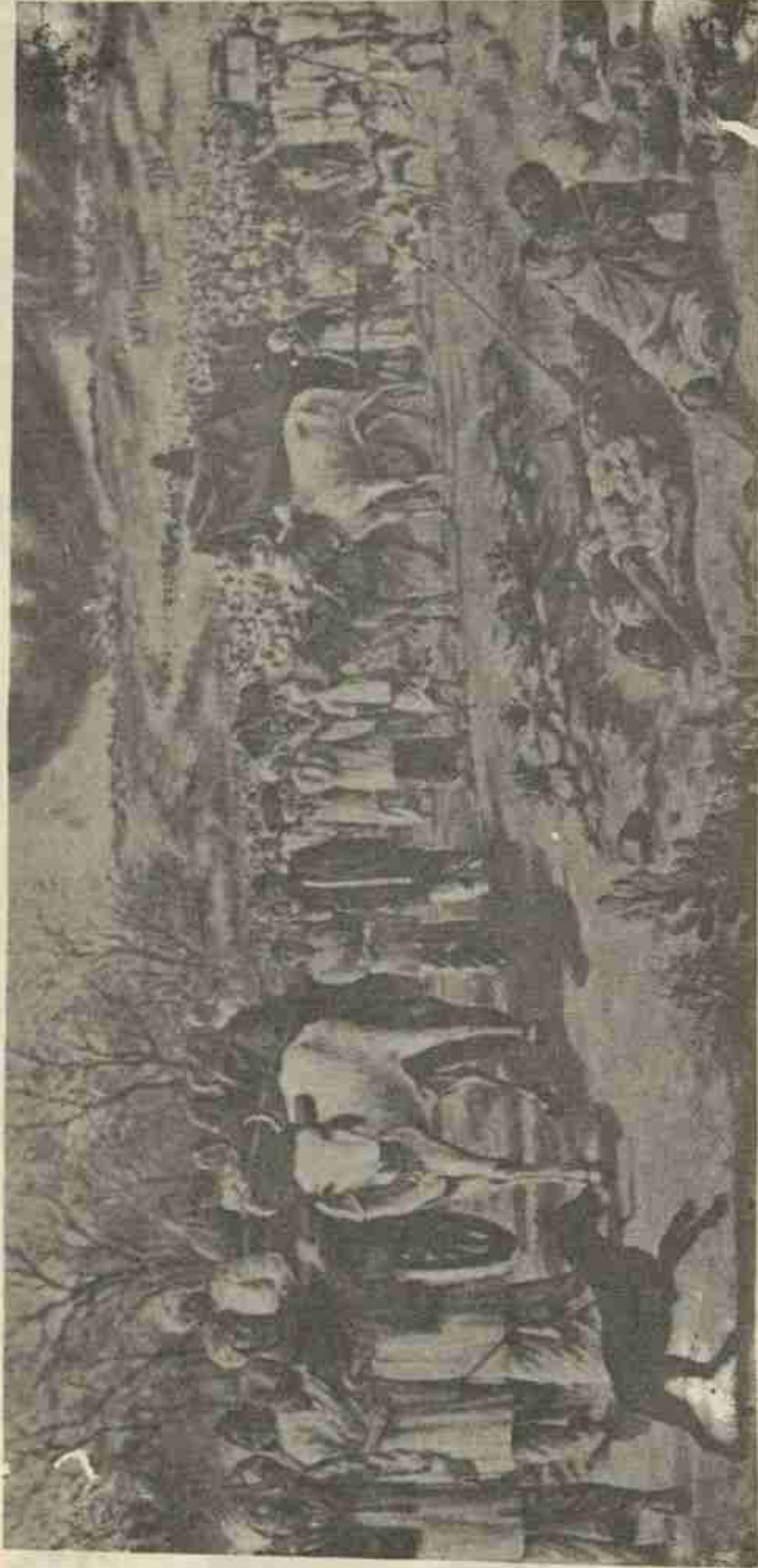
مہاجروں کا پیدل قافلہ آزادی کی قیمت ادا کرتے ہوئے پاکستان کی طرف رواں دواں ہے۔
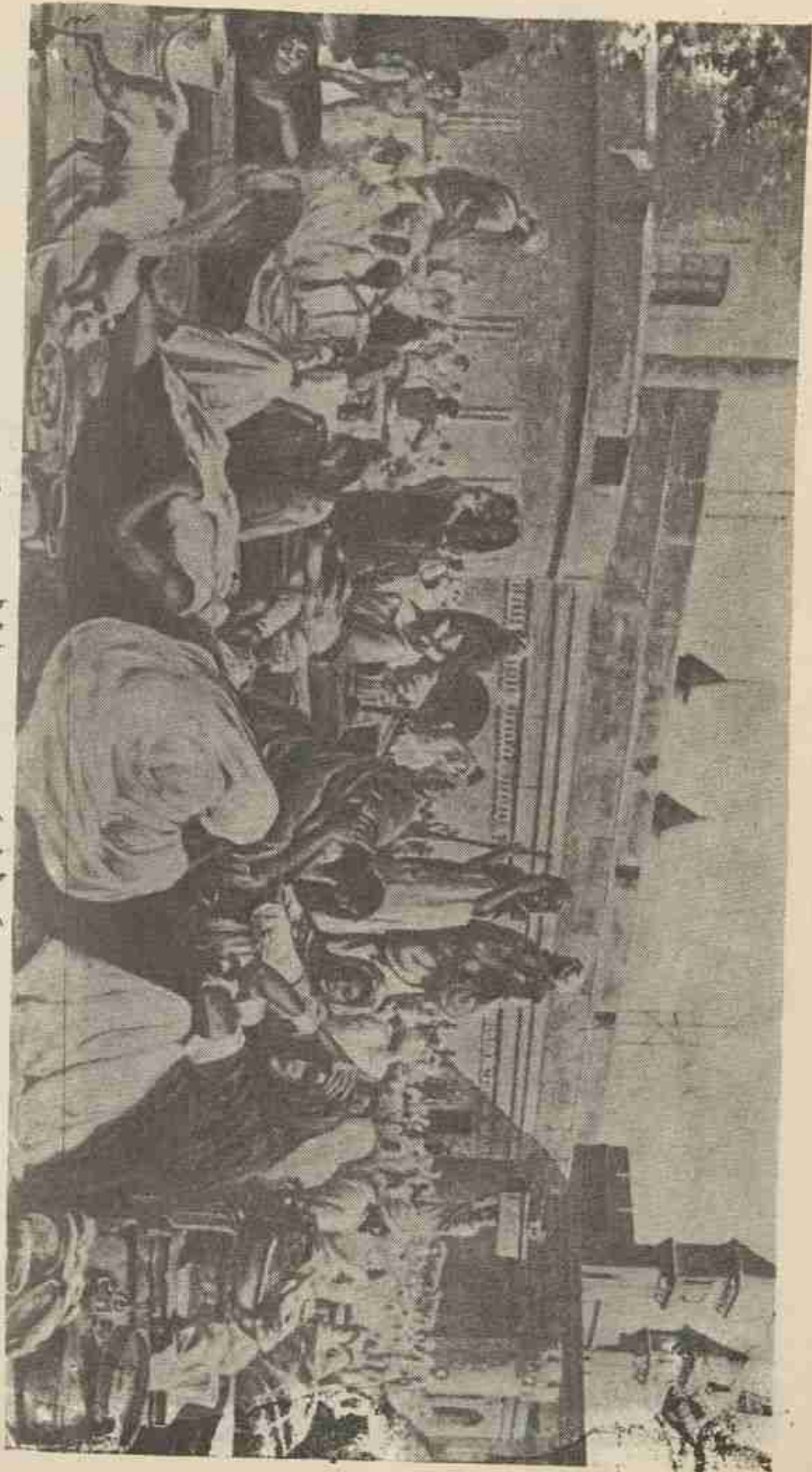
لاہور ریلوے سٹیشن کے باہر مہاجرین پڑاؤ ڈالے ہوتے ہیں

پیامِ عیش و مسرت ہمیں سناتا ہے
ہلالِ عید ہماری ہنسی اڑاتا ہے

ساتواں باب

پاکستان کی پہلی عید

پاکستان کو معرض وجود میں آتے ہوتے ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے لیکن اس عرصہ میں جتنی بھی عیدیں آئیں، ان کی آمد کے موقع پر اور عید کی خوشیاں مناتے وقت مجھے امرتسر کی وہ آخری عید الفطر کبھی نہیں بھولی جو قیام پاکستان کے تین روز بعد یعنی ۱۸ اگست ۱۹۴۷ء کے روز اسلامیان پنجاب کو دیکھنا نصیب ہوئی۔

لوگ کہتے ہیں وقت ہر زخم کا مرہم ہوتا ہے مگر میرے نزدیک بعض زخم ایسے ہوتے ہیں جو کبھی مندمل نہیں ہوتے اور ان کی کسک لازوال ہوتی ہے۔ نیز کتاب ہستی کے کچھ اوراق ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی بار بار ورق گردانی کو جی چاہتا ہے۔

اگست ۴۷ء میں برصغیر کی تقسیم کے موقع پر مشرقی پنجاب، دہلی، یوپی اور سی پی کے مسلمانوں کو آگ اور خون کے جس دریا سے گزر کر آنا پڑا اور ملت اسلامیہ کے اس مرحلہ پر اپنی روا آتی سادہ لوحی کی وجہ سے ہندو سکھ اور انگریز کی عیارانہ سازشوں سے جو دکھ اٹھاتے اور زخم سہے ان کی تفصیل اگرچہ المناک بھی ہے اور دردناک بھی مگر بعض زخموں کو کریدنے اور واقعات کو دہرانے میں ایک خاص لذت ہوتی ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کچھ ایسے ہی زخم آج میرے سینے میں ہرے ہو رہے ہیں اور میری آنکھوں کے سامنے وہ خونیں عہد گھوم رہا ہے جب مشرقی

پنجاب کے مسلمانوں کو کلمہ گوئی اور مطالبہ پاکستان کے جرم کی پاداش میں سنگینوں پر اچھالا جا رہا تھا۔ وہ بیدل قافلوں اور سپیشل ٹرینوں کی صورت میں پاک سرزمین کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان واقعات کا تصوّر کرتے ہی میری پلکوں پر عقیدت و احترام کے آنسوؤں کے جھلملاتے ستارے تحریکِ آزادی کے نامور اور گمنام شہیدوں، غازیوں اور اغوا شدہ مسلم بہنوں، بیٹیوں، ماؤں اور معصوم بچّوں کی قربانیوں کی یاد میں روشن ہو رہے ہیں اور آج عرصہ دراز کے بعد ایک مرتبہ پھر عیدالفطر کا چاند اگست کے مہینے میں طلوع ہو رہا ہے اور مجھے بازاروں اور گلیوں میں زندگی کی ہما ہمی اور گہما گہمی نظر آ رہی ہے۔ گلی میں چوڑیاں بیچنے اور خریدنے والوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں تو بے اختیار تقسیم کے موقعہ پر اغوا ہونے والی ۸۰ ہزار مسلمان خواتین کی عصمتوں کے لٹنے کا دلخراش منظر اور ان کے ننگے جلوس نکالنے والے بھیڑیوں کے مکروہ چہرے آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتے ہیں اور ان مظلوم و مجبور بہنوں اور ماؤں کے ہاتھوں کی ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑے میرے احساس میں نیزے کی اَنی کی طرح چبھ رہے ہیں اور میں یہ سطور تحریر کرتے ہوتے تقسیمِ برصغیر سے قبل کی دُنیا میں پہنچ گیا ہوں اور خود کو اپنے آبائی شہر امرتسر کی گلی کوچوں میں موجود پاتا ہوں۔ سوچتا ہوں وہ عید بھی اپنی نوعیت کی کتنی عجیب و غریب عید تھی۔ برصغیر کی آزادی کے بعد اس پہلی عید کے موقعہ پر نہ تو بچّوں نے گوٹے کناری والے کپڑے پہننے کا تقاضا کیا۔ نہ نئے جوتے خریدنے کی فرمائش کی۔ نہ لڑکیوں نے روایتی انداز میں مہندی لگائی۔ نہ عید کارڈوں اور تحفوں کا تبادلہ ہوا۔ نہ کسی کو میٹھی سوّیاں کھانے یا پکانے کا دھیان آیا اور نہ ہی کسی نے عیدی مانگی۔ کیونکہ ان کی مسرّت بھری زندگی میں تو زہر گھول دیا گیا تھا۔ وہ عید کی خوشیاں مناتے تو کس طرح؟ ان کی جوان بیٹیاں اغوا ہو چکی تھیں۔ مکانات جلائے جا رہے تھے اور انہیں اس انوکھی اور نرالی عیدالفطر پر خونِ دل پینے اور لختِ جگر کھانے کو دیا جا رہا تھا۔ معصوم بچوں کو برچھوں پر اچھالا جا رہا تھا۔ جو بولے سو نہال، ست سری اکال اور "جے ہند" کے بھیانک نعرے بلند ہو رہے تھے۔ ریاستی فوج، اکالی درندے اور جن سنگھی غنڈے مسلمانوں کو پاکستان پہنچانے کے

ذو معنی نعرے لگا رہے تھے۔

عید کا دن اور بھنگیوں کا لباس

آزادی کی جس صبح کا نظارہ دیکھنے کے لئے اسلامیانِ امرتسر نے جلیانوالہ باغ کے واقعہ سے لے کر تحریکِ پاکستان کی جدوجہد تک بے مثال قربانیاں دی تھیں۔ آزادی کے سورج نے طلوع ہوتے ہی ان کے گھروں میں گھی کے چراغوں کی جگہ صفِ ماتم بچھا دی تھی۔ آخری انگریز وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ۳ جون ۱۹۴۷ء کے روز جب برِصغیر کی تقسیم کے منصوبے کا اعلان کیا تو اس اعلان میں امرتسر کی پاکستان میں شمولیت اگرچہ مشتبہ تھی مگر چونکہ مسلم اکثریتی ضلع گورداسپور مبینہ طور پر پاکستان میں تھا اس لئے امرتسر کے مسلمانوں کو بجا طور پر توقع تھی کہ اگر گورداسپور پاکستان میں آ رہا ہے تو امرتسر ضرور پاکستان کے حصے میں آئے گا۔ اسی خیال سے اسلامیانِ امرتسر نہتے ہونے کے باوجود اکالی درندوں اور جن سنگھی غنڈوں کا بے جگری کے ساتھ مقابلہ کر رہے تھے اور اپنے گھروں کو خیرباد نہیں کہہ رہے تھے کہ اچانک ۱۰ اگست ۱۹۴۷ء کے روز امرتسر کے مسلمان پولیس ملازمین سے اسلحہ واپس لے لیا گیا اور طے شدہ پروگرام کے مطابق گورکھا فوج اور ریاستی فوج نے مقامی مہاسبھائی غنڈوں کے ساتھ مل کر امرتسر کے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کرنا شروع کر دیا۔ انتظامیہ کی اس عیارانہ اور مکارانہ حرکت سے اسلامیانِ امرتسر کا ماتھا ٹھنکا اور انہوں نے بدلے ہوتے حالات میں پاکستان کا رُخ کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ مسلم لیگ، انجمن اسلامیہ امرتسر اور دیگر رفاہی اداروں کی طرف سے قائم کئے ہوتے ریلیف کیمپوں میں لوگ منتقل ہونے لگے۔ شہر کے اندرونی حصہ کے مسلمان بلوچ رجمنٹ کی نگرانی میں قائم ہونے والے ریلیف کیمپ (چھاؤنی) اور امرتسر ریلوے سٹیشن کی طرف بے سروسامانی کے عالم میں روانہ ہونے لگے۔ ان مقامات تک پہنچنے کے لئے انہیں بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑا اور کئی خاندان تو اپنے عزیز واقارب کی لاشوں کو نہ صرف بے گور و کفن چھوڑ کر بلکہ ان پر چل کر برائے نام عافیت کے گوشوں تک پہنچے۔ رام باغ

آغا علی خاں جنہوں نے عید کے
روز بھنگیوں کا لباس پہن کر
اپنی جان بچائی

امرتسر ریلوے سٹیشن کا پلیٹ فارم نمبر ا جو عید کے موقعہ پر اسلامیانِ امرتسر کے خون میں ڈوبا ہوا تھا

گولڈن ٹمپل امرتسر کے احاطہ میں واقع سکھ میوزیم کی عمارت جس میں مغلیہ دور کے مسلمان حکمرانوں کے مفروضہ
مظالم کی اشتعال انگیز پینٹنگ آویزاں ہیں - کاش مینارِ پاکستان کے قریب بھی اس قسم کی گیلری ہوتی؟

پولیس سٹیشن کے سامنے والی گلی کوچہ پانڈیاں کے آغا علی خاں مرحوم اس محلے کے ایک ویران اور تاریک مکان میں چھپے رہے اور عین عید کے روز بھنگیوں کا لباس پہن کر صبح سویرے ہاتھ میں جھاڑو اور سر پر گندگی کا ٹوکرا اٹھا کر شریف پورہ کیمپ تک پہنچے جہاں سے مہاجرین کو پاکستان لے جانے کے لئے حکومت پاکستان کے زیر انتظام سپیشل ٹرینیں چل رہی تھیں۔ آغا علی خاں امرتسر کے کھاتے پیتے گھرانے کے چشم و چراغ تھے اور تحریک پاکستان کے پرجوش کارکن تھے۔ قیام پاکستان کے بعد انہوں نے ایک روز راقم سے کہا تھا کہ جس سر پر عید کے روز قراقلی ٹوپی رکھتا تھا۔ جس بدن پر نفیس قسم کے سوٹ اور رو گھوڑا بوسکی کا لباس پہنتا تھا اور جن ہاتھوں سے قرآن پاک کے مقدس اوراق کی ورق گردانی کرتا تھا۔ عید کے دن اپنی جان بچانے کے لئے انہی ہاتھوں سے گندگی کے ٹوکرے تک اٹھانے پڑے

شیخ صادق حسن اور سید عطا اللہ شاہ بخاری

امرتسر جیسا شہر جس کے در و دیوار نے جلیانوالہ باغ کے سانحہ کے موقعہ پر ہندوؤں سکھوں اور مسلمانوں کو ایک ہی پیالے میں پانی پیتے اور جنرل ڈائر کی گولیوں کے سامنے سینے تان کر آزادی کے نعرے بلند کرتے دیکھا تھا۔ آج اسی شہر کے دروازے مسلمانوں کے لئے بند ہو رہے تھے اور ہندو سکھ مسلمانوں کے خون سے اس کے در و دیوار پر ایک نیا مضمون تحریر کر رہے تھے۔ اور ان کی مذموم حرکتوں نے ان کے ان گھناؤنے عزائم کا پردہ چاک کر دیا تھا جس کا قائد اعظمؒ کی دوربین نگاہوں نے بروقت نوٹس لے کر مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ وطن کا مطالبہ کیا تھا۔
امن و آشتی کے گیت گانے والے ہندو سکھ خونخوار بھیڑیوں کا روپ دھار چکے تھے۔ انہوں نے وہ سب کچھ بھلا دیا تھا جو اُن کے مذہبی رہنماؤں کرشن جی اور بابا گرو نانک نے انہیں انسانیت کی فلاح اور عظمت کو پہچاننے کے لئے پڑھایا تھا۔ سیتلا مندر اور گولڈن ٹمپل جیسے مذہبی مراکز بھی قاتلوں کی آماجگاہ بن گئے تھے اور وہاں برسرِ عام مسلمانوں کے قتل عام
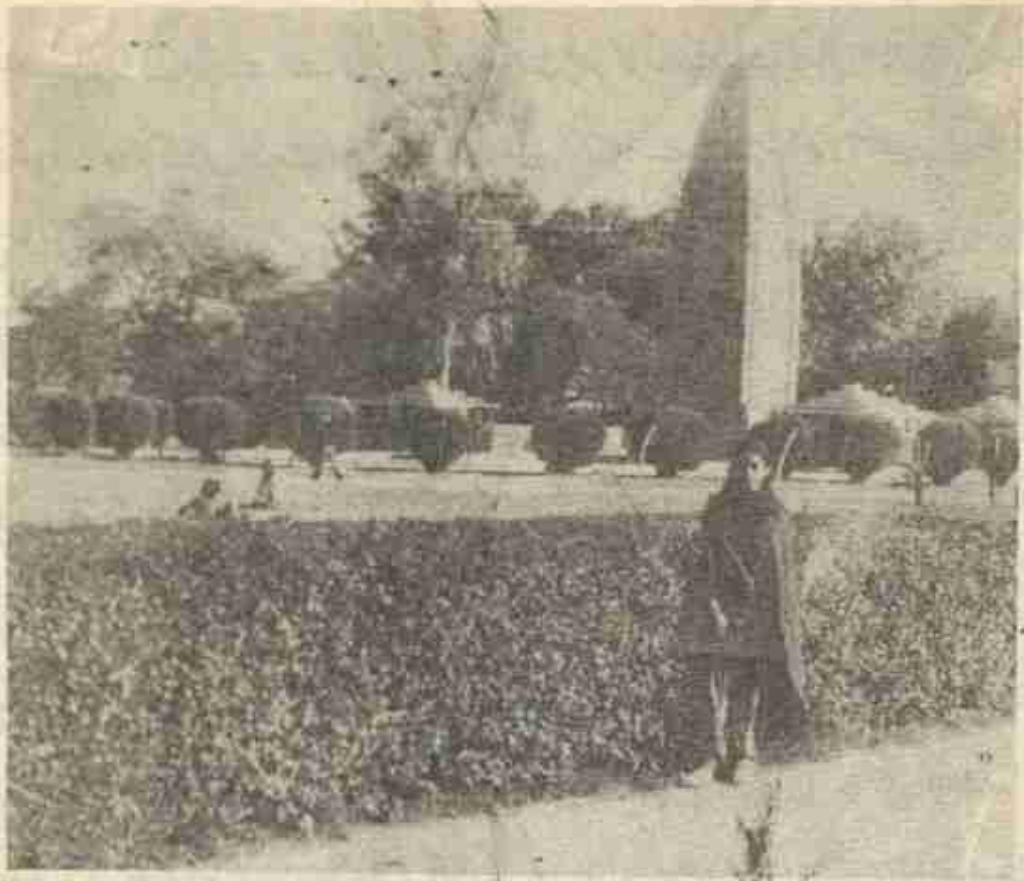
جلیانوالا باغ کا اندرونی منظر جہاں ۱۹۱۹ء میں جنرل ڈائر کی گولیوں کے سامنے حسول آزادی کیلئے سینے تانے گئے

جلیانوالہ باغ کے سانحہ کے رد عمل کے طور پر مشتعل شہریوں نے چوک کیلی والا کا چارٹرڈ بنک لوٹ لیا۔

کے منصوبے بناتے جا رہے تھے۔ لوگوں کے جذبات بھڑکانے کے لئے پاکستانی علاقوں میں مسلمانوں کے مفروضہ مظالم کے من گھڑت اور فرضی قصے بیان کئے جاتے تھے۔ ہندوؤں سکھوں کی نظروں میں مسلم لیگی لیڈر شیخ صادق حسن، احراری لیڈر سیّد عطا اللہ شاہ بخاری، شیخ حسام الدین غازی عبدالرحمان اور خواجہ محمد ذکریا کچلو کا امتیاز مٹ چکا تھا۔ جس طرح شیخ صادق حسن اور میر انور سعید محمود پاکستان کی حمایت کی وجہ سے ہندوؤں سکھوں کے نزدیک قابلِ گردن زدنی تھے بالکل اسی طرح سید عطا اللہ شاہ بخاری، شیخ حسام الدین، غازی عبدالرحمان اور خواجہ محمد ذکریا کچلو بھی کلمہ گوئی کے جُرم کی پاداش میں واجب القتل گردانے گئے۔ یہی وجہ تھی کہ تقسیم ہندوستان کے موقعہ پر جہاں شیخ صادق حسن اور دوسرے مسلم لیگی اصحاب اپنی جانیں بچانے کے لئے پاکستان چلے آئے وہاں سیّد عطا اللہ شاہ بخاری جیسے نیشنلسٹ لیڈر بھی ہندوؤں سکھوں کی "نمائشی محبّت" کی قلعی اترتے دیکھ کر اس گوشۂ عافیت (پاکستان) میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے جس کے قیام کی وہ بھرپور مخالفت کیا کرتے تھے

خونِ مسلم کی ارزانی کا یہ عالم تھا کہ امرتسر کا کوئی کونہ ایسا نہ تھا جہاں مسلمانوں کی لاشیں بے گور و کفن نہ پڑی ہوں۔ قانون کے تحت ساری پابندیاں صرف مسلمانوں تک محدود تھیں۔ چنانچہ کرفیو کے اوقات کے دوران ہندو غنڈے اور سکھ درندے بر سرِ عام دندناتے پھرتے تھے مگر مسلمانوں پر اپنے عزیز و اقارب کے کفن دفن پر بھی پابندی عائد تھی چنانچہ بعض مقامات پر مسلمانوں نے اپنے گھروں میں گڑھے کھود کر اپنے شہید بھائیوں اور بہنوں کو سپردِ خاک کیا۔ کوچہ ڈبگراں کے خواجہ فیض (جو خواجہ امین حال مقیم رام گلی لاہور کے بڑے بھائی تھے اور یہاں سنگھ گیٹ کے باہر لکڑیوں کے ٹال کے مالک تھے) سابق فوجی ہونے کی وجہ سے لال حویلی کی چھت پر بندوق تھامے اوڈپی کا کام کر رہے تھے کہ بھارتی فوج کے ایک دستے نے ان کو گولی مار دی۔ اسی طرح اس محلّے کے ایک دوسرے نوجوان اسلم ارائیں بھی بھارتی فوجیوں کی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ چنانچہ اہلِ محلّہ نے ان دونوں شہیدوں کو کوچہ ڈبگراں کی مسجد القدس

کے صحن میں دفن کر دیا۔

ٹرو کا میلہ

امرتسر کی ان عیدگاہوں میں وحشت برس رہی تھی جن میں عید کے موقع پر میلے ٹھیلے کا سماں ہوتا تھا۔ لوگ جوق در جوق اپنے معصوم بچوں کو گود میں اٹھائے اور انگلیاں تھامے نماز عید پڑھنے جایا کرتے تھے اور نماز کے بعد بچھڑی ہوئی سہیلیوں کی طرح ایک دوسرے سے گلے ملتے تھے جس سے دلوں کی کدورتیں دُھل جاتی تھیں۔ لیکن یہ کیسی عید تھی جس میں عید کی نماز تو درکنار۔۔ نماز جنازہ بھی پڑھنے کی اجازت نہ تھی۔

امرتسر کے وہ گلی کوچے جن میں عید کی نماز کے بعد معصوم بچے رنگ برنگے غباروں سے کھیلتے تھے۔ اسلامیانِ امرتسر کے خون میں ڈوبے ہوتے تھے۔ امرتسر کا سکتری باغ اداس تھا۔ ویران تھا۔ کیونکہ عید کی آمد سے چند روز قبل اس باغ میں ٹرو کے میلے کی تیاریاں شروع ہو جاتی تھیں۔ لوگ دُور دراز سے آکر اس باغ میں دوکانیں سجاتے تھے۔ بچوں کے لئے جھولے لگتے تھے۔ کھیل تماشے ہوتے تھے اور ٹرو کے روز امرتسر کے تمام مسلمان اپنے بال بچوں کو لے کر سکتری باغ میں پہنچ جاتے تھے۔ کہیں گنجے منڈیاں والے کا مجمع اور موت کا کنواں لوگوں کی دلچسپی کا مرکز ہوتا تھا تو کہیں نٹوں کے تماشے اور کھلونوں کی دوکانوں پر بچوں کے ٹھٹھ لگے ہوتے تھے

مسلمانوں کے اس پُرمسرت تہوار کے موقع پر امرتسر کے کمپنی باغ، پردہ کلب اور ٹھنڈی کھوئی پر بھی خوب رونق ہوتی تھی مگر آج سکتری باغ کی طرح کمپنی باغ کا سہاگ بھی لٹ چکا تھا۔ ٹھنڈی کھوئی کی خوبصورت مسجد خواجہ صاحب شہید ہو چکی تھی اور پردہ کلب بھی ویران تھی اور اس کے آس پاس کی شاہراہوں پر مسلمانوں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ کوئی ان کو نہلانے، کفنانے، دفنانے اور اٹھانے والا نہیں تھا۔ کوچہ رنگریزاں کی جن غیرت مند دوشیزاؤں نے حملہ آوروں سے اپنی عزت بچانے کے لئے مسجد کے کنوئیں میں چھلانگیں لگائی تھیں۔ ان کی

عشتیں کنوئیں میں تیر رہی تھیں۔

اسلامیانِ امرتسر اپنی ماؤں، بہنوں اور بہو بیٹیوں کو ہندو سکھ غنڈوں کی ہوسناک نظروں سے بچاتے پاکستان کا رُخ کر رہے تھے۔ عید کے روز جن لڑکیوں کے ہاتھوں اور پاؤں میں مہندی کی سرخیاں رچی ہوتی تھیں آج وہی ہاتھ پاؤں ان کے عزیز و اقارب کے خون سے تر ہو رہے تھے۔ امرتسر اور لاہور کی درمیانی جرنیلی سڑک پر سکھ وحشیوں کے مشتعل ہجوم مسلمانوں پر اندھا دُھند گولیاں برسا رہے تھے۔ امرتسر ریلوے سٹیشن کے تمام پلیٹ فارم اور پٹڑیاں مسلمانوں کے خون میں نہاتی ہوتی تھیں۔ یہ عید کہاں تھی یہ تو ہولی کا تہوار تھا جس میں خونِ مسلم سے دِل کھول کر ہولی کھیلی جا رہی تھی۔

مندرجہ بالا سطور سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اگر عید کے روز امرتسر کے مسلمانوں کی یہ حالت تھی تو بھارتی پنجاب کے دوسرے شہروں، قصبات اور دیہات میں نہتے اور بے بس مسلمانوں نے یہ عید کس طرح گزاری ہو گی؟

لاشوں پر خواتین کا رقص

ممتاز بزرگ صحافی جناب وقار انبالوی (جو نوائے وقت میں "سرِ راہے" کا کالم لکھتے ہیں) اس کتاب کے مصنف کے نام ایک مکتوب میں جالندھر کے مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انہی دنوں مغربی پنجاب سے ایک ہندو ڈپٹی کمشنر (جس کا نام سکھانند تھا) گوجرانوالہ کے مسلمانوں کے بدلے ہوئے تیور بھانپ کر جالندھر تبدیل ہو کر آگیا۔ باؤنڈری کمیشن کے اعلان تک وہ جالندھر کے مسلمانوں کو اِکاّ دُکاّ قتل کراتا رہا لیکن ۱۸ اگست ۱۹۴۷ء کے روز عید الفطر تھی۔ اس روز خوف و خطر کی فضاؤں میں جالندھر کے مسلمان ہزاروں کی تعداد میں عید کی نماز ادا کرنے کے لئے عید گاہ میں جمع تھے اور ابھی پہلی رکعت میں سجدہ ریز ہوتے ہی تھے کہ ہندوؤں سکھوں نے تلواروں، گنڈاسوں، برچھیوں اور بندوقوں

سے مسلح ہوکر ان پر حملہ کردیا اور آن واحد میں سینکڑوں مسلمانوں کے سرتن سے جدا کر دیتے جو اس وحشیانہ حملے سے جان بچا کر عید گاہ سے باہر بھاگے انہیں بھالوں کی نوک پر دھر لیا۔ اس طرح جالندھر کی عید گاہ لاشوں سے پٹ گئی۔ اس کے بعد سکھا نند ڈپٹی کمشنر کی سربراہی میں فرقہ پرست ہندو سکھ طے شدہ پروگرام کے مطابق جالندھر کے آسودہ حال اور ذی اثر مسلمانوں کے گھروں سے زبردستی پردہ نشیں عورتوں کو گھیر کر عید گاہ تک لاتے۔ یہاں ان کے برقعے اور ان کی چادریں ہی سروں سے نہ اتاریں بلکہ ان کے لباس اتار کر انہیں ننگا کر دیا اور ان کو حکم دیا کہ وہ اپنے مُردوں کو عید کی مبارک باد کہیں اور قیامِ پاکستان کی خوشی میں ان کی لاشوں کے آس پاس رقص کریں۔

یہ وحشیانہ سلوک اور سنگدلانہ کارروائی ایسی تھی کہ جس کی انسانی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ شوہروں، بھائیوں اور بیٹوں کی لاشوں پر ان کو رونے بھی نہ دیا گیا۔ برہنہ حالت میں حیا کی ماری عورتیں جب سکڑنے سمٹنے اور ایک دوسری کے ساتھ لپٹنے لگتیں تو ان کو بھالوں کی نوک چبھو چبھو کر نہ صرف ایک دوسری سے الگ کیا جاتا۔ بلکہ جگر کے اور پکو کے اس طرح دستے جاتے کہ وہ تڑپنے لگتیں اور قاتل قہقہے لگاتے۔

مولانا وقار انبالوی کے بیان کے مطابق انہی دنوں ان کے فرزند عارف وقار (جن کی اس وقت عمر بمشکل ڈیڑھ برس تھی) کو وحشیوں نے اس وقت برچھے کی نوک پر اچھالا تھا جب اسے شدید بخار کی حالت میں ڈاکٹر کے پاس لے جایا جا رہا تھا۔ وقار صاحب کے فرزندِ ارجمند خدا کے فضل سے بقیدِ حیات ہیں اور آجکل لاہور ٹیلی ویژن سٹیشن میں ملازم ہیں۔ ان کے جسم پر برچھے کا نشان آج بھی موجود ہے اور ان پر ڈھائے جانے والے ظلم کی گواہی دے رہا ہے۔

پاکستانی مسلمانوں کے لئے عید کا تحفہ

دشمنانِ پاکستان کی درندگی اور سنگدلی ملاحظہ ہو کہ ۸۰ ہزار کے قریب مسلمان دوشیزاؤں

کو اغوا کرنے اور لاکھوں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنے کے باوجود ان کے غیض و غضب کی آگ ٹھنڈی نہیں ہو رہی تھی اور وہ مسلمانوں کو کلمہ گوئی اور علیحدہ وطن کا مطالبہ کرنے کے جرم کی پاداش میں اذیتیں دینے کے نت نئے ستم ایجاد کر رہے تھے۔ انہوں نے عید کے موقع پر ہندوستان سے لاہور آنے والی ایک مال گاڑی کے ڈبے میں مسلمان عورتوں کی کٹی ہوئی چھاتیاں، معصوم بچوں کی گردنیں اور کٹے ہوئے ہاتھ عید کے تحفے کے طور پر اسلامیانِ پاکستان کو ارسال کئے۔ جب وہ ڈبہ لاہور کے ریلوے سٹیشن پر پہنچا تو اُس پر "پاکستانی مسلمانوں کے لئے عید کا تحفہ" کے اشتعال انگیز الفاظ لکھے ہوئے تھے۔

بھارت کے ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کے ساتھ جو انسانیت سوز سلوک کیا وہ کسی عارضی گمراہی اور ہنگامی جنون کا نتیجہ نہیں تھا۔ بلکہ یہ ان کی سرشت اور ذہنیت کا ایک بھیانک مظاہرہ تھا۔ اس سرشت اور ذہنیت کا جس کا دسمبر ۱۹۷۱ء میں سقوطِ مشرقی پاکستان کے موقعہ پر نہرو کی بیٹی اندرا گاندھی نے ان الفاظ میں اظہار کیا تھا۔

"ہم نے مسلمانوں سے ایک ہزار سالہ تاریخ کا بدلہ لے لیا ہے۔"

اسلامیانِ پاکستان سے ایک ہزار سالہ تاریخ کا بدلہ لینے والی اندرا گاندھی بھارت کی وزارتِ عظمیٰ کے منصب پر دوبارہ فائز ہو چکی ہیں۔ مسلمانوں کے ساتھ ان کا معاندانہ سلوک کوئی سربستہ راز نہیں ہے اور نہ ہی ان کے خاندان کی مسلم دشمنی کسی تعارف کی محتاج ہے۔ افسوس ہے تو اس بات کا کہ ہماری نئی نسل نے ہندو کے ہونٹوں کی مسکراہٹ دیکھی ہے اس کے دل میں چھپے ہوئے جہنم کو نہیں دیکھا۔

ہائے اس زُود پشیماں کا پشیماں ہونا

یہ تو ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہمیں قائداعظمؒ جیسے بے لوث لیڈر کی بصیرت افروز قیادت مل گئی اور ہم ہندوؤں کے بچھائے ہوئے ہمرنگِ زمیں دام میں گرفتار ہونے سے بچ گئے

ورنہ ہمارا حال بھی بھارت کے ان سکھوں جیسا ہوتا تھا جو ہندو کی مصنوعی دوستی اور چکنی چپڑی باتوں پر اعتماد کر کے اپنے گلے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہندو کی غلامی کا طوق پہن چکے ہیں اور ان کی نئی نسل غلامی کی ان زنجیروں کو توڑنے اور سکھ سٹیٹ کے قیام کی جدوجہد میں مصروف ہے۔

کاش سکھ قوم ۱۹۴۷ء میں ہندوؤں کی شاطرانہ چالوں اور ماسٹر تارا سنگھ جیسے ناعاقبت اندیش لیڈروں کی باتوں میں نہ آتی تو ۱۹۸۰ء میں سکھ یاتریوں کے لیڈر سردار بلدیو سنگھ[1] کو یہ کہنے کی ضرورت نہ پڑتی کہ مسلمانوں کو ان کی قربانیوں کے عوض پاکستان اور ہندوؤں کو بھارت کی شکل میں آزادی ملی لیکن سکھوں کو کیا ملا؟

سردار بلدیو سنگھ کے اس معنی خیز سوال کے متعدد جواب میرے حافظے کی سطح پر ابھر آتے ہیں لیکن ایک مختصر سا جواب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ بھارت کے سکھوں کو مکافاتِ عمل کے طور پر وہی کچھ ملا جو ان کے غلط اندیش لیڈروں نے تقسیم ہندوستان سے قبل اپنے ہندو آقاؤں کی سرپرستی میں بویا تھا۔

مندرجہ بالا حالات اور واقعات کا گاہے گاہے تذکرہ قیام پاکستان کے مقاصد کو اُجاگر رکھنے، تاریخی دشمنوں کے عزائم سے باخبر رہنے اور نئی نسل کو آزادی کی صحیح قدر و قیمت کا احساس دلانے کے لئے ازحد ضروری ہے تاکہ نئی پود اسلام اور پاکستان کے دشمنوں کے مکروہ چہروں کو ان کے اصلی رُوپ میں دیکھ سکے۔

○

---

[1] سردار بلدیو سنگھ اپریل ۱۹۸۰ء میں بیساکھی کے میلے کے موقع پر پاکستان آنے والے ہزاروں سکھ یاتریوں کے جتھہ کے لیڈر تھے۔ انہوں نے لاہور میں چودھری ظہور الٰہی کی طرف سے دی گئی استقبالیہ دعوت میں تقریر کرتے ہوئے سکھوں کی محرومیوں کی بابت یہ بات کہی تھی۔
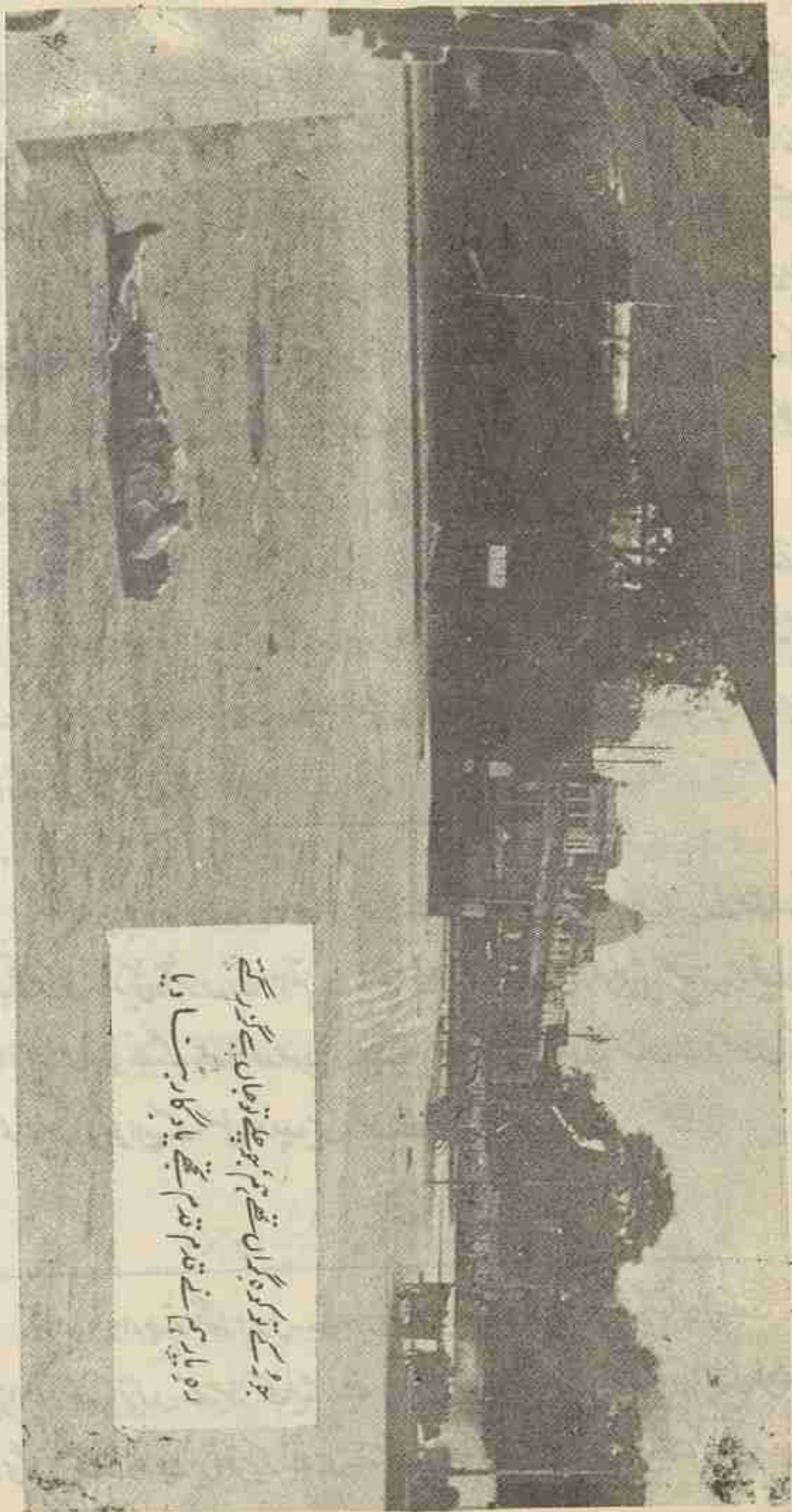
امرتسر ریلوے سٹیشن کے باہر ایک مسلمان کی لاش بے گور و کفن پڑی ہے۔

پاکستانی ۔ بھول نہ جانا

یہ عید کہاں تھی یہ تو قیامت کا دن تھا ——— امرتسر ریلوے سٹیشن کے باہر مسلمان شہداء کی لاشیں ٹھیلے پر لاوارث پڑی ہیں۔

آزادی

طاہر محمود قریشی

○

کیا ہے آزادی؟ کوئی سمجھتا نہیں
جانتا ہی نہیں
سوچتا بھی نہیں
شاید اس واسطے کہ ہمیں مل گئی
اپنے اجداد سے
ایک بیکار شے
ایک ایسا چمن
جو کسی نے لگایا اور اس کا ثمر
ہم بڑے شوق سے کھا رہے ہیں مگر
یہ سمجھتے نہیں
سوچتے ہی نہیں
اس چمن کے گل و رنگ و بو کے لئے
کتنے افراد نے

اپنے دامن کی خوشیوں کے خوں ہوتے گئے
کتنی ماؤں کے لختِ جگر کٹ گئے
کتنے مدفن بنے
عصمتیں لُٹ گئیں، خوں کے دریا بہے
آرزوؤں کے کتنے محل جل گئے
اوران کا دھواں
ہر طرف پھیل کر
یاس و حسرت کی اک داستاں بن گیا
اک زباں بن گیا
اپنا سب کچھ لُٹا کر سرِ راہ پھر
"درد کے قافلے
سُوئے منزل چلے"
امن کی سرزمیں اک چمن کی طرف
اک وطن کی طرف
اور
ایک ہم ہیں کہ کچھ جانتے ہی نہیں
سوچتے ہی نہیں

تعارفی تقریب کا آنکھوں دیکھا حال

بشکریہ ہفت روزہ چٹان لاہور

۲۹ ستمبر ۱۹۸۰ء

کیبانہ کے خوبصورت لان میں مہمانوں کی آمد جاری ہے کچھ پیدل، کچھ کاروں پر آ رہے ہیں ان میں ادیب، شاعر، صحافی، سرکاری ملازمین، نوجوان طالب علم، تحریک پاکستان کے پرانے کارکن سبھی ہیں۔ یہ لوگ خواجہ افتخار کی کتاب "جب امرتسر جل رہا تھا" کی تقریب رونمائی میں شرکت کے لئے آتے ہیں۔ ہوٹل کے گیٹ سے پنڈال تک سرخ چٹائی کی روش ہے۔ ایک جانب قومی پبلشرز کی طرف سے ادارے کے دو رکن کتابوں کا سٹال لگاتے ہوتے ہیں۔ خواجہ افتخار مہمانوں کا استقبال کر رہے ہیں۔ مہمان رفتہ رفتہ آ رہے ہیں۔ لان میں پھیلی ہوئی نشستیں آہستہ آہستہ پر ہو رہی ہیں۔ ادارہ اشاعت حکایات ملی کے کارکن مہمانوں کو کتاب کا بروشر تقسیم کر رہے ہیں۔ اگلی نشستوں پر مسٹر جسٹس آفتاب فرخ، مسٹر مجید نظامی، چودھری ظہور الٰہی، میاں زاہد سرفراز، میاں شجاع الرحمٰن، شیخ منظور الٰہی، امیر عبداللہ خان روکڑی، چودھری محمد الیاس، مسٹر عارف نظامی، بیگم سلمیٰ تصدق حسین، محترمہ فاطمہ صغریٰ اور دوسرے زعماء بیٹھے ہیں۔

اجلاس کی باقاعدہ کارروائی پونے پانچ بجے شروع ہوئی۔ صاحب سٹیج جناب ضیاالاسلام انصاری ایڈیٹر روزنامہ "مشرق" تھے۔ تلاوت کے بعد معروف شاعر جناب طفیل ہوشیارپوری نے ملی نغمے نذر سامعین کئے۔ صدر تقریب جسٹس نسیم حسن شاہ نے کہا کہ قائد اعظم محمد علی جناح کی قیادت میں تحریک پاکستان کی جدوجہد میں امرتسر کے مسلمانوں نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ نئی نسل کو اس تاریخی پس منظر سے آگاہ کرنا بہت ضروری ہے۔ انہوں نے کہا کہ کوئی انقلاب اس وقت تک کامیاب نہیں ہوتا جب تک اس میں زندگی کے ہر شعبے کے لوگوں کی تعداد میں اشتراک شامل نہ ہو

اس وقت ہماری صفوں میں ایسے نوجوان شامل ہیں جن کی وجہ سے وطن کا مستقبل درخشاں ہے۔
صدر تقریب کے مختصر خطاب سے پہلے مہمان خصوصی جسٹس ذکی الدین پال نے کہا، اگر ہم اُن عوامل پر غور کریں جو پاکستان کی آزادی کی تحریک میں مسلمانوں کی قربانیوں کا باعث بنے تو ہمیں پتہ چلے گا کہ وہ مقصد عظیم کیا تھا جس کے لئے مسلمانانِ ہند نے جانی اور مالی قربانیاں دیں۔ مسلمانوں نے صرف اسلام کی بقا اور احیا کے لئے قربانیاں دی تھیں۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ پاکستان میں معاشی، صنعتی اور معاشرتی شعبے میں ترقی ہونی چاہئیے کیونکہ یہی عالم اسلام اور ہماری بقا کی علامت ہے۔

پروفیسر مرزا محمد منور کا خطاب بڑا عالمانہ اور خوبصورت ہوا کرتا ہے۔ آج بھی وہ ہندو کی روایتی مسلم دشمنی کا تذکرہ کر رہے تھے۔ وہ ہندو کی منافقت اور لفظ لالہ کو معنوی انداز میں سمجھا رہے تھے۔ انہوں نے کہا "بھارت میں ہونے والے مسلم کش فسادات کے سلسلے میں علی گڑھ اور مراد آباد امرتسر ہی کا ایک حصہ ہیں۔ یہ علاقے اسی وجہ سے جل رہے ہیں جس وجہ سے امرتسر جلا تھا۔ ہمیں ہندو دشمنی کا مقابلہ کرنے کے لئے مستعد رہنا چاہئیے متحد ہو جانا چاہئیے اگر ہم متحد ہیں تو روس جیسا ملک بھی اپنے عزائم میں کامیاب نہیں ہو سکتا"
شعبہ صحافت پنجاب یونیورسٹی کے چیئرمین جناب مسکین علی حجازی نے کتاب اور صاحب کتاب کے بارے میں فرمایا "کتاب دراصل بربریت و وحشت کی داستان ہے جو مسلمانوں پر ڈھائے گئے۔ یہ مظالم کی کہانی ہے یہ مسلمانوں کی ان قربانیوں کی داستان ہے جو انہوں نے حصول پاکستان کے لئے دیں۔ یہ کتاب اسی موضوع پر لکھی جانے والی اور کتابوں سے اس لحاظ میں منفرد ہے جس میں فاضل مصنف نے واقعات کو حقیقت کا رنگ دیا ہے۔ اس کتاب میں قوم کو جہاد کا سبق دیا گیا ہے۔ ایک عرصے کے بعد اس موضوع پر ایک اچھوتی کتاب لکھنے پر مصنف مبارکباد کے مستحق ہیں۔
ایڈیٹر "بادبان" جناب مجیب الرحمٰن شامی نے اپنی پرجوش تقریر میں کہا امرتسر دو بار جلا

مسلمانوں کی گردنیں کیوں کٹیں، یہ مسئلہ اس تقریب میں بیٹھے ہوئے عدالت عالیہ کے تین ججوں کے سامنے رکھتا ہوں وہ اس بات کا فیصلہ سنائیں کہ امرتسر کیوں جلا تھا۔ رہا سوال یہ کہ جس مقصد کے لئے ہم نے اپنے گلستانوں کو آگ لگوائی، سب کچھ لٹایا اگر تو حصول آزادی کے بعد وہ مقصد حاصل ہوگیا تو وہ آگ گلستان ابراہیمؑ ہے اگر نہیں تو آج بھی پاکستان کا ہر شہر امرتسر ہے اور اسی طرح جل رہا ہے۔"

علامہ عزیز انصاری کا جوشِ خطابت ملاحظہ ہو۔

خواجہ صاحب نے بے سروسامانی کے باوجود اتنی اچھی اور سود مند کتاب لکھ کر بہت بڑا کام کیا ہے۔ اس کتاب کو غور سے پڑھنے کے بعد یہ پتہ چلتا ہے کہ ہندو صرف مسلمانوں ہی کا نہیں، نسلِ انسانی کا دشمن ہے۔

دلدار پرویز بھٹی نے کہا۔ اس طرح کی کتابوں کو پڑھ کر ہمیں اپنی تاریخ کے صحیح واقعات سے روشناسی ہوتی ہے اور ماضی کی طرف دیکھ کر مستقبل کا راستہ متعین کرنے کا موقع ملتا ہے۔ ہندو ذہنیت کچھ اور ہے اور جو ہندو ثقافت فلموں میں ہوتی ہے وہ کچھ اور ہے۔ ہمارے صحافیوں کو چاہیے کہ وہ اخبارات کے ذریعے نئی نسل کو بتائیں کہ ہندو کیا ہے اور اس کے عزائم کیا ہیں؟ ڈاکٹر عبدالرؤف نے کتاب کو ایک دلچسپ اور سیرت ساز تخلیق قرار دیا۔ صاحب کتاب نے اس کتاب کی تخلیق کا پس منظر بیان کیا

معروف ناول نگار جناب اے حمید نے اس کتاب کو ایک تاریخی دستاویز کا نام دیا۔

سٹیٹ لائف انشورنس کارپوریشن آف پاکستان کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر جناب شرافت علی والاجاہی نے اپنی تقریر میں "جب امرتسر جل رہا تھا" کے مصنف خواجہ افتخار کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں زبردست خراجِ تحسین پیش کیا اور کہا کہ خواجہ افتخار جیسی شخصیت کا سٹیٹ لائف کے ساتھ منسلک ہونا اس ادارے کے لئے افتخار کا باعث ہے۔ یاد رہے خواجہ افتخار سٹیٹ لائف انشورنس کارپوریشن (پنجاب) کے شعبہ تعلقات عامہ کے سربراہ ہیں۔

تصویری جھلکیاں

مجیب الرحمٰن شامی اپنی تقریر میں عدالت عالیہ کے جج صاحبان کے سامنے امرتسر کا مقدمہ پیش کر رہے ہیں

خواجہ افتخار اپنی تصنیف کی تخلیق کا پس منظر بیان کر رہے ہیں

سامعین

روزنامہ مشرق لاہور

تحریک پاکستان کے موضوع پر زیادہ سے زیادہ لٹریچر شائع ہونا چاہیئے

خواجہ افتخار کے اعزاز میں منعقدہ تقریب سے مقررین کا خطاب

لاہور (۱۳ اکتوبر (سٹاف رپورٹر) انجمن رفاہ عامہ عنایت اللہ روڈ (لبیت روڈ) کے صدر حاجی نذیر احمد بٹ اور خواجہ قدیر احمد چیئرمین زکوٰۃ کمیٹی گوالمنڈی نے تحریک پاکستان کے نامور کارکن خواجہ افتخار کی تصنیف "جب امرتسر جل رہا تھا" کی مقبولیت اور کامیابی پر ان کے اعزاز میں پرتکلف عشائیہ دیا۔ اس موقع پر ممتاز صحافی [illegible] عالم شہید نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے تحریک پاکستان کے موضوع پر زیادہ سے زیادہ لٹریچر شائع کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ انہوں نے اپنی تقریر میں صاحب کتاب کی تصنیف کو نئی اور پرانی نسل کے لئے یکساں طور پر انمول تحفہ قرار دیا۔ صوبائی کونسل کے رکن حکیم آفتاب قرشی نے مصنف کی کاوش کو اہم قومی خدمت سے تعبیر کیا۔ تقریب کے مہمان خصوصی خواجہ افتخار نے اپنی تصنیف کے عوامل پر روشنی ڈالتے ہوئے نوجوان نسل سے اپیل کی کہ وہ حالات کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے تحریک پاکستان جیسے عزم و ولولہ اور جوش و خروش سے وطن عزیز کی نظریاتی اور جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کا عزم متزلزل عہد کریں۔ اس سے قبل لاہور کارپوریشن کے سابق کونسلر اور پنجاب پیرنٹرز ایسوسی ایشن کے صدر خواجہ ریاض محمود نے سپاسنامہ پیش کیا اور ان کی ولولہ انگیز تصنیف پر انہیں زبردست خراج تحسین ادا کیا۔ تقریب میں عنایت اللہ روڈ اور گوالمنڈی کے معززین کے علاوہ ممتاز شہریوں اور تحریک پاکستان کے متعدد کارکنوں نے شرکت کی۔

خواجہ افتخار کے اعزاز میں منعقدہ تقریب سے خواجہ ریاض، آفتاب قرشی، خواجہ افتخار، خطیب عالم شہید اور نذیر بٹ خطاب کر رہے ہیں۔